سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر ۴۷

تذکرہ ہندی

تالیف

غلام ہمدانی مصحفی

مرتبہ

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ) معتمد اعزازی
انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

جامع برقی پریس دہلی

۱۹۳۳ء

قواعد وضوابط انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

۱۔ سرپرست وہ ہوں گے جو پانچہزار روپے یکمشت یا پانچ سو روپے سالانہ انجمن کو عطا فرمائیں۔ (ان کو تمام مطبوعات انجمن بلا قیمت اعلیٰ قسم کی جلد کے ساتھ پیش کیجائیں گی۔)

۲۔ معاون وہ ہوں گے جو ایکہزار روپے یکمشت یا سالانہ سو روپے عطا فرمائیں گے۔ (انجمن کی تمام مطبوعات ان کو بلا قیمت دیجائیں گی۔)

۱۔ رکن دائمی وہ ہوں گے جو اڑھائی سو روپے یکمشت عطا فرمائیں گے (ان کو تمام مطبوعات انجمن مجلد نصف قیمت پر دیجائیں گی۔)

۱۔ رکن معمولی انجمن کی مطبوعات کے مستقل خریدار ہوں گے جو اس بات کی اجازت دیں گے کہ انجمن کی مطبوعات طبع ہوتے ہی بغیر دریافت کئے بذریعہ قیمت طلب پارسل ان کی خدمت میں بھیجدی جائیں (ان صاحبوں کو تمام مطبوعات پچیس فی صدی قیمت کم کرکے دیجائیں گی، مطبوعات میں انجمن کے رسالے بھی شامل ہیں۔

[illegible] (کتب خانے) وہ ہیں جو انجمن کو یکمشت سوا سو روپے یا بارہ روپے سالانہ دیں۔ (انجمن ان کو بھی [illegible] نصف قیمت پر دے گی)

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

[illegible] معاونین کی ایک فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو وہ بغیر ان سے دریافت کئے تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی۔ پی روانہ کردیجایا کرے۔ یہ اصحاب انجمن کے رکن ہوں گے ان کے اسمائے گرامی فہرست میں درج کئے جائیں گے اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہوگی فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کردیجایا کرے گی۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اُردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں اس اجازت کے دینے سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ ان معاونین کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی ایک چوتھائی قیمت کم کرکے روانہ ہوں گی۔

المشتہر۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

فہرست

مقدمہ

اُردو شاعری کا ستارہ اُس وقت چمکا جب کہ سلطنت مغلیہ کا آفتابِ اقبال گہنا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعری ایک پیشہ ہو گئی اور اُس عہد کے باکمال سخنور اپنے متاعِ ہنر کو دربدر لئے پھرتے تھے کہ شاید کوئی قدردان مل جائے۔ مصحفی ان سب میں زیادہ بدنصیب تھا۔

نام غلام ہمدانی ولد ولی محمد ابن درویش محمد، مصحفی تخلص[1]، وطن امروہہ اور مولد اکبر پور[2]۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے تذکرے میں سنہ پیدائش ۱۱۶۲ھ لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مصحفی اپنے تذکرہ ریاض الفصحا میں اپنے حالات کے آخر میں لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر ۷۰ برس کی ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۲۶ھ میں اختتام کو پہنچا۔ اس حساب سے اُن کی پیدائش ۱۱۵۱ھ اور ۱۱۵۶ھ کے درمیان واقع ہوتی ہے۔

ابتدائی تعلیم مکتب میں امروہہ ہی میں ہوئی اس کا اشارہ انھوں نے سید محمد زمان زمان تخلص ساکن امروہہ کے حال میں کیا ہے[3]۔ اسی ضمن میں اپنے استاد کا بھی ذکر کر گئے ہیں لیکن نام نہیں لکھا۔ اصل تعلیم دلی میں ہوئی چنانچہ ریاض الفصحا میں لکھتے ہیں کہ فارسی اور اُس کی نظم و نثر کی تکمیل تیس سال کی عمر میں شاہجہان آباد میں ہوئی۔ جن دنوں میں جلاوطن ہو کر اس دیار میں تازہ تازہ پہنچا تو علمِ عربی یعنی طبیعیات، الٰہیات اور ریاضی مولوی مستقیم ساکن گوپامئو شاگرد مولوی حسن خواجہ تاش مولوی مبین عالم العلماء سے حاصل کی اور میبذی اور صدرا پڑھا۔ قانونچہ کا درس مولوی مظہر علی سے لیا جو صرف و نحو میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ آخر عمر میں عربی ادب اور تفاسیر

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۴۰۔

(۲) تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۹۰۔

(۳) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۱۰۔ نیز دیکھو صفحہ ۲۲۰ حال محزون و صفحہ ۱۳۰۔ حال شہید۔ (تذکرہ ہندی گویان)

قرآن مجید کا مطالعہ کیا۔ لکھتے ہیں کہ عربی سے نابلد ہونے کا جو نقص تھا وہ میں نے اس شہر میں پہنچ کر رفع کر دیا۔ دوسرا نقص علمِ عروض و قافیہ کی ناواقفیت تھی۔ اس کی تلافی بھی میں نے چند روز میں اساتذہ کی تصانیف کا مطالعہ کر کے کر لی اور خود اس فن میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام "خلاصۃ العروض" تھا۔

مصحفی نے اپنے استاد کا کہیں نام نہیں بتایا اور نہ کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ کسی اور تذکرے میں بھی اُس کا نام و نشان نہیں ملتا۔ البتہ صاحب "سراپا سخن" نے اُن کے اُستاد کا نام اماتی لکھا ہے[1]۔ لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ کون تھے، کہاں کے رہنے والے تھے اور کس قماش کے شخص تھے۔

اس پر سب تذکرہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ ابتدائے شباب ہی میں وہ دلی چلے آئے تھے اور وہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی اور وہیں اُن کی شعر و شاعری چمکی۔ دلی سے انھیں خاص محبت تھی، اس کا ذکر اپنے تذکرہ میں جگہ جگہ بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ وہاں کے شاعروں، ملاقاتیوں اور یارانِ عزیز کا ذکر خیر آپ اس تذکرے میں جابجا پائیں گے۔

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی　　میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

یہ وہ زمانہ تھا کہ گئی گذری حالت پر بھی دلی کا ہونا یا دلی سے منسوب ہونا یا وہاں کی بود و باش، تہذیب و شائستگی اور زباندانی کا تمغہ سمجھی جاتی تھی۔ اسی بنا پر تو انھوں نے اپنے بعض حریفوں پر چوٹ کی ہے۔

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں　　دلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

مصحفی نے اپنے بزرگوں کا پیشہ "نوکریِ خانۂ بادشاہ" لکھا ہے۔ لیکن جب سلطنت کے کاروبار میں خلل واقع ہوا تو ان کا روزگار بھی درہم برہم ہوگیا۔ میر حسن اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ ان کی بسر اوقات تجارت[2] پر تھی۔ مصحفی نے اپنے حال میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا لیکن

---

(۱) ص ۵۴۔

(۲) تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۹۰۔ سپرنگر نے بھی بحوالۂ عشقی اس کی تائید کی ہے۔

دلی کے قیام کے ذکر میں جو چند جملے ضمناً اُن کے قلم سے نکل گئے ہیں اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ میر حسن کا یہ خیال صحیح ہے کہ اُس زمانے میں اُن کی گزران تجارت ہی پر تھی لکھتے ہیں :۔

"میں شاہجہاں آباد میں بارہ سال تک دور نواب نجف خاں مرحوم میں گوشۂ عزلت میں رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس افراتفری کے زمانے میں تلاشِ معاش کے لئے کسی کے دروازے پر نہیں گیا۔"[1]

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ دلی میں وہ اپنی معاش اپنے دست و بازو سے کماتے تھے اور کسی کے دست نگر نہ تھے۔

اگرچہ بقول خود وہ دہلی میں بارہ سال تک عزلت گزیں رہے لیکن اس پر بھی شاعروں کی شرکت، شعر و شاعری کا چرچا برابر جاری رہا اور خود بھی اپنے ہاں مشاعرے ترتیب دیتے تھے[2] اور اُس وقت بھی اُن کی شاعری اس درجے کی سمجھی جاتی تھی کہ لوگ اُن کے شعر سننے کے لئے اُن کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔[3]

دلی کا رنگ بدلا ہوا تھا، حالات ناساعد تھے، بسر اوقات کے ذرائع تنگ ہو رہے تھے، ناچار اپنے دوسرے معصروں کی طرح دل پر پتھر رکھ کر دلی کو خیرباد کہا اور وادیٔ غربت میں قدم رکھا۔ دلی کی حالت اُس وقت کیسی ہی ہو، اُس کا چھوڑنا کچھ آسان نہ تھا۔ وطن تو خیر سب ہی کو عزیز ہوتا ہے مگر اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ باہر سے بھی جو لوگ وہاں آ گئے تھے انھیں وہ وطن سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ پیٹ بڑا ظالم ہے اُس کی خاطر یہ مفارقت بھی گوارا کرنی پڑی۔ لیکن مرتے دم تک اس کا داغ دل سے نہ مٹا اور جب تک رہے اور جہاں رہے اُس کی صحبتوں اور خوبیوں پر مٹے رہے۔ اہل

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۰۲

(۲) تذکرہ ہندی گویان، حال اسد صفحہ ۱۶، امین صفحہ ۲۰، فراق صفحہ ۱۵۰، مشتاق صفحہ ۲۱۰، محشر صفحہ ۲۲۲، نالاں صفحہ ۲۶۱، نصیر صفحہ ۲۶۱، ہاتف صفحہ ۲۷۰، نیز دیکھو عمدۂ منتخبہ و مجموعہ نغز۔

(۳) دیکھو تذکرہ ہندی گویان ذکر عاقل صفحہ ۱۵۱

مقام پر ایک بات غور و تامل کے قابل ہے۔ یہ لوگ جہاں جہاں گئے (مثلاً فرخ آباد، عظیم آباد، اور خاص کر لکھنؤ) وہاں والوں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا، عزت و حرمت سے پیش آئے، آسائش پہنچائی، مسافر نہیں مہمانِ عزیز سمجھا اور وہ خدمت کی کہ غربت کی کلفت دلوں سے محو ہو گئی۔ آج کل ساحال نہ تھا کہ کوئی بھولا بھٹکا باکمال آ گیا تو سمجھے کہ غنیم چڑھ آیا۔

مصحفی دلی سے آنولہ اور ٹانڈہ پہنچے۔

جب میکدہ چھٹا تو رہی کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ٹانڈے میں نواب محمد یار خاں امیرؔ خلف نواب علی محمد خاں، صاحبِ ذوق اور قدر شناس امیر تھے، شاعروں کا اُن کے ہاں اچھا خاصا جمگھٹا تھا۔ فدوی لاہوری، میر محمد نعیم نعیمؔ، پروانہ علی شاہ پروانہ، میاں عشرت حکیم کبیر، محمد قائم وغیرہ مجلس شعر و سخن کے رونق افروز تھے۔ میاں مصحفی بھی شریک صحبت ہو گئے۔ نواب نے میر سوز اور مرزا محمد رفیع سودا کو بھی خط لکھ کر بھیجا اور اپنے ہاں بلایا، وہ اُس زمانے میں مہربان خاں رندؔ کی سرکار میں ملازم تھے، فرخ آباد کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ لیکن یہ مجلس زیادہ مدت جمنے نہ پائی۔ سکرتال کی لڑائی (۱۱۸۶ھ) میں نواب ضابطہ خاں کو شاہ عالم نے مرہٹوں کی امداد سے ایسی شکست دی کہ ٹانڈے کی امارت درہم برہم ہو گئی۔ بیچارے فلک زدہ شاعروں کا وہاں کوئی ٹھکانا نہ رہا اور منتشر ہو گئے۔

مصحفی ٹانڈے سے ۱۱۹۱ھ کے لگ بھگ لکھنؤ پہنچے۔ یہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ سوداؔ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اُن سے اور بعض مشہور شعرا سے ملاقات ہوئی۔ ابھی سال بھر بھی رہنے پائے تھے کہ طبیعت اچاٹ ہوئی اور پھر دلی کا رُخ کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہاں کوئی سرپرست اور قدردان نہ ملا اور روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی۔ لیکن دلی میں کیا رکھا تھا، حالت پہلے سے بھی بدتر تھی۔ آخر تھوڑے دنوں کے بعد ہی دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ پہنچ کر حیدر وزیر صبا (لالہ کانجی مل، کایستھ سکسینہ) کے ہاں قیام رہا[1]۔ اس کے بعد

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۴۱۔

چندے میر محمد نعیم خاں کی رفاقت میں رہے[1]۔ پھر مرزا زین العابدین عرف مرزا مینڈو سرسبز تخلص (فرزند نواب سالار جنگ) نے جو اردو شاعری کے بڑے دلدادہ تھے بسلسلہ شاعری اپنی رفاقت و مصاحبت میں لے لیا۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ بڑی عزت سے پیش آتے تھے اور شعر و سخن میں مشورہ کرتے تھے۔ چار سال تک یعنی ۱۲۰۵ھ تک انھیں کے پاس رہے[2]۔

دلی کے شاہزادے، شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ اس زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ صاحب عالم نے لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی سی دلی بسا رکھی تھی اور سارا ٹھاٹ وہی قائم کر رکھا تھا۔ دلی سے جو جاتا پہلے اُن کی سرکار میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈھتا۔ شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے اور شعرا اور اہل کمال کے قدردان تھے۔ انشا، جرأت، سوز، مصحفی وغیرہ انھیں کے دربار میں ملازم تھے یا انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے تھے۔ بارہ سو سات ہجری میں مصحفی بھی میر انشاء اللہ کی وساطت سے اس دربار میں داخل ہوئے[3]۔

ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی اور سازو بازکی گرم بازاری ہمیشہ رہی ہے۔ ہر منہ چڑھا مصاحب دوسرے کے اکھاڑنے اور اپنے جمانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس میں وہ عیاریاں اور افترا پردازیاں، حرفتیں اور جدتیں کام میں لائی جاتی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انشا، جرأت اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے۔ اول اول شاعرانہ چشمک رہی، بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشا نے وہ وہ کیچڑ اچھالی ہے کہ حیا اور غیرت کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ سید انشا، بجذ ظریف، ٹھٹھول اور چلبلی طبیعت کے تھے اور اس پر ذہانت اور غضب تھی۔ مصحفی پختہ اور پرانے استاد تھے، ساتھ شاگردوں کا لشکر تھا۔ انشا کی زیادتیاں گوارا نہ ہوئیں، ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے مزے صاحب عالم اور نواب بھی لینے لگے اور شہر والوں کو ایک لے لگی

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۵۔ (۲) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۱۸
(۳) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۱۲۱۔ آزاد نے جو یہ لکھا ہے کہ مصحفی پہلے سے دربار میں تھے اور انشا بعد میں آئے صحیح نہیں۔

ہاتھ آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری، تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے۔ اور مصحفی کو خفت نصیب ہوئی۔ صاحب عالم کی نظریں ان کی طرف سے پھر گئیں، تنخواہ میں بھی تخفیف ہوئی اور آخر میں قطع تعلق کر کے خانہ نشین ہو گئے۔ اپنی تنخواہ کا ذکر کس حسرت سے کیا ہے:۔

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق | تھا مردِ عمر کہیں وَسّس بیس کے لائق
لے والے کہ پچیس کے اب پانچ ہیں اپنے | ہم بھی کبھی روزوں ہیں تم پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر | ہوتا ہے جو در ماہہ کہ سائیس کے لائق

مصحفی طبیعت کے بہت نیک اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ اُن کے ہمعصر تذکرہ نویسوں نے اُن کے مزاج اور اخلاق کی بہت تعریف کی ہے اور اُنھیں خلیق، متواضع، مسکین وضع، مسکین نہاد اور نیک سیرت لکھا ہے[1]۔ وہ کبھی درباری شاعروں سے نہ الجھتے۔ لیکن جب دوسری طرف سے چھیڑ شروع ہوئی تو اُس کے جواب میں خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ کچھ تو شاعری کا گھمنڈ، کچھ درباری حالات اور اس پر شاگردوں کی شہ نے معاملہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

یہ حالات اُس زمانے کی معاشرت پر دُھندلی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

مصحفی کی زندگی پریشان حالی، تنگدستی اور عُسرت میں گزری۔ اگرچہ کئی امیروں کی رفاقت اور صحبت رہی اور شاگرد بھی اُن کے کثرت سے ہوئے جن میں بڑے بڑے لوگ بھی تھے مگر کبھی فراغ بالی اور معاش کی طرف سے اطمینان نصیب نہ ہوا۔ علی لطف صاحب گلشن ہند نے اُن کے احوال میں صحیح لکھا ہے "...... برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے۔ ضیق معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیب اہل کمال ہے، اسی طور پر درہم برہم اس غریب کا بھی احوال ہے۔" آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ یا تو سعادتمند شاگرد اُن کی مدد کرتے تھے یا غزلیں بیچ بیچ کے اپنی بسر اوقات کرتے تھے۔ اس طرح کلام کا بہت سا حصہ دوسروں کی قسمت میں آگیا۔

---

(۱) دیکھو ذکر مصحفی تذکرہ قدرت اللہ شوق، تذکرہ قدرت اللہ قاسم اور عمدۂ منتخبہ میں۔

مصحفی نے عمر بھی بہت پائی، پرانے اُستاد جنہوں نے اردو کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور نئی پود جس نے آگے چل کر بڑا نام پایا، سب کو دیکھا، پرکھا اور اکثر اُن کے سامنے چل بسے۔ وفات کا صحیح سنہ معلوم نہ ہوسکا۔ تذکرہ ریاض الفصحا میں جس کا سنہ اختتام ۱۲۳۶ھ ہے، لکھتے ہیں کہ اس وقت میری عمر اسّی سال کی ہے۔ شیفتہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ آج کے دن مصحفی کو مرے دس سال ہوتے ہیں۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۲۵۰ھ میں لکھا گیا، اس حساب سے اُن کا سنہ وفات ۱۲۴۰ھ ہوا اور عمر چوراسّی سال کی۔

مصحفی کے استاد ہونے میں شبہ نہیں۔ بڑے مشاق اور ریختہ گو شاعر تھے۔ آٹھ دیوان، متعدد قصائد اور مثنویاں اُن کی تصنیف سے اب تک باقی ہیں۔ علاوہ اس ضخیم کلام کے شعرا کے تین تذکرے بھی اُن کی بڑی یادگار ہیں جو اب تک گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔

سب سے پہلا تذکرہ فارسی گو شعرا کا ہے جس کا نام عقد ثریا ہے۔ اس میں تین قسم کے شعرا کا ذکر ہے۔ اول شعرائے ایران جو ہندوستان میں کبھی نہیں آئے۔ دوسرے وہ شعرائے ایران جو ہندوستان آئے۔ تیسرے ہندوستانی فارسی گو شاعر۔ دوسرا تذکرہ اردو کہنے والے شاعروں کا ہے۔ تیسرے تذکرے کا نام ریاض الفصحا ہے۔ اس تذکرے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جن لوگوں کے نام پہلے تذکرے میں لکھنے سے رہ گئے تھے اُن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔

ان تینوں میں تذکرہ نمبر ۲ یعنی تذکرہ ہندی اصل ہے، باقی دو کو اُس کا تکملہ سمجھنا چاہئے۔ یہ تذکرہ جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے۔ میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کی فرمائش سے تحریر میں آیا اور عہد فردوس آرامگاہ (محمد شاہ بادشاہ) سے شاہ عالم بادشاہ کے زمانے تک کے شعرا کا حال درج ہے۔ بعض متقدم شعرا کے حالات تیمناً لکھ دئے گئے ہیں لیکن زیادہ تر اس میں معاصرین ہی کا ذکر ہے[1]۔

مصحفی کا زمانہ معمولی نہیں تھا۔ یہ اردو زبان کی ترقی و فروغ کا نہایت ممتاز دور ہے۔

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۳، ۴

اگرچہ فارسی کا رواج عام تھا، مکتبوں اور مدرسوں میں فارسی کی تعلیم برابر جاری تھی، فارسی کا پڑھنا علم و فضل ہی کے لئے نہیں بلکہ تہذیب و شائستگی کے لئے لازم خیال کیا جاتا تھا، لوگ فارسی شعر و سخن کے ایسی ہی دلدادہ تھے جیسے اکبر و جہانگیر کے زمانے میں۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ یہی تذکرے جو اردو شعرا کے ہیں فارسی میں لکھے گئے۔ اس سے پہلے اور بعد بھی بہت سے تذکرے جو اردو شاعروں کے لکھے گئے فارسی میں ہیں۔ لیکن اردو زبان رفتہ رفتہ زور پکڑتی جاتی تھی اور مصحفی کے زمانے میں تو اس نے یہ قوت حاصل کر لی تھی کہ ہمارے مستند شاعر فارسی کو چھوڑ کر اردو کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ خود مصحفی جو فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی کے دو دیوان مرتب کر چکے تھے جن میں سے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں ہے اپنے حال میں لکھتے ہیں "بمقتضائے رواجِ زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے اینکہ رواجِ شعر فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زماننا بہ پایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ (بلکہ از و بہتر گردیدہ)[1]" اس سے بڑھ کر کوئی اور مستند شہادت نہیں ہو سکتی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس دور میں اردو کے ایسے بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں جن کی بدولت اردو نے وہ فروغ حاصل کیا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اردو میں لطافت و شیرینی، قوت اور وسعت پیدا کی اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ اُن کی زبان اور کلام کا اثر اب تک باقی ہے اور باقی رہے گا۔

مصحفی کی حاتم سے لے کر نصیر دہلوی تک ذاتی ملاقات تھی۔ بعض اُن میں سے بزرگ تھے جیسے حاتم، خواجہ میر درد، میر، سودا، فغاں وغیرہ، بعض ہم عمر اور ہمعصر تھے مثلاً قائم، جرأت، سوز، بقا، انشا، حسن، حسرت وغیرہ، بعض نو مشق تھے اور نام پیدا کر رہے تھے جیسے آتش، ناسخ، نصیر، رنگین، ممنون، طپش، خلیق، افسوس وغیرہ وغیرہ۔ شاگرد بھی مصحفی کے اس کثرت

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۲۴۰۔ قوسین کے الفاظ ایک نسخہ میں ہیں دوسرے میں نہیں۔

سے تھے کہ پرانے اساتذہ میں شاذ ہی کسی کے ہوں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؂

شاگرد تازہ از پس شاگرد می رسد　　　یعنی رجوع خلق بسویت ہماں کہ بود

ان میں سے بعضوں نے بہت نام پایا مثلاً ضمیر، خلیق، رنگین، پروانہ، تنہا اور منتظر اور گرم دونوں اُن کے خاص اور عزیز شاگرد تھے۔ اکثر کا حال ان تذکروں میں موجود ہے۔ ان تذکروں میں اکثر شعرا ایسے ہیں جن سے مصحفی ذاتی طور پر واقف تھے یا اُن سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جن کو نہیں جانتے تھے اُن کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ میں نہیں جانتا۔

مصحفی نے اپنے تذکرے صاف اور سیدھی زبان میں لکھے ہیں، تکلف اور تصنع اور عبارت آرائی سے کام نہیں لیا۔ کہیں بے جا طول نہیں دیا، جو حالات جس کسی کے معلوم تھے مختصر طور پر صاف صاف لکھ دئے ہیں۔ انھیں حالات کے ضمن میں کہیں کہیں اُس زمانے کی شعر و شاعری اور اردو ادب کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً حاتم کے ذکر میں اُن کی زبانی ولی کے دیوان کا شاہجہاں آباد میں آنا، لوگوں میں اُس کا چرچا ہونا، بعض صاحبوں کا ایہام گوئی پر اردو شاعری کی بنیاد رکھنا چند سطروں میں خوبی سے بیان کیا ہے۔ اُسی کے ساتھ حاتم کی بزرگی، اُن کے دیوان زادے اور حکیت استادی کا تذکرہ بھی اپنے انداز میں خوب لکھا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں مشاعروں کی حالت، اپنے شاعرے کا ذکر، بعض نامور اور معصر شعرا کی ملاقات کا حال جگہ جگہ لکھے گئے ہیں۔ ایک جگہ مشاعروں کے متعلق لکھا ہے کہ تجربے میں آیا ہے کہ ایسی مجلسیں ایک سال سے زیادہ نہیں رہنے پاتیں، ضرور کوئی نہ کوئی تفرقہ اور خلل پیدا ہو جاتا ہے[1]۔

وہ اپنے تذکروں میں شعرا کے کلام کے متعلق رائے لکھتے ہیں لیکن اُس میں تنقیدی حیثیت بہت کم ہوتی ہے۔ تاہم بعض نامور شعرا کے متعلق اُن کی رائیں خاص وقعت

(۱) حال شیخ مغل خانی (تذکرۂ ثانی)

رکھتی ہیں۔ مثلاً سودا کے تذکرے میں اگرچہ پورا ایک صفحہ بھی نہیں لکھا لیکن جو کچھ لکھا ہے اُس میں اُن کے کمال اور سیرت کی تصویر کھینچ دی ہے۔ نکتہ چینوں کے اعتراضات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں "غرض ہرچہ بود، در روانیِ طبع نظیر خود نہ داشت۔" اور آخر میں کہتے ہیں "نقاش اولِ قصیدہ در زبان ریختہ اوست، حالا ہر کہ گوید پیرو و تتبعش خواہد بود۔"

مظہر جانِ جاناں کی نسبت فرماتے ہیں کہ "در دورِ ایہام گویان اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ اوست۔" آخر میں لکھتے ہیں "فی الحقیقت نقاشِ اولِ ریختہ بایں وتیرہ باعتقاد فقیر مرزاست، بعدہٗ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ۔"

سودا سے مقابلہ کرنے کے بعد جس کا رواج اُس وقت عام تھا اور جس کا اثر اب بھی باقی ہے۔ میر صاحب کی نسبت فرماتے ہیں "غرض ہرچہ ہست استادیِ ریختہ بروِ مسلم است . . . . ہمہ ریختہ گویانِ ہند سند از کلامش می آرند و او را دریں فن مستثنیٰ می دانند و الحق چنیں است۔"

یقین کے کلام کے متعلق بھی قریب قریب وہی رائے ظاہر کی ہے جو مظہر جانِ جاناں کے حق میں لکھی ہے۔ آخر یقین ہیں تو مظہر ہی کے تربیت یافتہ۔ کہتے ہیں کہ "در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان بود، بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ۔"

مصحفی پہلے شخص ہیں جنہوں نے میر حسن کی مثنوی کی سچی تعریف کی ہے "در مثنویِ آخر کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ۔ الحق کہ کار کار اوست۔ قطع نظر از بلاغتِ شاعری زبانش بسیار بامزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ۔"

معصروں کے کلام کے متعلق صحیح رائے کا ظاہر کرنا آسان نہیں، اور خاص کر ایسے لوگوں کے متعلق جن سے آویزش اور چشمک رہی ہو۔ انشاء اللہ خاں اور اُن میں کیا کچھ نہیں گذری تھی اور ان بزرگوں نے کون سی بات تھی جو اُٹھا رکھی تھی، اس پر بھی جب وہ انشا کا حال لکھنے بیٹھے تو سچی تعریف اور بے لاگ رائے ظاہر کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اُن کی تیز زبانی اور خاص کر

فارسی دانی کی تعریف کی ہے۔ افسانے مثنوی ضیر برنج مولانا بہاء الدین آملی کی مثنوی نان وحلوا کے جواب میں لکھی اُس کی نسبت لکھتے ہیں "بسیار بصفا گفتہ و دادِ فصاحتِ زبان فارسی در دادہ"۔ اُن کے اُردو کلام کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہے "اگرچہ ہمہ کلامش در عالمِ ظرافت، خالی از کیفیتے نیست اما آنچہ از اشعارِ سادہ اش انتخابِ فقیر افتادہ اینست"۔ اُن کے کلام کا انتخاب بھی بہت اچھا کیا ہے۔ انتقال کے بعد بھی انھیں یاد کیا ہے ؎

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں   یاد ہے مرگِ قتیل و مردنِ انشا مجھے

بقا سے مصحفی کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ اُس کے خلق و ظرافت اور قناعت کی تعریف کرتے ہیں لیکن کلام کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ "در قصیدہ یدِ طولیٰ دارد . . . اما در گفتنِ غزل بطی است"۔

آتش اُن کے شاگرد تھے، اُن کے متعلق کیا صحیح رائے دی ہے "اگر عمرش وفا کردہ و چندیں سال برہمیں وتیرہ رفت و فکر متینش را مانعے در پیش نیاید یکے از بے نظیرانِ روزگار خواہد شد"۔

رنگین بھی اُن کے شاگرد تھے کیا خوب کہا ہے کہ "ہر چند چنداں بہرۂ از علم ندارد اما ذکاوتِ طبعش بر صاحبِ علمان غالب"۔ رنگین نے اپنا دیوان اصلاح کے لئے پیش کیا شروع سے آخر تک دیکھ کر فرمایا "کلامش بسیار کم اصلاح برآمدہ"۔ اصل رائے یہ ہے "چوں مزاجش عشق باز افتادہ، اکثر قطعہائے خوب خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ نظم کشید"۔

ناسخ کی نسبت ایک جگہ فرماتے ہیں "تلاش ہائے معانی تازہ می کند"۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "بہ معنی بندیٔ تازہ علمِ استادی برافراشتہ"۔ لیکن مصحفی اس قسم کی شاعری کو جس میں معنی بندی اور "اشعار خیالی" زیادہ ہوتے ہیں پسند نہیں کرتے تھے[1]۔

(۱) دیکھو ذکر واجد تذکرۂ ثانی۔

مصحفی کے تذکروں میں بیسیوں ہندو شاعروں کا حال درج ہے۔ ان کا ذکر بھی اسی گرم دلی او خوبی سے کرتے ہیں جیسا دوسروں کا۔ اس سے اُس زمانے کی تہذیب اور آپس کی یک جہتی کا اندازہ ہوتا ہے۔

تذکرے میں اکثر نامور شعرا کی تاریخ وفات کے قطعے لکھے ہیں۔ اس فن میں انھیں خاص دخل تھا۔

میر سوز کے ابتدائی تخلص "میر" کی شہادت بھی اس تذکرے سے ملتی ہے۔

سعادت امروہوی کا حال بھی لکھا ہے لیکن میر صاحب سے تعلق تلمذ واستادی کا ذکر نہیں کیا۔

مصحفی نے اپنے تذکروں میں ضمناً صرف تین تذکروں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک تذکرہ میر حسن[1] دوسرے تذکرہ گردیزی[2] تیسرے تذکرہ قدرت اللہ شوق۔

ایک بات اور قابل لحاظ ان تذکروں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تک تحقیق ہوا ہے اُردو شعرا میں مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے "اردو" کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان تذکروں میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے۔ حضور کے حال میں ذکر کرتے ہیں کہ ایک روز شاہجہاں آباد میں لطف علی خاں ناطق کے گھر پر مشاعرہ تھا۔ میر صاحب کی طرحی غزل میں قافیہ کے بعد ردیف "اور" بمعنی طرف تھی۔ بعضے فصحا نے اُسے خلاف "اردو" خیال کرکے اُس کی پیروی نہ کی۔ نثار کے حال میں لکھتے ہیں کہ "ادائے زبان اردو چنانچہ باید از زبانِ ندرت بیانش می شود" قہر کے تذکرے میں مرزا قتیل کے متعلق فرماتے ہیں کہ "او ہم با وصفِ فارسی گوئی دعوئے اُردو دانیِ ریختہ داشت" اسی طرح ہجور کے حال میں لکھا ہے کہ "سہ کتاب در زبانِ اردوئے ریختہ شکر آمیختہ از خامۂ فکرش رونق سواد پذیرفتہ" لیکن "زبانِ اردوئے معلی" کا لفظ سب سے پہلے میر صاحب نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں لکھا ہے[3]

---

(۱) تذکرہ ہندی گویان صفحہ ۸۸ ذکر خاکسار، صفحہ ۲۶۰ ذکر نالاں

(۲) دیکھو صفحہ ۲۴ ذکر بقا۔ (تذکرہ ہندی گویان) (۳) صفحہ ایک

انشاء نے بھی جا بجا دریائے لطافت میں اردو کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد پھر میرامن کی باغ و بہار میں نظر آتا ہے۔

پہلے تذکرے کے آخر میں چند شاعر عورتوں کا حال بھی درج ہے۔

ان تینوں تذکروں کی تصنیف کی تاریخیں یہ ہیں۔

تذکرۂ اول، ہندی گویان۔ سنہ ۱۲۰۰ھ سے قبل شروع ہوتا ہے اور سنہ ۱۲۰۹ھ میں ختم ہوتا ہے۔ تاریخ اختتام تو مصحفی نے خود لکھ دی ہے۔ ابتدا کا صحیح سنہ تو معلوم نہیں ہو سکا لیکن خالی کے ذکر میں میر حسن (متوفی سنہ ۱۲۰۱ھ) کا تذکرہ ضمناً آگیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اس سنہ سے قبل لکھنا شروع کر چکے تھے۔

تذکرۂ دوم، ہندی گویاں۔ اس کا سنہ تصنیف اس کے نام ریاض الفصحا سے نکلتا ہے یعنی سنہ ۱۲۲۱ھ، لیکن یہ تاریخ آغاز ہے، تاریخ اختتام سنہ ۱۲۳۶ھ ہے۔

تذکرۂ فارسی گویان یعنی عقد ثریا کا سنہ تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے۔

ہندی گو شاعروں کے دو تذکرے ہیں۔ ان میں بعض شعرا کے حالات مشترک ہیں اس لئے کہیں کہیں بعض شعرا کے حالات کے متعلق رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ جیسا کہ خود مصحفی نے لکھا ہے ایک عالمِ شباب کا نتیجہ ہے اور دوسرا زمانۂ شیب کا۔

ہندی گویوں کا پہلا تذکرہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے پر مبنی ہے۔ البتہ اس کا مقابلہ خدا بخش خاں کے کتب خانے کے نسخے سے کیا گیا۔ بعض مشتبہ مقامات کا مقابلہ کتب خانہ مدرسہ ندوۃ العلما سے بھی کیا گیا۔ باقی دو تذکرے خدا بخش خاں کے کتب خانے کے نسخوں کی نقل ہیں۔ بعد ازاں ان تینوں تذکروں کے مبیضوں کا مقابلہ کتب خانۂ ریاستِ رامپور کے نسخوں سے ہوا۔ افسوس ہے کہ کتب خانہ خدا بخش خاں اور رامپور کے نسخے بہت غلط اور بدخط نکلے۔ تاہم مقابلے سے بعض مقامات کی کچھ نہ کچھ تصحیح ہو گئی۔

میں قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا ایڈوکیٹ پٹنہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے

دونوں نسخوں کی نقل خدابخش خاں کے کتب خانے سے لکھوا کر بھیجی اور خود بڑی احتیاط سے تینوں نسخوں کا مقابلہ وہاں کے نسخوں سے کیا۔

حاشیہ میں ان نسخوں کا حوالہ درج کردیا گیا ہے۔ ن۔خ سے مراد نسخہ کتب خانۂ خدابخش خاں ہے اور ن۔ر سے نسخۂ رامپور۔ جہاں صرف ن لکھا ہے اُس سے بھی نسخۂ رامپور مراد ہے۔

عبدالحق

حیدرآباد دکن

۸ رنومبر ۱۹۳۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرۂ مصحفی

نیکوترین تذکرہ کہ غنچہ دلہائے ارباب سخن را باہتزاز نسیم تقریر بہ شگفتن در آرد حمد
خداوند سخن آفرینی است کہ مصرعہ ریختہ شمع قامت مہوشاں را باچندیں معنی سوز و گداز
بسم اللہ دیوان عشق ساختہ و دلنشیں بیاضے کہ توتیائے اشعار آبدارش دیدۂ تماشائیاں
معنی دوست را آبحیات معنی ہائے روشن در جلباب ظلمات الفاظ مستراکم نماید۔ نعت سلیمت
کہ شیرازہ بند کاف و نون دو مصرعہ چیان ذوالفقار دو سرا موزوں و مسجع در قبضۂ تصرف
انداختہ۔ امابعد بر ضمائر فیض ذخائر مشکل پسنداں دقیقہ رس و دقیقہ رسان مشکل پسند
پوشیدہ مباد کہ چوں ایں فقیر حقیر غلام ہمدانی مصحفی تخلص از تصنیف دیوان فارسی و
ہندی و تالیف تذکرہ فارسی فراغت حاصل کردہ مہم تالیف تذکرہ ہندی در پیش آمد
اگرچہ از علو ہمت خدا داد سر و دماغ آں نبود کہ اوقات عزیز خود را باشتغال چنیں امر
لاطائل کہ دیگراں القمز بگردن خودش بستہ اند مصروف سازد اما بتکلیف میر مستحسن خلیق
خلف میر حسن کہ باشارۂ پدر بزرگوار خود کلام خود را از نظر فقیر می گذارند و شوق شعر
ہندی دامن دلش را محکم فرا گرفتہ طوعاً و کرہاً قدم دریں بادیۂ پرخار گذاشت و بقید
حروف تہجی اسامی قدیم شعرائے عہد فردوس آرام گاہ تا شعرائے زمانہ شاہ عالم بہادر

بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ، ہمت گماشت بیشتر دراں ذکر معاصرین است کہ احوال ہر یکے بچشم خود دیدہ و بحسن و قبح مراتب سخن ہر کس وا رسیدہ۔ و کم کم احوال بعضے متقدمین نیز بطریق تیمن صورت اندراج یافتہ۔ فرقِ زبانِ ریختہ سابق و حال بر ہوشمندان پیدا است امید کہ منظورِ نظر مبصرانِ نقود معانی و صیرفیانِ راستہ بازارِ سخندانی گردد وَباللّٰہِ التَّوفِیق وَلَہُ المُستَعان۔

(۱) آفتاب

تخلص شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی است کہ نور معدلتش بسیط زمین را چوں آفتاب عالمتاب روشن ساختہ و ہمائے دست تاج بخشش بر سرِ ذرات خاک از قاف تا قاف سایہ انداختہ، دریں زمانۂ پر آشوب کہ از ہر طرف غبار فتن و فساد برخاستہ خاطر عالمی را مکدر دارد بر سرِ کونین آستیں افشاندہ اوقات عزیز خود را اکثر بطاعت و عبادت بسر می برد و پس از فراغتِ اوقاتِ معہود تلاوتِ قرآن و نوشتن آں اشہب فکر را در میدان شعر ہندی و فارسی و کبت و دوہرہ وغیرہ نیز جولان میدہند و دراں وقت اکثرے از کبیشران و ریختہ گویان پایۂ تخت حاضر می باشند و وقت خواندن خوشخوان غلغلہ تحسین آفرین بلند می سازند برائے یمن و تبرک بقولی کہ کلام الملوک ملوک الکلام اشعار حضرت نیز داخل ایں بیاض کردہ شد تا بر صفحۂ روزگار یادگار بماند۔ از دست

دل شاد ہو گیا تھا سن کر تری سواری ‏ ‏ ‏ ‏ موقوف کیوں ہوئی پھر تقصیر کیا ہماری

تری اس مانگ سے کیا معنئ دلخواہ ہے پیدا ‏ ‏ ‏ ‏ شب معراج کی اس خط سے گویا راہ ہے پیدا

جلی شمع تا سحر شب فرقت میں آفتاب ‏ ‏ ‏ ‏ بے اختیار مجکو رولاتی ہے چاندنی

مدت سے اشتیاق ہے پیارے جو آئیے — ٹھلا رواقِ چشم میں سیریں دکھائیے
وہ گلبدن جو آکے ہم آغوش ہو کہیں — جوں غنچہ پیرہن میں نہ پھولے سمائیے
ہے مدتوں سے منتظرِ جلوہ آفتاب — مکھڑے سے ٹک نقاب کو جلدی اٹھائیے

بات کیجے غیر سے اور ہم سے منہ کو موڑیئے — ٹک خدا سے ڈریئے ان وصفوں کو اپنے چھوڑیئے
منہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یہی منظور ہے — لیجئے سنگِ جفا اور شیشۂ دل توڑیئے

اُس لبنتی پوشس کو گر پائیے — آرزو دل کی جو ہے بر لائیے

اے صنم جس سے جہاں میں آشنائی کیجئے — کیا ہے لازم پھر اُس سے بیوفائی کیجئے

(۲) آصف

تخلص نواب وزیر آصف الدولہ بہادر یحییٰ خاں است کہ شور سخاوتش غلغلہ در چار دانگِ عالم انداختہ و برق شمشیر سطوتش زہرۂ شیران آہنی چنگال آب ساختہ۔ اگرچہ آصف است اما سلیمان زمانش می تواں گفت و اگرچہ یحییٰ است اما عیسیٰ عہدش می تواں خواند۔ سایہ پرچم ظفر تو امش بر سر نزدیک و دور افتادہ و سم سمندان فولاد نعلش بہر طرف کہ رو آوردہ خاکِ بغی و طغیان را برباد دادہ۔ از بسکہ از ابتدائے عمر در جمیع فنون دانائے یگانۂ روزگار است بمقتضائے موزونیِ طبع گاہ گاہے خیال شعر نیز می فرماید چند اشعار از کلام اوست۔ از وست۔

تجھے غیر سے جب ہم دیکھتے ہیں — نہ دیکھے کوئی جو کہ ہم دیکھتے ہیں
تو جلدی سے آ ورنہ میرے مسیحا — کوئی دم کو راہِ عدم دیکھتے ہیں

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف　　تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

وحشت میں کوہ و دشت جو یہ آہ لے گئی　　کیا کیا کنوئیں جھکانے تیری چاہ لے گئی
کعبہ میں بھی گئے تو ہمیں تیری یاد آہ　　پھر سوئے دیر لے بت دلخواہ لے گئی
جاروب کش مے اس کے نہ رہنے دیا مجھے　　گر وہاں نسیم شکلِ پر کاہ لے گئی
آصف چمن میں آتی ہو اُس رشکِ گل کی یاد　　کیا جانئے کدھر مجھے ناگاہ لے گئی

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے　　ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح　　ایسے بیٹھے کہ پھر نہ یہاں سے گئے
شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم　　سنیو اک دن کہ جسم و جاں سے گئے

دل تو کہتا ہے یار آتا ہے　　پر مجھے کب قرار آتا ہے
یہ بگولا نہیں اڑاتا خاک　　سر پہ کوئی خاکسار آتا ہے
میں کردوں گا ترا گلا تجھکو　　یہ بھلا اعتبار آتا ہے
خیر ہو آصف اس گلی میں آج　　دل کو ہر پھر پکار آتا ہے

کس طرح غیر کنے تم کو بہم دیکھیں گے　　یہ تو واللہ ان آنکھوں سے نہ ہم دیکھیں گے
دور دامن کی تو نوبت کہیں پہنچے یا رب　　کب تلک دست و گریباں کو بہم دیکھیں گے
رام تم ہو چکے اور ہم نے بھی بس پوجے پانو　　جاکے اب اور کسی بت کے قدم دیکھیں گے
کل کے نامہ کا تو آصف یہ کچھ آیا تھا جواب　　آج کیا کرتا ہے تو حال رقم "دیکھیں گے"

---

(۳) آبرو

عرف شاہ مبارک کہ میاں نجم الدین نام داشت نبیرۂ حضرت غوث گوالیاری نوراللہ مرقدہٗ شخصے بود یک چشم باریش وعصا۔ شعر رابطوریکہ درآں زمانہ رواج داشت بسیار بخوبی گفتہ خصوصًا مثنوی کہ موعظ آرایش معشوق از خامۂ فکرش ریختہ بسیار است فقیر چند شعرش بطور خود از دیوانش انتخاب زدہ۔ نوشتہ عمرش از پنجاہ متجاوز خواہد بود کہ بآسیب پائے اسپ پائے حیاتش فرو رفتہ از دست۔

افسوس ہی کہ ہم کو دلدار بھول جاوے | وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے

کتابت کا پہنچنا آہ سے میری ہوا مشکل | جلے جاتے ہیں گرمی سی ہوا کی پر کبوتر کے

کیا بری طرح بھوں مٹکتی ہے | کہ مرے دل میں آ کھٹکتی ہی
زلف کی شان مکھ اوپر دیکھو | کہ گویا عرش میں لٹکتی ہی
اب تلک گرچہ مرگیا فرہاد | روح پتھر سے سر پٹکتی ہی

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے | وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

دامن دشت کیا نقش قدم سے پر گل | کس بہاراں کا یہ دیوانہ تماشائی ہے

عبث کیوں روبرو ہونیکی کھاتے ہو قسم جھوٹی | بن آئینہ کے تم اکدم بھی رہ سکتے ہو منہ دیکھو

شور ہو اس کی اشکباری کا　　آبرو چشم تر قیامت ہے

سجا ہے نرگسی بوٹی کا جامہ　　کرے کیونکر نہ ہم سے چشم پوشی

نالہ ہمارے دل کا غم کا گواہ بس ہے　　دینے کے تئیں شہادت انگشت آہ بس ہے

دل کب آوارگی کو بھولا ہے　　خاک اگر ہو گیا بگولا ہے

ظالم نگہ کا تیر ستم کام کر گیا　　سینہ کو صاف توڑ جگر سے گذر گیا

جان اگر دشمن ہوئے ہو تم ہمارے اس قدر　　تو ہمارے دل کو کیوں لگتے ہو پیارے اس قدر
گاہ گاہے پیار کی انکھوں سے کرتا ہے نگاہ　　مہرباں ہوتا چلا ہے اب تو بارے اس قدر
دیکھنے کو دوڑتے ہیں لوگ بھونچال سمجھ　　آہ سے دل کے نکلتے ہیں شرارے اس قدر
عاجزوں کو بے گنہ آزار دینا خوب نہیں　　ڈر خدا سے آبرو کو مت ستارے اس قدر

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی　　اس دلِ بیقرار کی صورت

تمہاری لوگ کہتے ہیں کمر ہے　　کہاں ہے، کس طرح کی ہے کدھر ہے
کیا ہے بے خبر دونوں جہاں سے　　محبت کے نشہ میں کیا اثر ہے
تخلص آبرو بر جا ہے میرا　　ہمیشہ اشکِ غم سے چشم تر ہے

---

(۴) اثر

کہ میر محمد نام دارد برادر خورد خواجہ میر درد نور اللہ مضجعہ، شخصے است بزیور علم و عمل آراستہ و بصلاح و تقویٰ پیراستہ تا حین حیات برادر بزرگ خود را چون پیر پرستش می کرد، حالا بجائے او در شاہجہاں آباد سجادہ نشین است و شعر ہندی و فارسی کم از برادر بزرگ نمی گوید۔ از وست۔

کب کب تری گلی میں ہم بے قرار آئے — سو بار جی نے چاہا تب ایک بار آئے
ہر چند جی پہ ٹھہری پھر ہم ادھر نہ آویں — آخر نہ رہ سکے پر بے اختیار آئے

کب کب آوے ہے اثر کیوں تجھ کو ننگ آتا ہے — نکلتا ہے کبھی جی سے جو تنگ آتا ہے

تیرے کوچہ میں دوبارہ خوب ہم ہو کر چلے — ڈھونڈنے کو دل کے آئے جان بھی کھو کر چلے

یہ تجھ بن رات جو گذری میں جانوں یا خدا جانے — تجھے تو کب ہوئی ہوگی خبر تیری بلا جانے

رقیبوں نے حماقت سی یہاں تک پاسبانی کی — کہ اُس نامہرباں نے ضد سی آخر مہربانی کی
نہ قصد اپنا کہ دل دیجے نہ قصد اُس کا کہ جی لیجے — مصیبت کیا بیاں کیجے بلائے ناگہانی کی

جس وقت کہ تو نے اُسے پیغام دیا تھا — قاصد بخدا اُس نے مرا نام لیا تھا
ناگاہ پس از عمر ملا مجھکو تو بولا — بس لگ نہ چل اب تو نے تو بدنام کیا تھا

ہوا کیا وہ ترا اے شرمگیں چپ ہو کے رہ جانا — کہی جو بات کہا بدنا ہوئی جو بات سہ جانا

بھلا شکر کرنے لگی پھر شکایت — کرم مہربانی توجہ عنایت

حد ہو چکی ہے اب تو خاطر بھلا کہاں تک — ہم نے ہوس کو مارا مقدور تھا جہاں تک

بس ہو یارب یہ امتحاں کہیں — یا نکل جائے اب یہ جان کہیں
ن ویسا ہی گو رہو نہ رہو — کوئی جاتی ہے تیری آن کہیں
وائے غفلت کہ ایک ہی دم میں — میں کہیں اور کارواں کہیں

ہم ہیں بے دل دل اپنے پاس نہیں — آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
بے وفا کچھ نہیں تری تقصیر — مجھکو میری وفا ہی راس نہیں
قتل میرا ہے تیری بدنامی — جان کا ورنہ کچھ ہراس نہیں(۱)
یوں خدا کی خدائی برحق ہے — پر آثر کی ہمیں تو آس نہیں

کوئی کھاتا تھا دغا جھوٹی مدارات سے میں — آ پھنسا دام میں کیا جانئے کس بات(۲) سے میں
سخت ناچار ہے تقدیر کے ہاتھوں بندہ — ورنہ یوں باز رہوں تیری ملاقات سے میں

دل(۳) میں ہے جور ترے از سرِ نو یاد کریں — تو سنے یا نہ سنے نالہ و فریاد کریں
ان بتوں کی ہے بڑی وضع ہی دل شکنی — یہ کہاں جو یہ کسی دل سے(۴) ہمیں شاد کریں
ہم اسیروں کی اُسے چاہیئے خاطر داری — اور الٹی نہ کہ ہم خاطرِ صیاد کریں

---

(۱) ان نسخ میں یہ شعر نہیں۔ (۲) گھات (نسخہ ر)۔ (۳) جی میں ہے از سر نو جور ترے یاد کریں (نسخہ)۔ (۴) دل کو کہیں (نسخہ)

کبھو ادھر کو بھی ہو جلوہ گری عشوہ گری — تیری دولت کا بھلا ہم بھی تو کچھ یاد کریں
آپ کے دل سے بھلا ٹک تو نکل جائے بخار — اور بھی جی میں جو کچھ ہووے سو ارشاد کریں

جو سزا دیجے سے بجا مجھ کو — تجھ سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو
غم میں بیٹھوں کہاں تلک بت کے — اب اٹھا دے کہیں خدا مجھ کو
سرد مہری نے تیری اے ظالم — آہ کتنا جلا دیا مجھکو
کیوں تو ہر چند جفا ہی کرتا ہے — نہیں کچھ دعوئے وفا مجھکو
گر اسی میں خوشی تمھاری ہے — اور بھی کیجئے خفا مجھکو
وہی میں ہوں آثر وہی دل ہے — پر خدا جانے کیا ہوا مجھکو

نہ لگا لے گئے جہاں دل کو — آہ لے جائیے کہاں دل کو
تو بھی جی میں اسی جگہ دیکھو — منزلت تھی آثر کے ہاں دل کو

بے گناہوں سے دل کو صاف کرو — نہیں تقصیر پر معاف کرو
کر چکے قتل آثر غریب کے تئیں — اب تو شمشیر کو غلاف کرو

کدھر کی خوشی کہاں کی شادی — جب دل سے ہوس ہی سب اٹھا دی
تا ہاتھ لگے نہ کھوج دل کا — عیار نے زلف سے اٹھا دی
پل مارتے خاک میں ملایا — ٹک ہنس کے نظر جدھر ملا دی
یارب سوا لقائے وجہک — لا مقصودی و لا مرادی
دیتے ہو کسے یہ بد دعائیں — کیا پیارے آثر نے پھر دعا دی

رُباعیات

کیا تجھ سے کہوں میں کس طرح گذرے ہے
کیا دوں میں پتا کہ اس طرح گذرے ہے
بالفرض اگر کہا تو پھر کیا حاصل
گذرے ہے خیر جس طرح گذرے ہے

احوالِ تباہ کو دکھاؤں میں کسے
افسانۂ دردِ دل سناؤں میں کسے
تو دیکھ نہ دیکھ، سن نہ سن، جان نہ جان
رکھتا ہوں تجھی کو اور رلاؤں میں کسے

نے حالِ تباہ کی اُنھیں بینائی
نے نالہ و آہ کی اثر شنوائی
کوئی مرتے مرو، جیتے جیو، بھائیں نہیں
اللہ و غنی بتوں کی بے پروائی

صدقے ترے نام پر یہی بندا ہے
دل دادۂ بے خطر یہی بندا ہے
بے عیب خدا کی ذات ہی ہے پیارے
تقصیر معاف آخر یہی بندا ہے

اب ضبط سے تاب جی کے رہنے کی نہیں
طاقت صدماتِ ہجر سہنے کی نہیں
اک بات ہے موقوف ترے آنے پر
بن آئے ترے کہوں سو کہنے کی نہیں

(۵) الم

کہ صاحب میرزا نام دارد خلف خواجہ میر درد صاحب نور اللہ مضجعہ جوانی است حلیم و سلیم۔ بمقتضائے موزونیِ طبع کہ موروثی است۔ گاہ گاہی فکرِ رباعی یا مطلع حسن مطلع میکند (حق تعالیٰ سلامت دارد۔ ن ر) رباعیات

کیا کہیے اَلم کہ اِک گھڑی چین نہیں
معلوم ہوا کہ جیتے جی چین نہیں

میں تو بے چین ہوں پر ہے خفگی یہ(۱) — بن میرے ستائے اس کو بھی چین نہیں

نے دل کو قرار بے قراری کے سبب — نے چشم کو خواب اشکباری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھی — یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

سودا کب تھا اسے یہ کب تھی وحشت — بس دیکھ تجھے ہوا پریشاں حالت
زلفوں کے دام میں الم سا آزاد — آ کر پھنس جاوے یوں خدا کی قدرت

(۶) امیر

مسمّی بہ نواب محمد یار خاں خلف نواب علی محمد خاں امیرے بود از قوم افاغنہ۔ در علم موسیقی و ستار زدن یگانۂ روزگار و در رعنائی و زیبائی جوانے بود باغ و بہار۔ ہزارہا دریں کار بر باد دادہ و باستادان ایں فن از داد و دہش بسیار چہ منتہا کہ نہ نہادہ۔ در ایامیکہ بہ ترغیب حکیم کبیر سنبھلی شوق شعر ہندی دامن دلش را بسوئے خود کشید، خطی بطلب میر سوز و مرزا محمد رفیع نوشتہ روانہ کرد۔ چوں دراں ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان خان رند تخلص بصیغۂ شاعری عز و امتیاز داشتند از فرخ آباد آمدن ایشاں بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باش نواب بود اتفاق نیفتاد۔ آخر کار میاں محمد قائم کہ دراں ایام در بسولی بود، حسب الاشارہ آمدہ شرف ملازمت آں والا جناب دریافت۔ و بدرماہہ یک صد روپیہ عز و امتیازش دادہ باستادیش برداشت۔ و علیٰ ہذا القیاس دیگر سخن سنجان مثل فدوی لاہوری و میر محمد نعیم نعیم تخلص و پروانہ علی شاہ پروانہ مرادآبادی و میاں عشرت(۲) ہذال و حکیم کبیر صاحب کہ از قدیم در سرکارش بود و فقیر حقیر مصحفی از حاضران مجلس او بود و ہر وقت کہ غزل طرح می فرمود بسر انجام می رسانید۔

---

(۱) میں تو بے چین ہوں ہی پر خفگی یہ (ن خ)۔ (۲) عسرت (ن ر)

وازبسکہ مزاج نواب بہ سیر و تماشائے مرقع گوناگوں نیز میلان تمام داشت۔ یک مرقع تصاویر شوانیز از عاقل خاں مصور کہ مصور سحر کار بود نویسانیدہ بر صفحۂ روزگار یادگار گذاشتہ۔ از انجا کہ فلک حقّہ باز از قدیم الایام بازیہائے تازہ بر روئے کار آرد بیک ناگاہ بر شیشۂ انعقاد ایں مجلس بہشت آیین سنگ تفرقہ انداختہ شراب عیش یاران را بذائقہ بلاہل ہجراں مبدل ساخت دسبب آں شکست خوردن ضابطہ خان از حضرت ظل سبحانی بود در سکرتال بامداد و کمک مرہٹہ ہائے در آں ایام بے تمیزی ہر یک از ندمائے و شعرائے مجلس جدا جدا راہی در پیش گرفتند۔ فقیر در آں حادثۂ جانگزا بہ لکھنؤ رسیدہ بود بعد انقضائے مدت یک سال بہ شاہجہاں آباد رفتہ رخت اقامت در آں دیار مکنون نشان انداخت۔ در آنجا پس از تمادی ایام بسمع رسید کہ نواب موصوف بعد شکست حافظ رحمت خاں باجل طبعی درگذشت۔ ازوست۔

اس منہ سے آہ کچھ نہ نکلا   جز نالہ و آہ کچھ نہ نکلا
کیا تو نے دیا تھا مجھکو ساقی   شیشہ میں تو واہ کچھ نہ نکلا

تیرے گھر جانے سے یاں اپنا تو گھر جاتا ہے   اے مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے
اللہ رے سرخی ترے چہرے کی ہنگام عتاب   جتنا ہی بگڑے ہے اُتنا ہی سنور جاتا ہے

اُس شکار انداز سے لگ کر کوئی چھٹتی ہے آنکھ   کیوں نہ ہو سوئے قضا منہ وقت دم نخچیر کا

سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے بیداری[1] سے   لہو اُترا ہے تری آنکھوں میں خونخواری سے
وقت رخصت کے ترے اے مرے جی کے دشمن   تمام تھام آج رکھا دل کو میں کس خواری سے
بس میں آیا جو تمہارے اُسے چاہو سو کرو   کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

---

(۱) سے خواری (ن خ)

کس نے نظروں میں خدا جانے اسے بل ڈالا | نرگس آج آنکھ اٹھاتی نہیں بیماری سے
کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیر | گھر میں جاتے ہیں پڑے تو خبرداری سے

وہ دن گئے کہ جو روتی تھیں چشم آب رقیق | گریں ہیں لخت دل آنکھوں سے اب تو مثل عقیق

کیا عجب بال ملائک ہوں اس جا گہ فرش | جس جگہ پا نو رکھے صاحب مسند میرا
جنس طاعت سے کچھ اپنے تو نہیں پاس امیر | مگر احمد کا ہوں میں اور ہے احمد میرا

(۷) امجد

مولوی امجد امجد تخلص کہ پیرایۂ حالش باکسوتِ فضل و کمال مزین است ہمیشہ بہ درس و تدریس گذرانده و در فارسی ہم بر غم علمائے دیگر معلوماتِ معقول بہم رسانده۔ دم از شاگردی نظام خاں معجز میزند و در گفتن معنی ابیات جلال اسیر وغیرہما رخش خیال در میدان وسعت می دواند۔ معہذا بمقتضائے موزونی جبلی بگفتن شعر فارسی و ہندی نیز قادر است۔ از مدت دراز دست بیعت بدست مولوی[۱] فخر الدین محمد صاحب نور اللہ مضجعہ گذاشتہ ہمیشہ در رہنمایان بطریق آداب و سلوک در شاہجہاں آباد ممتاز بودہ۔ عمرش قریب بہ ہفتاد باشد[۲] بازو۔

بسمل مجھے نہ چھوڑیو لے یار دیکھنا | ایسا ستم نہ کیجیو زنہار دیکھنا
ٹھوکر لگے ہے دل کو مرے ہر قدم کے بیچ | کرتی ہے کیا ستم تری رفتار دیکھنا
تو آکے دل جلوں کو ستاتا تو ہے رقیب | کوئی آہ لگ گئی تو مرے یار دیکھنا

جاں بلب تشنہ جگریاں سے چلا جاتا ہوں | لے خبر جلدی سے ساقی کہ موا جاتا ہوں

---

(۱) گرامی فخر الدین صاحب (ن ر)۔ (۲) خواہد بود (ن غ)

مست ہم آغوشی کو آنا مری اے سیل سرشک ‏ — اپنی ہی موج میں میں آپ بہا جاتا ہوں
حشر میں بھی نہ اٹھوں گا میں تک اک آنکھ لگے ‏ — اپنی بیداری سے یہاں تک تو خفا جاتا ہوں
ایک عالم نے تری تیغ سے پائی ہے نجات ‏ — سب گنہگاروں میں اک میں ہی رہا جاتا ہوں
جو کہا تو نے کہ آ بیٹھ تو میں بیٹھ گیا ‏ — جو کہا تو نے کہ جا یہاں سے کہا جاتا ہوں
جس گھڑی آپ کو دیکھوں ہوں میں جوں قطرۂ اشک ‏ — اپنی نظروں سے بھی امجد میں گرا جاتا ہوں

(۸) اسد

کہ میرا نی نام دارد جوانے بود ظریف مزاج و خندہ روی شاگرد مرزا محمد رفیع۔ دیوانے ضخیم ترتیب دادہ در قصائد و غزل و مثنوی ماہر خصوصاً مثنوی گنجفہ را بسیار[1] بہ تلاش گفتہ۔ اکثر در مشاعرہ فقیر در شاہجہاں آباد می رسید۔ اصلش از شاہجہاں آباد است و بقولے اکبر آباد۔ زبانی میرزو الفقار علی کہ ہمسایۂ ایشاں بود۔ چناں معلوم شد کہ شاعر الیہ عازم لکھنؤ شدہ است میخواست کہ خود را بہ پورب رساند چوں اجلش امان نہ داد در اثنائے راہ در سرائے بانگر مؤ ہنگام شب بدست دزداں کشتہ شد۔ عمرش قریب پنجاہ خواہد بود۔
از وست۔

مانے ہے کوئی وہ بت گمراہ کسی کی ‏ — گو آکے سفارش کرے اللہ کسی کی
پروانے پڑے جلتے ہیں روتی ہے کھڑی شمع ‏ — یارب نہ شب وصل ہو کوتاہ کسی کی
پھنس قید میں گر چاہ میں ہو گرگ کا طعمہ ‏ — جو چاہے اسد[2] کر نہ مگر چاہ کسی کی

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی ‏ — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

زلفیں ہی دیکھ کر نہ خجل رات ہو گئی ‏ — مکھڑا جو کھل گیا تو سحر مات ہو گئی

(۱) ن خ میں "بسیار" نہیں ہے (۲) جو چاہے اسد پہ نہ کر چاہ کسی کی (ن خ)

ناگنی زلف کی رہتی نہیں بن جان لئے　　کیا ہی بھری ہے بلا اُف ترا کاٹا نہ جئے

ہر ایک لالہ کا گل چار داغ لے نکلا　　گرے ہیں زیر زمیں داغدار کتنے ایک
شرار و شعلہ و پروانہ و دلِ بیتاب　　یہ ایک ایک سے ہیں بے قرار کتنے ایک

(۹) احسن

کہ مرزا احسن علی[1] نام دارد جوانے است سراپا خلق و خوش تقریر و خوش تحریر۔ پیش ازیں پیش خواجہ محمد یونس خاں می بود بعد ازاں در سرکار نواب وزیر مرحوم بصیغہ شاعری عزو امتیاز داشت۔ حالا در سرکار نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں بہادر ممتاز است۔ شعر خود را در اوائل فکر سخن از نظر میر ضیا می گزرانید۔ بعد ازاں از خدمت مرزا رفیع استفادہ گرفتہ۔ قوتِ شاعری چنانکہ شاعر را باید در قصیدہ وغیرہ پیدا کرد۔ چوں فی الجملہ طالب[2] علمی ہم دارد شعر را بہ متانت و رزانتِ تمام میگوید و احتیاطِ محاورہ و صحت زبان بسیار می کند۔ فقیر او را در لکھنؤ دیدہ۔ از دست۔

کل بوسہ کے سوال پہ کیا کیا نہ کہہ گیا　　میں اُس کے آگے اپنا سا منہ لیکے رہ گیا

اُلٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا　　دیکھا اُس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قمر نہ لگا　　بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
رہی جو تن میں مرے جان ایک رمق باقی　　لگا کے زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
اسی لئے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن　　گھڑی گھڑی میرے پاؤں کو چشم[3] تر نہ لگا

---

(۱) حسن علی (ن ر) (۲) طلب (ن ل) (۳) چشم تر (ن ر)

شب جو دھڑکا مرے دل کا خلل انداز رہا — کام دل لینے میں اُس شوخ سے میں باز رہا
شام کی صبح ہوئی بندِ قبا کھلنے میں — سیکڑوں جان سے جاویں گے جو یہ ناز رہا
لیکے دل بات میں کی خانہ خرابی اُس کی — جس کے گھر جا کے تو اے خانہ بر انداز رہا
ٹکڑے اُڑ جائیں گے سینہ میں جگر کے احسن — تیرے نالوں کا کوئی دن جو یہ انداز رہا

یہ راہ تھی کیسی کہ تیرے گھر تلک آتے — ہر گام پہ ہم بیٹھ گئے دل کو پکڑ کر
صاف آئی نظر شکلِ اجل آنکھوں میں احسن — جس دم کہ رکھا قبضہ پہ ہاتھ اُس نے اکڑ کر

کل جو اُس شوخ نے سنکھ ہو لڑائی آنکھیں — برق نے ابر کی چادر میں چھپائیں آنکھیں
شوخ چشمی پہ گھمنڈ اپنی نہ کیجو نرگس — آنکھیں کھل جائیں گی جب اُس نے دکھائیں آنکھیں
پشت پا رہے نظر اُٹھے نہ دیکھی ہم نے — واہ ری چشمِ حیا(۱) تو نے ری لجائیں آنکھیں
دوش دوں کس کو نہیں اس میں کسی کی تقصیر — آفتیں دل پہ مرے میری ہی لائیں آنکھیں
مل گئے خاک میں ہم تِس پہ بھی اُس ظالم نے — نہ ملائیں، نہ ملائیں، نہ ملائیں آنکھیں
کل عجب طرح سے تڑپے تھا ترے کوچہ میں — دیکھ کر حال کو احسن کے بھر آئیں آنکھیں

(۱۰) آشفتہ

کہ مرزا ضیا(۲) قلی نام دارد پسر حکیم محمد شفیع برادر بیات مرزا رضی جوانیست شوریده سر و وارستہ مزاج با وصف آشنائی با فن طبابت کہ موروثے ست چوں دیگراں دوکان خود فروشی نمی چنید۔ و در طرز گفتن و خواندن شعر شاگردی و تتبع میر سوز مفاخرت میکند۔ والحق کہ وقت روانیِ زبان حرکاتش از مردم سامعین دلفریبہا می نماید۔ شعر دردمندانہ کہ شستہ و صاف باشد دوست دارد۔ در ایامے کہ فقیر از شاہجہان آباد در لکھنؤ آمده

---

(۱) حیا ہی نے لجائیں (ن خ) (۲) مرزا رضا قلی (ن خ)

اول طرح مشاعرہ او انداختہ ۔ از دست ۔

چہرا کچھ ان دنوں غم پنہاں سے زرد ہے ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد ہے

یہ جوشِ غم ہے کہ سینہ میں خوں ابلتا ہے نہ رکھیو ہاتھ کلیجہ پہ میرے جلتا ہے
نہ پوچھو دل کی حقیقت تمہارے عشق میں آہ اُسے وہ غم جو لگا ہے اُسی میں گلتا ہے
یہ ہم کو اُس کی جدائی نے اور ایذا دی کہ رات دن کوئی سینہ میں دل کو ملتا ہے
کسی کے کان کا دُر دیکھا تو نے آشفتہ جو اشک آنکھوں سے موتی سا تیرے ڈھلتا ہے

وہ رشکِ مہر جو عالم میں بے نقاب پھرے پھر اس چمک سے نہ گرد دل پہ آفتاب پھرے
گئے سحر کل مجھے بٹھلا کے میں یہ آتا ہوں میں اپنے آنے کے صدقے بہت شتاب پھرے

لڑتے تو رات اُس سے میں غصہ میں لڑ لیا پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجہ پکڑ لیا

ہمیشہ آگ نکلتی ہے میرے سینہ سے الٰہی موت دے گذرا میں ایسے جینے سے
نہ جاوے کیونکہ بصارت وہ چاند سا مکھڑا نظر پڑا نہیں مجھکو کئی مہینے سے
ہو جس دماغ میں کچھ بوئے عشق وہ سمجھے ملی جلی ہوئی بو عطر کی پسینے سے

چلا ہے کعبہ کو آشفتہ پارسا بن کر خدا جو بیٹھے بٹھائے اسے خراب کرے

(۱۱) امین

کہ امین الدین خاں نام دارد پسر قاضی وحید الدین خاں کہ در عہد نواب نجیب الدولہ

خدمتِ قضا بآں بزرگ مفوض بود۔ جوانِ خوش اخلاق و خوش اختلاطاست۔ در شاہجہان آباد ہمسایۂ فقیر بود و شریک صحبت مشاعرہ نیز۔ حالا در سرکار صاحب عالم بخدمت داروغگی دوائی خانہ ممتاز است بمقتضائی موزونی طبع گاہ گاہی خیال شعر بندی می کرد و میکند یک شعر از و بخاطر است۔

کون آتا ہے یہ کس کے پانو کی آواز ہے ہر صدائی پا میں جس کے سو طرح کا ناز ہے

(۱۲) افسوس

کہ میر شیر علی نام دارد ابن میر علی مظفر خاں داروغۂ توپخانۂ عالیجاہ[1] جوانیست سلیم الطبع شعر کم از معاصرین نمی گوید بہ شاگردی میر حیدر علی حیراں افتخار دارد۔ اگرچہ پیش ازیں چندے از میر سوز نیز استفادہ کردہ۔ وطن بزرگانش نارنول است فقیر او را در لکھنؤ دیدہ۔ بسیار بخوبی و خلق پیش می آمد۔ از وست۔

ہنس کر کسی سے میں نے نہ کی بات تجھ بغیر روتے ہی آہ کٹ گئی یہ رات تجھ بغیر

کیا لکھوں اس کو میں احوال یہ کہنا قاصد بے حواسی کے سبب طاقت تحریر نہیں

کیا تو نے لکھا تھا جو ترے خط کے تئیں دیکھ آنسو لگے افسوس کی آنکھوں سے ٹپکنے

اُس کی صورت کے تئیں یاد دلا دیتا ہے ہنستے ہنستے مجھے یہ گل تو رُلا دیتا ہے

صلاح جانے جو کچھ کہیو اُس سے لے قاصد پیام کیا میں تجھے دوں نہیں حواس مجھے

(۱) نسخہ ر میں "عالیجاہ" نہیں ہے۔

آنکھوں کے اشارے سے غیروں کو بلاتا ہے   میاں جھوٹی نہ کھا قسمیں تو کس کو اڑاتا ہے

نہ اس لئے ملے ہیں کہ کچھ سیم و زر ملے   ہم تجھ سے آ کے اور ہی امید پر ملے
خط کا جواب ایک طرف یہ نہیں امید   جیتا پھر آ کے مجھ سے مرا نامہ بر ملے
کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہزار حیف   مدت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

منہ تو دکھلائے ذرا گو نہ ملاقات کرے   ہم کو سو وصل ہیں جو ہنس کے وہ اک بات کرے[1]

ہنس کر مجھے لوگوں میں اشارات نہ کیجے   رسوائی ہو جس بات میں وہ بات نہ کیجے

ابھی وہ پردہ میں ہے تسبیہ خلق مرتی ہے   غرض دکھائے یہ دیدار دیکھئے کیا ہو

دیکھتے ہی اُسے حاضر ہوئے مرجانے کو   دو ہی اشخاص جو یہاں آئے تھے سمجھانے کو

(۱۴۳) اصغر

کہ مرزا جواد علی نام دارد و قوم قزلباش اصل بزرگانش خراسان است۔ از دو پشت در ہندوستان بود و باش دارد۔ مولدش در لکھنؤ و نشو و نما نیز واقع شدہ۔ جوان حلیم و سلیم از شاگردانِ میرحسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ عمرش تا امروز بست و دو سالہ خواہد بود۔ از یاوریِ بخت سعید در عمر دوازدہ سالگی شرفِ زیارتِ نجفِ اشرف و کربلائے معلیٰ و کاظمین شریف یعنی بغداد کہنہ و سامرہ یعنی جائے پنہاں شدنِ حضرت صاحب الزماں دریافتہ۔ مدت چہار سال دریں سفر بود۔ بفضلِ الٰہی باز مراجعت نمودہ در لکھنؤ رسیدہ۔ از وست۔

---

(۱) ذرا بات کرے (ن خ).

ہووے نصیب جلد کہیں وصل یار کا　　احوال بے طرح ہے دلِ بے قرار کا

بزم میں اُس کی جو شب چاہ کا مذکور چلا　　اُٹھ کے مجلس سے وہیں وہ بتِ مغرور چلا

لوہو کی جگہ اشک میں لختِ جگر آیا　　دل کا مجھے احوال بُرا کچھ نظر آیا
بندہ ہوں تیرا اے اثرِ آہِ جگر سوز　　صدقہ سے تیرے نالہ میرا کارگر آیا
تو نے جو کہا پیارے مجھ کو ادھر آنا　　آنکھوں میں لہو مدعیوں کی اُتر آیا
کل اہلِ محلہ نے مجھے منع کیا تھا　　پھر آج میں اُس کوچہ میں ایک آہ بھر آیا

میرے حق میں تو بہتر ہے مجھے آرام ہوئیگا　　ولے تو قتل کرنے سے برے بدنام ہووے گا

ظالم تو مجھ سے کس لئے بیزار ہو گیا　　کیا رازِ دل مرا کہیں اظہار ہو گیا

جس کا خوباں سے دل لگا ہوگا　　وہ نہ آرام سے رہا ہوگا
دامِ الفت میں پھنس گیا تو ہوں　　دیکھوں انجام اس کا کیا ہوگا
مرگیا ہوگا وہ وفا کُشتہ　　جس کا معشوق بے وفا ہوگا

کہئے دیدار بھی دکھلایئے گا　　یا یونہیں دربدر پھرایئے گا

سمجھا تھا اُس کو اپنا گریباں غلط کیا　　کھینچا جو میں نے آپ کا داماں غلط کیا
لائے اُٹھا جو کوچۂ دلدار سے مجھے　　گو اس میں تم خفا ہو عزیزاں غلط کیا

احقر وہ بدمعاملہ ہے بن لکھے پڑھے
تو منے جو دل دیا اُسے ناداں غلط کیا

مجھے اس دوستی پر بد تر از دشمن سمجھتے ہو
غرض کشتہ ہوں میں تو آپ کی ہی بدگمانی کا

تو ایسی ساعدِ نازک پہ پیارے گل جو کھاتا ہے
نہیں آتا مجھے افسوس اپنی نوجوانی کا

ہم آخر ہو گئے بس انتظارِ صبح ہی کرتے
قیامت آج تو نے لے شبِ ہجراں درازی کی

کئے سو سو سلام لے احقر ہم نے اُسکو چپکے چپکے
پر اُس کے ناز نے اس پر بھی ہم سے بے نیازی کی

(۱۴) اکبر

عرف بچو جانیست شوخ طبع و طرار و لطیفہ گو۔ ہمیشہ نوکری خانۂ بادشاہ ممتاز در بوایان کردہ۔ درآں ایام کہ فقیر در شاہجہاں آباد طرح مشاعرہ انداختہ اول برائے اصلاح شعر رجوع بفقیر آوردہ بود۔ بعد چندے بخدمت شاہ حاتم رفتہ استفادہ کلی از ذات بابرکاتِ ایشاں برداشتہ۔ حالا صاحبِ دیوان است و بر رویۂ استاد قدم در راہِ ایہام گوئی بیشتر می گذارد و در آں معنی ہائے تازہ می بندد۔ اما فقیر اشعار ایہام را دوست نمی دارد لہٰذا دو سہ شعرِ سادہ ازو نوشتہ شد و آں نیست۔

ہمارے دل میں خنجر ناز کے کیا کیا گزرتے ہیں
یہ کافر خوبرو جس وقت تن کر ٹک اکڑتے ہیں

یہ جتنے خوبرو سرکش ہیں ان کو خوب دیکھا ہے
گئے پر جن کے ہر ایک کے پھر پاؤں پڑتے ہیں

خدا چاہے سو ہوئے اب ہمارے حق میں اے اکبر
صنم سے اپنے ہم بھی آج ایک بوسہ پہ اڑتے ہیں

(۱۵) انشا

انشا تخلص سید انشاء اللہ خاں نام دارد خلف الرشید میر ماشاء اللہ خاں۔ وطن

---

(۱) کرد (ن خ) (۲) بن (ن خ) (۳) پاؤں (ن خ)

بزرگانش نجف اشرف وخودش در مرشد آباد تولد یافتہ تحصیل کتب عربیہ و فارسیہ وطب بقدر حال ہمہ دارد - از ابتدائے عمر بحکم موزونی طبع شعر در ہر سہ زبان می گوید وزور طبیعت می نماید اما میلان طبع اش بطرف ریختہ بیشتر است - مثنوی شیر و برنج در جواب نان و حلوار مولانا بہار الدین آملی بسیار صفا گفتہ و داد فصاحت زبان فارسی در و دادہ - دیوانش از نظر فقیر گذشت - اگر چہ ہمہ کلامش در عالم ظرافت خالی از کیفیتی نیست اما انچہ از اشعار سادہ اش انتخاب فقیر افتادہ اینست -

ہے اور کوئی ایسا بھی پن یہ چبن نکلے ۔۔۔ سچ و سچ اسے کہتے ہیں ہیبا ختہ پن نکلے
افشاں کا وہ عالم ہے اُس چاند سے مکھڑے پہ ۔۔۔ جوں وقت سحر انشا سورج کی کرن نکلے

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا ۔۔۔ لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا
اغیار سے کرتے ہو میرے سامنے باتیں ۔۔۔ مجھ پر یہ لگے کرنے نیا تم ستم اچھا
اس ہستی موہوم سی میں تنگ ہوں انشا ۔۔۔ واللہ کہ اس سے بمراتب عدم اچھا

ٹک آنکھ ملاتے ہی کیا کام ہمارا ۔۔۔ تس پر یہ غضب پوچھتے ہو نام ہمارا
رکھتے ہیں کہیں پانو تو پڑتے ہیں کہیں اور ۔۔۔ ساقی تو ذرا ہاتھ تو لے تھام ہمارا
بے تابی دل کے سبب اُس شوخ تلک انشا ۔۔۔ پہنچے ہے بلا واسطہ پیغام ہمارا

ہے شب وصل کھلے کاش نہ دروازۂ صبح ۔۔۔ کم نہیں شور قیامت سے یہ آوازۂ صبح

مانگا جو اُس [۱] سے بوسہ میں نے چمن کے اندر ۔۔۔ بولا کہ یہاں نہیں چل چھپی بھون کے اندر

(۱) مانگا جو میں نے بوسہ اُس سے چمن کے اندر (ن خ)

کریاں ذرے ہیں چلنے پہ یاں سب یار بیٹھے ہیں — بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے سنا انشا — غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گاہ گاہے جو ادھر آپ کرم کرتے ہیں — وہ ہیں آٹھ جاتے ہیں یہ اور ستم کرتے ہیں

کل وہ نگہہ اچٹتی ہوئی یوں جو پڑ گئی — بے اختیار اس سے میری آنکھ لڑ گئی
اٹھتی نہیں جو دل سے صدا آہ کیا ہوا — اس ساعتِ فرنگ کی کیا کل بگڑ گئی

(۱۶) اختر

میر اکبر علی اختر کہ پیش ازیں انجم تخلص می کرد ولد میر عبد اللہ ابن حضرت انسان پانصد منی[1] کہ ایشاں پیرزادہ ہائے نواب قمر الدین خاں بودند جوان ظریف الطبع ولسان است۔ در فن ساختن انواع آتشبازی وغیرہ نظیر خود ندارد روزے کہ مومی الیہ ہمراہ مرزا جانی کہ از کربلائے معلیٰ آمدہ بودند بلکھنو آمد فقیر درآں ایام رفیق میر محمد نعیم خاں صاحب بود چوں مرزائے موصوف بسابقہ معرفت بخانۂ میر صاحب موصوف فرود آمدہ بودند بعد چندے تعریف صنائعش بیان نمودہ اورا بہ سرکار میر صاحب نوکر کنانیدند الحاصل درہماں روزہا با فقیر نیازمندی کردہ چیزے شکستہ بستہ خود را برائے اصلاح اکثر می آورد۔ چوں چند سال بریں بگذشت و روزگار فقیر برہم خورد و وحشتِ مزاج برآں زیادہ گردید و مطلقاً بہ شعر و شاعری سروکار نماند بلکہ نفرت کلی رو داد۔ مومی الیہ موافق معمول برائے اصلاح می آمد و متصدعِ اوقاتِ آزادگی می شد۔ لہٰذا جواب دادم کہ مرا دماغ اصلاح نماندہ است پیش میاں قلندر بخش جرأت بروید و اکنوں شعر خود را

---

[1] عالیشان پانصد منی بجنسہ (ن خ ر)

بہ ایشاں بنمائید اول راضی بریں نبود چوں دید کہ طبیعت ایشاں آزردہ میشود پیش شما آمدہ رفت وصورتِ حال را اظہار کرد۔ جرأت گفت کہ میانِ من و ایشاں دوستی است وقول شمارا چہ اعتبار اگر رقعہ از دستِ ایشاں نویسانیدہ بیارید مضائقہ ندارد۔ آخر کار چوں روز دویم آمدہ درخواستِ رقعہ از من کرد نوشتہ دادم۔ از ہماں روز آنچہ گفتہ و می گوید بہ میاں جرأت می نماید۔ عمرش تقریباً از سی متجاوز باشد۔ از وست۔

صاف دل سی بھی جو اس کو اپنی ہم گھر لے گئے ‌ ‌ ‌ تو بھی سب دل میں گماں کچھ اور ہم پہلے گئے
بولے گھبرا کر ہمیں بیٹھے جو یہ حرکت کرے ‌ ‌ ‌ سامنے اُس کے گلے تک ہم جو خنجر لے گئے
کر رہے ہیں لوگ باہر کے جو سب چرچا ابھی ‌ ‌ ‌ کون تھا وہ جس کو تم شب گھر کے اندر لے گئے

یہ تیغ جو کھینچے ہی قاتل اسے کہتے ہیں ‌ ‌ ‌ تڑپے ہی جو دل میرا بسمل اسے کہتے ہیں
یارب وہ ملے مجھ سے تا لوگ کہیں مجکو ‌ ‌ ‌ ساحر اسے کہتے ہیں عامل اسے کہتے ہیں
آخر میں اُسے چاہا یہاں تک کہ وہ میرا بھی ‌ ‌ ‌ قائل ہی کہ ہاں سچ ہی مائل اسے کہتے ہیں

کس رشکِ گل سے لگ کر آئی صبا چمن میں ‌ ‌ ‌ کیا بو مہک رہی ہی اب جا بجا چمن میں

اور کیا خاک ہو کوئی تجھ پہ ستمگر عاشق ‌ ‌ ‌ روتے پھرتے ہیں ترے اگلے ہی گھر گھر عاشق

سوچتے کیا ہو میرے قتل کو میاں بسم اللہ ‌ ‌ ‌ کھینچ کر تیغ لگا کہنے ہاں بسم اللہ

صدا آواز کی بھی ہم تو سننے کو ترستے ہیں ‌ ‌ ‌ خوشا حال اُن کا ہی جو آپکے ہمسایہ[1] بستے ہیں
کیا مدفون کس کو کرکے ٹکڑے تونے اے قاتل ‌ ‌ ‌ کہ جس کی خاک پہ یار کے ٹکڑے برستے ہیں

---

(۱) ہمسایہ میں (ن خ)

تمھاری جنبشِ ابرو ہی کا مارا ہو وہ پیارے کر انجم سے کے ناحق قتل پا باب آپ کستے ہیں

تماشے کی ہے جا مژگاں پہ جو لختِ جگر نکلا عجب یہ نخل ہے جس میں کہ نسکل گل ثمر نکلا

اشک خونیں یہ نہیں کیا رنگ دکھلانے لگے جو سرِ مژگاں پہ اب لختِ جگر آنے لگے
کچھ ستارا شاید انجم کا پھرا ہے ان دنوں تم جو پاس اپنے اُسے پھر ہر کے بلانے لگے

لائی صبا یہ کس کی نکہت چمن کے اندر چھپتی ہے بوئے غنچہ سو پیرہن کے اندر

اللہ اللہ رے تیری جلوہ گری کا عالم نہ لگے گرد کو بھی جس کی پری کا عالم
پھروں ہیں آپ میں آتا نہیں ہمدم اُس بن مجھ سے مت پوچھ میری بیخبری کا عالم
کیا کہوں کل تیری رفتار کی اٹھکیلی دیکھ کچھ عجب حال سے تھا کبک دری کا عالم
لیکے دل جان سے مارا مجھے اختر اس نے کیا کہوں اُس کی میں بیدادگری کا عالم

کوئی جتائے یہ اُس شوخ بیوفا کے تئیں کہ آشنا نہیں دکھ دیتے آشنا کے تئیں
شبِ وصال میں بھی منہ کو پھیر بیٹھا وہ زباں پہ لایا جو میں حرفِ مدعا کے تئیں

گر نہیں وصل کے دن جی پر ملال ہوگا تو ہجر میں الٰہی کیا اپنا حال ہوگا

ہمارا لیکے خط تجھ سے اگر وہ نامہ بر کھولے تو کہہ دینا اُسے ٹک دائیں بائیں دیکھ کر کھولے
پھڑک تا رہ گیا مرغِ چمن حسرت میں اُڑنے کی بوقتِ ذبح بھی صیاد نے اُس کے نہ پر کھولے

(۱۷) آشفتہ

بورے خاں جوان صلاحیت شعار و سپاہی پیشہ است پیش ازیں روزہائے کہ فقیر در دہلی بود دیوان شوکت بخارائی از ملائے میخواند۔ و ہم بروئیہ اش کم کم فکر شعر فارسی بتلاش تمام می کرد۔ چوں ایں ماجرا بعرصۂ طویل گزشت اکنوں کہ دوبارہ بفاصلہ قلیل بلکھنؤ گزر افگندہ دیدش کہ در ریختہ زبانے و بیانے پیدا کردہ و دیوانے درست ساختہ۔ اما عجب اینست کہ باوصف ملاقات کلامش بدست فقیر نیامد مگر ہمیں غزل ازوست۔

جام گدائی ہاتھ میں لخت سانچ سیئے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دو نو بھکاری حسن کے تمہ پھرتے ہیں

مدت سے اے اختر طالع ماہ جبیں بن گردش میں
کھول تو ہمن پوچھی انی کب دن بیرے پھرتے ہیں

بندت پوچھو ہاتھ دکھاؤ فال کھلاؤ کوئی پر
دن جو ہیوں برگشتہ انی کس کے پھیرے سے پھرتے ہیں

عقل و فراست سلب ہوئے سب بائی جنون آئی جو
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیری گھیری پھرتے ہیں

یوں کاندھوں پر زلفیں اس کی بل کھاتی ہیں و تیغ ام
مارسیہ کو ڈال گلے میں جیسے سپیری پھرتے ہیں

جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک اُن زلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیری پھرتے ہیں

(۱۸) افسر

غلام اشرف[۱] ولد غلام رسول کہ در مرثیہ و سلام اشرف تخلص می کند و در شعر افسر قرار دادہ۔ قوم شیخ بزرگانش چودھری[۲] گاؤ خانہ بادشاہی بودہ اند۔ مشارٌ الیہ بمقتضائے موزونی طبع از یک دو سال فکر مرثیہ و سلام بر سبیل رواج زمانہ کردہ و می کند۔ در ایامیکہ مؤلف طرح مشاعرہ افگندہ درآں روزہا بترغیب فقیر مجموع پنج غزل طرحی مشاعرہ گفتہ از نظر فقیر گزرانیدہ طبعش مناسبت تمام بدرستی کلام دارد۔ ازدست۔

---

(۱) شرف ــ ن خ (۲) داروغہ کارخانہ ــ (ن خ)

جب دیکھے ہے مہ داغ سیا اپنی جبیں پر
آتا ہے اُسے رشک ترے رُوئے حسیں پر
معلوم نہیں کیا ہو تہہ خاک تماشا
نرگس کی جو رہتی ہے جھکی آنکھ زمیں پر

کٹے ہے خواب میں غفلت کے دوستاں شبِ عمر
یہ عمر جاتی ہے افسوس رائیگاں ہر روز
بہار آنے کی کچھ تو خبر سنی ہے جواب
کرے ہے صحنِ چمن صاف باغباں ہر روز
نہ طول اُس کا ہوتا روزِ آخرت آخر
کہوں گر اپنی شبِ غم کی داستاں ہر روز
جگاتا پھرتا ہے جواب عدم سے فتنہ کو
یہ بے سبب نہیں گردش میں آسماں ہر روز
غمِ فراق سے اس شعلہ رو کے اے افسرؔ
جلا کرے ہے میرا مغزِ استخواں ہر روز

چہرے پہ ماہ کے نہ کیا کر خیال تو
آئینہ لیکے دیکھ ٹک اپنا جمال تو
گویا شفق میں پنجۂ خورشید غرق ہے
جس وقت ہاتھ مہندی سے کرتا ہے لال تو

اب نہیں ہم سے وہ الفت اور ملنا یار سے
بیشتر ہے ربط اُس کو آج کل اغیار سے
ایک جنسِ حسن تھی سو وہ زلیخا لے گئی
کیا خریدیں جا کے اب ہم مصر کے بازار سے
تک نزاکت دیکھیو پہنے ہے گجرا جب وہ شوخ
شاخِ گل سا ہاتھ لچکے ہے گلوں کے بار سے
سینکڑوں کے خانۂ دل پر خرابی آ گئی
ایک دن جھانکا تھا اس نے رخنۂ دیوار سے
کچھ تمنا دل کو اپنے باغِ جنت کی نہیں
کام اے افسرؔ ہے مجکو کوچۂ دلدار سے

(۱۹) اوباش

شیخ امیر الزماں بجنوری اوباش تخلص از شیخ زادہ ہائے لکھنؤ جوانِ صلاحیت شعار است۔ بمقتضائے موزونی طبع چیزے کہ گفتہ آنرا بر بیاضے نوشتہ داشتہ روزے

---

(۱) خواب عدم (ن خ)

ہمہ کلام خود را بہ نظر مؤلف گزرانیدہ آنچہ عجالتاً بطور انتخاب افتادہ اینست۔

یار مجھ سے وہ مہ جبیں نہ ہوا — میری خواہش پہ آسماں نہ پھرا
دین و دنیا سے ہم پھرے پر آہ — اپنی خو سے وہ بدگماں نہ پھرا
ہو گئے پیر انتظار[1] میں ہم — تو بھی او باش وہ جواں نہ پھرا

خون ہو دل کاوش سے اس کی بہ گیا — ٹوٹ کر سینہ میں پیکاں رہ گیا
مجھ سے مت منزل کی پوچھو سرگزشت — ہمرہان آگے گئے میں رہ گیا

چمکے ہے چشم تر میں رخ اس بے حجاب کا — پانی میں جیسے عکس پڑے آفتاب کا

دل و دیدہ اپنے جو یار تھے سو وہ درد و غم میں پھنسا گئے — ہمیں جن سے چشم امید تھی وہ ہمیں سے آنکھ[2] چرا گئے

(۲۰) الہام

شاہ ملول الہام تخلص قوم شیخ کہ پیش ازیں تخلص ایشاں ملول بود شاعر فارسی گو است طبیعتش چوں بحر مواج رعناں رواں افتادہ۔ کم کم بطرف ریختہ ہم متوجہ می شود بعضے از موزوناں لکھنؤ چہ در فارسی و چہ در ہندی شاگردیش را فخر خود می شمارند و اورا استاد مسلم الثبوت می دانند والحق کہ در درویشی و شاعریش دوش بدوش راہ می رود و بہ سبب نام و درویشی اعالی و ادانی شہر توقیر و تعظیمش را موجب افتخار می پندارند وطن اجدادش ہمیں شہر لکھنؤ و قبل مرادآباد۔ عمرش از شصت متجاوز باشد ازوست۔

قدر تو نے کچھ نہ جانی گو برے یا نیک تھے — ناز برداروں میں پر ظالم ترے ہم ایک تھے

---

(۱) انتظاری میں (ن ر) (۲) آنکھیں (ن ر)

نگہ وہ شوخ کہ طعنہ کٹار پر مارے	مژہ وہ تیر[1] کہ خنجر کو دھار پر مارے

حرف الباء

(۱) بیدار

بیدار کہ میر محمد علی نام دارد بہ میر محمدی بیدار مشہور است شاگرد مرتضیٰ قلی بیگ فراق تخلص کہ شاعر فارسی گو گذشتہ ۔ جوانیست محمد شاہی قامت حال خود را بہ لباس درویشی[2] آراستہ دارد یعنی بھنیٹھہ گیروی بر سر تاج می بندد و دیگر لباس اوبطور دنیا داران است ۔ در عرب سرائے اقامت دارد ۔ دیوان ریختہ اش مشہور است زبانش بسیار رشستہ و رفتہ ۔ کم کم فکر شعر فارسی ہم می کند چنانچہ اشعار فارسی خود را نیز از قسم چند غزل و رباعی و دو سہ قصیدہ کہ در نعت و منقبت وغیرہ گفتہ بر پشت سرورق دیوان خود نوشتہ داخل ساختہ ۔ چوں اعتقاد بجناب مولوی فخر الدین صاحب بسیار داشت ہر گاہ کہ از عرب سرائے در مدرسہ غازی الدین خاں برائے دیدن آں بزرگ می آمد ۔ گاہ گاہ بہ فقیر ہم اتفاق ملاقات می افتاد و صحبت شعر میان می آمد ۔ حالا گویند کہ از چندے در اکبر آباد رونق افزا است ۔ دیوانش از نظر فقیر گزشت ۔ انتخاب اوست ۔

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجے گا	ایک ملنے کو نہ کم کیجے گا
گر یہی زلف و یہی مکھڑا ہے	غارت دیر و حرم کیجے گا
جی میں ہے آج کیا ہے مکتوب	یہی بیت اُس کو رقم کیجے گا
مہربانی سے پھر اے بندہ نواز	کہئے کس روز کرم کیجے گا

---

(۱) تیر (اوخ) (۲) لباس شاہی یعنی درویشی دارد نخ

تنہا نہ دل ہی لشکرِ غم دیکھ ٹل گیا — اس معرکے میں پائے تحمل بھی چل گیا
گزری شبِ شباب ہوا دورِ شب اخیر — کچھ بھی خبر ہے قافلہ آگے نکل گیا
قابل مقام کے نہیں بیدار یہ سرائے — منزل ہے دور، خواب سے اٹھ، دن تو ڈھل گیا

مل گئی تھی اس میں کل کس کے دلِ سوزاں کی خاک
گرد و بادِ دشت فرسا شعلہ جوالہ تھا
ہوگیا گرتے ہی تیری چشم سے دامن کے پار
اشک تھا بیدار یا یہ آگ کا پرکالہ تھا

حیف ہے ایسی زندگانی پر — کہ فدا ہو نہ یار جانی پر
حال سن سن کے ہنس دیا میرا — کچھ تو آیا ہے مہربانی پر

ہے بعد مرگ گور میں شورِ جنوں ہنوز — میں کشمکش میں دست و گریباں کی ہوں ہنوز
آیا تھا رات خواب میں وہ سروِ خوش خرام — بیدار چشم سے ہے رواں جوئے خوں ہنوز

اب تک میرے احوال سے واں بے خبری ہے — اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے
فولاد دلاں چھیڑیو زنہار نہ مجھ کو — چھاتی مری جوں سنگ شراروں سے بھری ہے
ہے زور میں کچھ آب و ہوا شہرِ عدم کی — ہر شخص کہ بیدار ادھر کو سفری ہے

مقدور کیا مجھے کہ کہوں واں کہ یاں رہے — دیں چشم و دل گھر اس کے جہاں چاہے واں رہے
نے بتکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا — محوِ خیالِ یار سدا ہم جہاں رہے

آئے تو ہو پہ دل کی تسلی ہو تب مری ‏ اتنا کہو کہ آج نہ جائیں گے ہاں رہے
بیدار زلف کھینچے اُدھر چشم یار اِدھر ‏ حیراں ہو دل کہاں نہ رہے کن کہاں رہے

کیا ہوئے گلشن میں آ کر اے عزیزاں شاد ہم ‏ روئے ہر گل کے گلے لگ یار کو کر یاد ہم
قتل تو کرتا ہے آخر کھول دے آنکھیں ٹک[1] ‏ دیکھ لیویں تیری صورت پھر کے اے جلاد ہم

قاصد اس کا پیام کچھ بھی ہے ‏ یا دعا یا سلام کچھ بھی ہے
تو جو بیداریوں پھرے ہے خراب ‏ پاس ناموس و نام کچھ بھی ہے

صبا کوچہ میں تیری اس لئے ہر صبح آتی ہے ‏ کہ تیری بو سی جا پھولوں کو گلشن میں سناتی ہے
بہ چشم اشک و بدل داغ و بلب آہ و بغم دوری ‏ تری الفت مجھے اے بیوفا کیا کیا دکھاتی ہے

جان تک تو نہیں ہے تجھ سے دریغ ‏ اے میں قربان کیوں تو برہم ہے
گاہ رونا[2] ہے گاہ ہنسنا ہے ‏ عاشقی کا بھی زور عالم ہے

اُٹھ کے لوگوں سے کنارے آئیے ‏ کچھ ہمیں کہنا ہے پیارے آئیے
کچھ تو کی تاثیر نالے نے مرے ‏ آئے تم مدت میں بارے آئیے

جو کچھ چاہئے آپ ہی فرمائیے ‏ پہ غیروں کی باتیں نہ سنوائیے
نصیحت سے بیدار کیا فائدہ ‏ جو ہو آپ میں اس کو سمجھائیے

---

(۱) اب بجائے ایک (ن خ) (۲) روتا بجائے رونا ہنستا بجائے ہنسنا (ن خ)

گر بڑے مرد ہو تو غیر کو یہاں جا دیجے　　اس کو کہہ دیکھئے بیٹھے ہمیں اٹھوا دیجے

جس وقت تو بے نقاب آوے　　ہو گا کوئی جس کو تاب آوے
اے جان بلب رسیدہ آنا　　رہتا ہے کہ تا جواب[1] آوے
بیدار کو تجھ بن اے دل آرام　　ہوتا ہی نہیں کہ خواب آوے

سلام بھی ہے زمانے میں اور دعا بھی ہے　　ہمارے یار نے قاصد سے کچھ کہا بھی ہے

جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہو گئے　　شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہو گئے

جی میں بیدار تیرے ملنے کے　　ہائے کیا کیا خیال رکھتا ہے

جی میں بیدار کھب گئے میرے　　فندق اس پنجۂ حنائی کے

سیا تو ہے یہ کوئی دم میں پھر گریباں کا　　جدا جدا نظر آتا ہے تار تار مجھے
یہ پیچ و تاب تو کچھ بے سبب نہیں بیدار　　دکھا گیا ہے کوئی زلف تابدار مجھے

دانت تو کیا ہیں اگر کاٹو چھری سی پیارے　　ہاتھ سے میرے تو ممکن نہیں داماں چھٹے

یوں مجھ پہ جفا ہزار کیجو　　پر غیر کو تو نہ پیار کیجو
کرتے تو ہو تم وفا کی باتیں　　پر ہم سے ٹک آنکھیں چار کیجو

---

(۱) رہ جاتو کہ تا جواب - (ن خ)

بیدار تو اس جہاں میں آ کر جو چاہے سو میرے یار کیجو
پر جس سے گرے کسو کے دل سے وہ کام نہ اختیار کیجو

کہاں ہیں طالع بیدار یہ کہ ایسا ہو کہ سر دھرے مرے زانو پہ یار سوتا ہو

صورت اس کی سما گئی جی میں آہ کیا آن بھا گئی جی میں
تو جو بیدار یوں ہوا تارک ایسی کیا بات آ گئی جی میں

مان کہنے کو نہ جا چھوڑ کے اس وقت مجھے بات رہ جائے گی اور دن تو گذر جاتے ہیں

تیری ہم خاطر نازک سے خطر[۱] کرتے ہیں ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
دل و دیں تھا سو لیا اور بھی کچھ مطلب ہے بار بار آپ جو ایدھر کو نظر کرتے ہیں
کیا ہو گر ایک[۲] گھڑی یہاں بھی کرم فرماؤ آپ اس راہ سے آخر تو گذر کرتے ہیں
تیرے ایام فراق اے صنم مہر گسل آہ مت پوچھ کہ کس طرح بسر کرتے ہیں
دن کو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈتے اور رات تمام شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں
یہ وہی فتنۂ آشوب جہاں ہے بیدار دیکھ کر پیر و جواں جس کو حذر کرتے ہیں
بس نہیں خوب کہ ایسے کو دل اپنا دیجے آگے تو جان میاں ہم تو خبر کرتے ہیں

جانیں مشتاقوں کے لب پر آئیاں بل بے ظالم تیری بے پروائیاں
سادہ روئی ہی غضب ہے تس پہ اور کرتے ہو ہر لحظہ حسن آرائیاں

---

(۱) حذر بجائے خطر (ن خ) (۲) کوئی بجائے ایک (ن خ)

یوں بہارِ خطِ سبز اُس کے ہی رخسار کے ساتھ | جیسے پھولا ہو بنفشہ کہیں گلزار کے ساتھ
آہ مت پوچھ کہ کس طرح کٹی شب تجھ بن | صبح کی رو رو گلے لگ در و دیوار کے ساتھ
آئینہ دیکھ تو اس منہ سے تجھے اے طوطی | دعوی ہم سخنی اس لب و گفتار کے ساتھ

اُس آئینہ رو کے ہو مقابل | معلوم نہیں کدھر گئے ہم
جوں شمع اس انجمن سے بیدار | لے[1] داغِ دل و جگر گئے ہم

یہ بھی کوئی وضع ہے آنے کی جو آتے ہو تم | ایک دم آئے نہیں گذرا کہ پھر جاتے ہو تم
دور سے یوں تو کبھی[2] جھلک دکھا جاتے ہو تم | پر جو چاہوں یہ کہ پاس آؤ کہاں آتے ہو تم
کہئے مجھ سے تو بھلا آشنا کہ یہ میں بھی سنوں | بندہ پرور کس کے ہاں تشریف فرماتے ہو تم
اس پری صورت بلا انگیز کو دیکھا نہیں | ناصحو معذور ہو گر مجھ کو سمجھاتے ہو تم
دیکھئے خرمن پہ یہ برق بلا کس کے گرے[3] | بے طرح کچھ تیوری بدلے چلے آتے ہو تم
جو کوئی بندہ ہوا اپنا اُس سے پھر کیا ہے حجاب | میں تو اس لائق نہیں جو مجھ سے شرماتے ہو تم
آج یہ گو اور یہ میداں انہیں کہہ دیجئے | دیکھیں یوں جن کے بھروسے مجھکو دھمکاتے ہو تم
پھر نہ آویں گے کبھی ایسے اگر آزردہ ہو | بس چلے ہم خوش رہو کاہے کو جھنجھلاتے ہو تم
حالتِ بیدار اب کیا کیجئے آگے بیاں | وقت ہے اب بھی اگر تشریف فرماتے ہو تم

(۲) بیان

کہ خواجہ احسن الدین خان نام دارد، شاگردِ مرزا مظہر۔ دست بیعت بہ مولوی فخر الدین صاحب نور اللہ مضجعہٗ دادہ۔ شاعرِ مربوط گو و صاحبِ زبان است۔ مدتے گذشتہ کہ بطرفِ دکن رفتہ گویند کہ در سرکارِ نظام علی خاں عزّ و امتیاز دارد۔ فقیر ہنوز

---

(۱) بے بجائے لے۔ (ن خ) (۲) کبھی۔ (ن خ) (۳) پڑے (ن خ)

اور اندیدہ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ انتخاب دیوان اوست۔

کسی کا کوئی بیاں آشنا نہیں دیکھا سوائے اس کی بھی آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

میں ترے ڈر سے رو نہیں سکتا گرد غم دل سے دھو نہیں سکتا
شب مرا شور گریہ سن کے کہا اس کے ہاتھوں میں سو نہیں سکتا
مصلحت ترک عشق ہے ناصح لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
جوں مسلسل بیاں کہے ہے سخن کوئی موتی پرو نہیں سکتا

ہمدم نہ فکر کر کہ مرا کام ہو چکا جو دل یہی ہے تو مجھے آرام ہو چکا
آتا ہے تجکو ننگ مرے نام سے عبث لے شوخ اب تو شہر میں بدنام ہو چکا

گل کی حسرت سے مرے دل میں ہے اخار رہا میں تو بھر عمر قفس ہی میں گرفتار رہا

قفس میں میری رہائی کے لئے کیا کیا نہیں کرتا پھڑکتا ہوں تڑپتا ہوں کوئی پروا نہیں کرتا

جانے دے مجکو لے ہوس سیر گلستاں اب اس چمن سے اپنے غم آباد کی طرف
وامق تو کیا ہے قیس بھی جاتا ہے تجکو بھول جب دیکھتا ہوں حسرت فرہاد کی طرف
ہووے گا ذوق حسرت دیدار میں خلل شیریں گذر نہ کیجیو فرہاد کی طرف
باتوں میں آہ کس نے لگایا اسے بیاں رکھے تھے کان ٹک مری فریاد کی طرف

بھلا سن تو اے دین وایمانِ عاشق ہوا ہے تو کیوں دشمنِ جانِ عاشق

مقابل ہی رہتا ہے ہر وقت تیرے — ہر آئینہ یا چشم حیران عاشق
بیاں اس برابر بھی دولت ہے کوئی — کہ معشوق ہووے ثناخوان عاشق

میں جانتا تھا وصل کی شب کچھ دراز ہے — آنکھیں جو کھل گئیں تو درِ صبح باز ہے
ظاہر میں وصل کا نہیں اسباب گو بیاں — نومید بھی نہ ہو کہ خدا کارساز ہے

رخصت ہے عقل و ہوش کو جا ہے جہاں رہے — اے ساکنانِ کوئے بتاں ہم تو یہاں رہے
کیا دیکھتے ہو دل کو مرے تم الٹ پلٹ — آیا ہے گر پسند تو لے مہرباں رہے
فرہاد و قیس نے تو لیا گھیر کوہ و دشت — اب کونسی جگہ ہے کہ جس میں بیاں رہے

خدا کرے کہ خفا ہوکے جی نکل جاوے — کہیں شتاب یہ قضیہ چکے خلل جاوے
میں وہ نہیں کہ ترا جا بجا کروں شکوہ — ترے فراق میں گو جی مرا نکل جاوے
جو سوز دل سے کوئی حرف منہ پہ آیا ہو — خدا کرے کہ بیاں کی زبان جل جاوے

جو ہوتا ہے ریحان و سنبل کے صدقے — نہ ہو کیونکہ اُس زلف و کاکل کے صدقے
خزاں میں بھی چھوڑا نہ طوف چمن کو — غرض ہوجیے عشق بلبل کے صدقے
جلو میں پھرے ہیں پریزاد لڑکے — دِوانے ترے اس تجمل کے صدقے
ابھی وعدہ کر کر لگا سوچنے تو — نہیں یاد گویا، تامل کے صدقے
بیاں کون ہے اب تلک پوچھتے ہو — تغافل کے قربان تجاہل کے صدقے

رسوا نہ کر خدا سے ڈر اے چشم تر مجھے — آنا ہے اُس کی بزم میں بار دگر مجھے

ساقی تری نگاہ کے صدقے میں اِکبار ‌ ‌ ‌ دونوں جہاں کی فکر سے کر بے خبر مجھے
آیا ہوں اُس گلی سے ابھی دم نہیں لیا ‌ ‌ ‌ پھر سے چلا ہے یہ دلِ وحشی اُدھر مجھے

آفریں عشق کو بیان تیرے ‌ ‌ ‌ مر گیا ضبط سے پہ آہ نہ کی

چشم کرم کسو ہی سے اپنے تئیں نہیں رہی ‌ ‌ ‌ رسم مروت اُٹھ گئی پھر کہیں نہیں رہی
وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تجھ سے ہم نشیں ‌ ‌ ‌ شام سے لیک صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی

ہمیشہ کہتے ہو مجھ سے کہ بے وفا تم ہو ‌ ‌ ‌ خدا ہی جانے بری جان میں ہوں یا تم ہو

کافر ہوں جو زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو ‌ ‌ ‌ ایک بے خلل سی جا ہو جس میں ہوں اور تو ہو

گئی مجنوں کے ساتھ ذوقِ عشق ‌ ‌ ‌ اتنی کچھ جہل تھی بیان تک ہے

تھا حکمِ شرعِ عشق کہ ہرگز نہ رو بیاں ‌ ‌ ‌ گو ضبطِ گریہ سے نہ ترے جی کو کل پڑے
بھر عمر ہم نے ضبط کیا ایک وقتِ نزع ‌ ‌ ‌ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی ‌ ‌ ‌ ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی
کیدھر سے کہاں ہے خوش ملی تو ‌ ‌ ‌ ہم سے بھی کبھی تو آشنا تھی

شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے ‌ ‌ ‌ یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے

جا کہو کوئے یار میں کوئی مر گیا انتظار میں کوئی
کیوں بیاں سیر باغ کی رخصت نہیں دیتا بہار میں کوئی

جنگ پر جس کی لوگ لڑتے ہیں صلح میں اُس کی کیا مزا ہوگا

جاتا ہے یار کچھ تو بیاںؔ منہ سے بولئے اے بے نصیب مانع گفتار کون ہے

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی جس طرح کٹا روز گذر جاوے گی شب بھی

رُباعیات

کیا تو نے سمجھ کے دل بیاںؔ اُس کو دیا میں کیا کہوں اُس کی خوبیاں ہیں کیا کیا
بدخو بدعہد شوخ سرکش مغرور بے دین بے مہر بے وفا بے پروا

جس شخص سے ہو تی نہیں قنبر کی مدح وہ کیونکہ کرے حیدر صفدر کی مدح
مجھ سے تو یقیں کی نہیں ہو تی تعریف کس منہ سے کروں حضرت مظہر کی مدح

ازبس میں نہیں زباں پہ اپنی قادر اکثر ہو تی ہیں دل کی باتیں ظاہر
کہتا ہے وہ طفل شرمگیں جھنجھلا کر یارب عاشق نہ ہو کسی کا شاعر

(۳) بیتاب

کہ از دورۂ سابقین است چنانچہ از زبانش می تراود۔ از وست۔

اُس کے ابرو ہلال کے مانند خال اس کا بلال کے مانند

کیوں نہ ہو ہم سے وہ بجن باغی　　جس کا قد نونہال کے مانند
گل رخاں کی گلی میں اے بیتاب　　خاک پا ہے گلال کے مانند

(۴) بیتاب

نمیدانم کہ بود ایں قدر دانم کہ شاگرد محمد قایم است متقطعش کہ از زبان ایشان شنیدہ بودم بیاد ماندہ۔

بے تاب بھی کیا جواں تمہارے واسطے　　ہو خانہ خراب اس اجل کا

(۵) بیجان

کہ عزیز خاں نام دارد قوم افغان یعنی روہیلہ بفقیر دریامیکہ در آنولہ بود بموی الیہ اتفاق ملاقات اکثر می افتاد۔ حالا معلوم نیست کہ کجاست۔ از وست۔

ایسے نادان ہیں ہم تم کو نہ پہچانیں گے　　ہم سخن غیر سے ہوتے ہو جو آواز بدل
پیچ دیتا ہے تجھے کہہ کے برادر یہ رقیب　　اس سے دستار نہ اے خانہ برانداز بدل

نہ بوئے مشک ہو ایسی نہ نافۂ تاتار　　جو لپٹیں آتی ہیں گلرو ترے پسینے میں

(۶) بیباک

کہ میر نجف علی نام دارد سید موسوی از اولاد حضرت موسیٰ کاظم۔ اصل نسل نش عربی است۔ از چند پشت در سرکار کوئل مقام داشتند اگرچہ مولدش نیز کوئل است اما نہ سالہ در شاہجہاں آباد آمدہ بسن تمیز در ہمیں جا رسیدہ قدرے تحصیل صرف و فارسی نمودہ بود کہ طبعش بطرف طبابت مائل شدہ۔ الغرض در بست و دو سالگی مثل اطبائے

دیگر علاج میکند چون موزون طبع افتادہ گاہ گاہے سرے بفکر شعر نیز دارد و ہرچہ گفتہ می گوید از نظر فقیر گزرانیدہ و می گزراند این چند شعر ازوست ۔

ہم کو لیل و نہار نے مارا — گردش روزگار نے مارا
ایک تو آگے ہی تھے سودائی — تس پہ جوشش بہار نے مارا
صبر کس طرح کیجئے بیباک — اس دل بے قرار نے مارا

جب ہمارا وہ شوخ یار ہوا — دل وحشی کو تب قرار ہوا
داد خواہوں سے بھر گئے رستے — اس کا جس کوچہ سے گزار ہوا

بیباک کیونکہ پہنچیں گے منزل کو دیکھئے — اپنی کھلی تب آنکھ کہ جب کارواں گیا

صیاد یہ ہوس ہے دل داغدار میں — گلپوش کر قفس کو مرے نوبہار میں
ملتے ہیں دل کو مثل حنا پانوں کے تلے — یہ رسم ایک نئی ہے بتوں کے دیار میں
بیباک کوئی کھول کے دیکھے تو آبلے — آتش بھری ہوئی ہے ہمارے مزار میں

جو کوئی تجھ پہ مبتلا ہووے(۱) — پھر کسی کا نہ آشنا ہووے(۱)

ہمیں تیری ہی ہر دم جستجو ہے — کہ اپنا مطلب و مقصود تو ہے
اگر منظور ہے تم کو مرا قتل — تو فدوی بھی تمہارا روبرو ہے
گراب کے اٹھ گیا ہاتھ اپنا ناصح — گریباں اور دامن سب رفو ہے

(۱) ہوگا (ن ر)

کہ خون ایک جہاں کا او رہی جہان بدلا ۔۔۔ یہ رنگ تو نے کیسا اے آسمان بدلا
مجلس میں اسکی ہم نے تہمت کے ڈر کے مارے ۔۔۔ سو سو جگہ سے اٹھ اٹھ اپنا مکان بدلا

(۷) بقا

کہ بقاء اللہ نام دارد پدرش حافظ لطف اللہ خوشنویس از اکبر آباد آمدہ بود خودش درلکھنؤ نشو و نما یافتہ پیشتر غمین تخلص میکرد و شعر فارسی می گفت و از نظر مرزا فاخر مکین می گزرانید آخر آخر شوق شعر ہندی دامن دلش را فرا گرفتہ، درایامے کہ وارد شاہجہاں بود باشارۂ شاہ حاتم بقا تخلص گزاشتہ حالا نسبت شعر فارسی لسبوئی خود کمتر می کند و خود را یکے از ریختہ گویان می پندارد، شاہ مذکور مشارٌ الیہ را بہمین جہت درسلک اسامی شاگردانِ جدید خود نوشتہ وطرفہ اینکہ شیخ مذکور در تذکرۂ فتح علی خاں حسینی تخلص کہ بر بھوجلا پہاڑی قیام دارند لطوع و رغبت خود خود را شاگردِ میر درد نویسانیدہ۔ در غزل وغیرہ تلاش بسیار می کند اما در قصیدہ خیلے ید طولیٰ دارد ہرچہ می گوید بسیار بتلاش و علو می گوید اما در گفتن غزل بطی است۔ با فقیر در رابطۂ آشنائی بسیار مربوط است بلکہ اکثر در شاہجہاں آباد چندے یکجا بودیم و شام مجاشت باتفاق ہم می کردیم۔ غرضکہ جوانِ سراپا خلق و ظریف مزاج و قانع دیدمش طبع شوخش بطرف ہجو بسیار مائل افتادہ در شاہجہاں آباد با میر و در لکھنؤ با مرزا معرکہ گیر بپا کردہ و دقت طبع خود را اظہار نمودہ۔ حالا در لکھنؤ بکنج قناعت پا شکستہ اوقات بسری میکند با فقیر گاہ گاہے ملاقات می شود۔ از دست۔

رہ رواں کہتے ہیں جس کو جرس محمل ہے ۔۔۔ محنت راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے
موج سے بیش نہیں ہستی دہر کی نمود ۔۔۔ صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے
کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں ۔۔۔ جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے

آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی — یہ یقیں جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے
کھول دو عقدۂ کونین بقا کے پل میں — یا علی تم کو یہ آساں ہے اُسے مشکل ہے

ترے جو خال سیہ لب پہ آشکارا ہے — کسی کے بخت سیہ کا مگر ستارا ہے
چمن میں لالہ نہیں تجھ کو دیکھ کر قاتل — زمیں سے خون شہیداں نے جوش مارا ہے
بقا کی آہ نے اس میں کبھی نہ کی تاثیر — بتاں یہ دل ہے تمھارا کہ سنگ خارا ہے

تو نے اس طرح کا اے چرخ گرایا ہم کو — کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اٹھایا ہم کو

وہ صورتیں جو پیش نظر تھیں سو مثل اشک — یوں گم ہوئیں زمیں میں کہ ڈھونڈے نہ پائیاں

دست ناصح نہ[1] مری جیب کو اب ہاتھ لگا — پھاڑوں ایسا کہ پھر اس میں نہ رہے تار لگا
یار کو بھیجی خبر نالۂ تنہائی کی — مدعی کون کھڑا تھا پس دیوار لگا

شب گذری اب لے سحر کے نالو — پھر چرخ پہ برچھیاں سنبھالو
گر قتل کیا بقا کو خوباں — اس بات کو منہ سے مت نکالو
پنہاں ہی بھلا ہے خون عاشق — جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

اس بزم میں پوچھو نہ کوئی مجھ سے کہ کیا ہوں — جو شیشہ گرے سنگ پہ میں اس کی صدا ہوں
اے عشق تو ہر چند مرا دشمن جاں ہو — مرنے کا نہیں نام کو اپنی میں بقا ہوں

---

(۱) جو بجائے نہ۔ (ن خ)

رُخ اُس کا صفائی ترے تلووں کی نہ پاوے　　خورشید ہزار اپنے تئیں چرخ چڑھاوے

آئینہ دیکھ جو کہتا ہو کہ اللہ رے میں[1]　　اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا آوارہ رے میاں

(۸) برق

تخلص میاں شاہ جیو کہ بسبب موزونی طبع اول ہمیں غزل از خامۂ فکرش تراوید جوانِ ظریف مزاج و شوخ طبع و بلحشور با فقیر از قدیم الایام بسیار باعتقاد پیش می آمد و چوں تخلصش فقیر گذاشتہ لہذا دم از شاگردی ہم می زند ساز وست۔

یوں لاکھ ہوں دنیا میں تو کچھ کام نہیں ہے　　واللہ کہ تجھ بن مجھے آرام نہیں ہے
ہوئے دل پژمردہ مرا کیونکہ شگفتہ　　ہر باغ میں گل پر وہ گل اندام نہیں ہے
کیا دھوم سے اُمڈی ہے گھٹا ایسی ہوا میں　　افسوس کہ ساقی وے وجام نہیں ہے
اے برق نہ جی اپنا جلایا دمیں اُس کی　　کچھ خوب تو اس کام کا انجام نہیں ہے

حرف پ

(۱) پروانہ

پروانہ علی شاہ مرادآبادی کہ پروانہ تخلص میکرد جوان شوریدہ سر و قلندر وضع بود بنگ و شراب بشدت میزد و کسب و شغل نفی و اثبات وغیرہ نیز راہی داشت. گاہ گاہے از وکشف کہ اہل کمال را باشد مشاہدہ کردم بمعرفت محمد قایم در سرکار محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گزشت او ہم در سلسلۂ شعرا جا داشت و چیزے کہ موزوں میکرد از نظر ایشاں می گزرانید دو شعر از وست[2]۔

---

(۱) ن خ میں یہ شعر فاضل ہے۔ (۲) از و بنگا طراست۔ (ن خ)

آج ثابت نہ رہے دل نہ کوئی جان درست | اس کی مژگاں نے کئے پھر پرو پیکان درست
ہمتِ حضرت قایم سے اگر ہو امداد | چند ایام میں کر لیجئے دیوان درست

(۲) پروانہ

تخلص راجہ جسونت سنگھ عرف کاکاجی پسر راجہ بینی بہادر کہ رکن رکین نواب شجاع الدولہ مرحوم بود جوانِ خلیق و ذی شعور است۔ پیش ازیں شعر فارسی می گفت واز نظر رائے سرب سنگھ دیوانہ میگذرانید۔ چنانچہ اشعار فارسی اش پیش فقیر در شاہجہان آباد بوساطت مرزا قتیل رسیدہ بودند در ہماں ایام داخل تذکرۂ اول شدند اما در روزہائے کہ مؤلف از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ رسید چوں غائبانہ ہمیشہ مشتاقِ ملاقات می ماند، خبر آمدنِ ایں خاکسار شنیدہ بسیار بہ گرمی و تپاک پیش آمدہ واز ہماں ایام عطفِ عنانِ فکرِ شعر فارسی بطرف ریختہ کردہ خود را شب و روز در گفتن شعر ہندی معروف داشت تا الی الیوم کہ عرصۂ دوازدہ سال شدہ باشد مشق او بسیار رسا و پختہ گردیدہ۔ در گفتن قصیدہ و غزل طور مرزا رفیع را مسلم میدارد و اکثر بر صیدِ معانیہائے تازہ ہمت می گمارد پیش از آمدنِ فقیر کہ ہنوز آغازِ شوق او بود اعتقاد بہم رسانیدہ مثل میر تقی و میر حسن و میاں بقاء اللہ وغیرہ داشت۔ اکنون از تہہ دل بفقیر رجوع کلی دارد و درستی اشعار درستش موقوف بر مشورہ ایں ہیچدان باعتقاد او افتادہ۔ انیہم خوبی اوست والا شاعریش از ہیچ صاحب طبیعتے در مرتبہ کمی نیست از وست۔

کھا تیغ نگہ جب ترے گھایل کو غش آیا | گویا وہ دمِ نزع میں بسمل کو غش آیا
کیا کہیے ہمدم کہ اُسے دیکھ کے ہم تو | ہر چند سنبھالے رہے پر دل کو غش آیا
کرتے تو کیا قتل[1] پہ خون بہتے جو دیکھا | ٹھیرا نہ گیا سامنے قاتل کو غش آیا

---

(۱) ن خ میں یہ شعر نہیں ہے۔

ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی غمخواری کر کر — بیوفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کر کر

کب نزاکت گل کی سرگوشی کی رخصت دے ہے — جھوک جب بالی کی کانوں پر گرانباری کر کر

دیکھتے ہی اُس کو چہرے پر بحالی آ گئی — زعفرانی رنگ جو تھا اس میں لالی آ گئی

بشیرؔ

تخلص میر بشارت علی از شاہجہان آباد در لکھنؤ آمدہ بود(۱) شاگرد میر نظام الدین ممنونؔ گردیدہ۔ از وست۔

یارب نہ کھلے زُلف گرہ گیر کسی کی — وابستہ ہے وہاں خاطرِ دلگیر کسی کی

شاید دلِ بے تاب کو تسکین ہو اپنے — کھنچوا کے رکھوں سینہ پہ تصویر کسی کی

دیوانہ بشیرؔ آیا ہے اِدھر(۲) کہیں شاید — پھر کھڑکے ہے اُس کوچہ میں زنجیر کسی کی

حرف التا

(۱) تاباںؔ

میر عبدالحی(۳) تاباںؔ کہ(۴) قصبہ حسن یوسفیش(۵) در چار سوئے مصر دہلی شہرت تام دارد جوانے بود شیریں شمائل نہال قامت رعنائش در باغ لطافت از شیرۂ جانہا پرورش یافتہ و لُعبتی بود جو ساز او کہ لُعبت باز پردۂ نیلگون آسمان دست صبر چندیں عاشق بیتاب را بیک کرشمۂ دلفریبش بر تافتہ۔ طبع موزونش حسن و عشق را یکجا ساختہ و شیرینی گفتارش نمک بر زخم جگر ملیحان ہند انداختہ اگرچہ زبانی شاہ حاتم در ابتدا شاگرد شاہ حاتم است اما آنچہ شہرت دارد و واقعی است اینست کہ بہ شاگردئی محمد علی حشمت

---

(۱) شاگرد میر نظام الدین ممنونؔ از شاہجہان آباد وارد لکھنؤ شدہ بود (ن خ) (۲) اس شہر میں (ن خ) (۳) تاباںؔ تخلص میر عبدالحی نام داشت (ن خ) (۴) کہ تدارد (ن خ) (۵) حسن یوسفش (ن خ)

که[1] شاگرد محمد غنی بیگ قبول کشمیری است بسیار بسر برده و حشمت تخلص محتشم علی خاں برادر میر ولایت اللہ ولد میر باقی نیز بود۔ چوں ایں ہر دو بزرگ نسبت شعر ہندی میلان طبع بشعر فارسی بیشتر داشتند لہذا احوال ایں صاحبان در تذکرۂ فارسی تسوید یافتہ غرض ازیں جملۂ معترضہ تصریح احوال ہر یکے بنابر رفع اشتباہ سانح بود۔ آمدم بر مطلب کہ اگرچہ فقیر آن یوسف ثانی را بسبب نبودن در آں دورہ کہ در عین جوانی کہ گرگ اجلش در ربود ندید اما تصویر آں آفت جاں[2] در چاندنی چوک بر دوکان پارچہ فروشے کہ مرقع تصاویر گوناگوں[3] داشت بملاحظہ رسیدہ والحق کہ از دیدن آں معنی عین الیقین بمشاہدہ افتادہ ہر کہ ہر چہ در وصف حسن و جمال خوبی اعضائے آں دلفریب عالم گوید بجا است دیوان بختہ اش مشہور است۔ از وست۔

مری لوح تربت پہ یارو کھدانا — کہ اس سنگدل سے نہ کوئی دل لگانا

زبس تیری مژگاں سے ہے مجکو الفت — جہاں دیکھنا خار وہاں لوٹ جانا

رہتا ہے خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہوا — مرے غریب دل کو الٰہی یہ کیا ہوا

میں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح — یا رب کبھی خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہوا

تو دیکھ مجھ کو نزع میں مت کڑھ کہ تیرے یار — مجھ سے بہت ہیں ایک نہ ہوگا تو کیا ہوا

ہر دم کروں نہ کیونکے گریباں کو اپنے چاک — آتا ہے یاد یار کا جامہ چسا ہوا

تاباں کے دیکھنے سے برا مانتے تھے تم — کھو دی بہار خط نے تمہاری بھلا ہوا

جفا سے اپنی پشیمان نہ ہو ہوا سو ہوا — تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

سبب جو میری شہادت کا یار سے پوچھا — کہا کہ اب تو اسے گاڑ دو ہوا سو ہوا

نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم — وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

---

(۱) کہ شاگرد ایسہ شاگرد محمد غنی الخ (ن خ) (۲) آفت جاں در عقدہ (ن خ) (۳) گوناگوں ہیچ خود داشت (ن خ)

سر پر مرے سایہ کیا گر نے ہما تو کیا ہوا — یا کھائی میری استخواں بعد از فنا تو کیا ہوا
دنیا کے نیک اور بد سے کچھ تاباں نہیں ہے غم مجھے — گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور وُوں ہوا تو کیا ہوا

غیر کے ساتھ جو دیکھا ہے اُسے بال کھلے — اس سبب دل ہے بہت آج پریشاں میرا

تعلق سے جہاں کے جو کوئی آزاد ہو بیٹھا — وہ آبِ زندگی سو اپنی بیشک ہاتھ دھو بیٹھا
گلی میں اپنی روتا دیکھ مجھ کو وہ لگا کہنے — کہ کچھ حاصل نہیں ہونے کا ساری عمر رو بیٹھا

ایسا ہی مرے اشک کا گر جوش رہے گا — تو شمع صفت جسم بھی پانی ہو بہے گا
جز ترکِ محبت کہ میں لاچار ہوں اس میں — مانوں گا میں ناصح جو تو سب مجھ سے کہے گا
میں خواب میں دیکھا ہے لگاتے اُسے مہندی — کیا جانئے کس کس کا لہو آج بہے گا

آئی بہار شورشِ طفلاں کو کیا ہوا — اہلِ جنوں کدھر گئے یاراں کو کیا ہوا
غنچے لہو میں تر نظر آتے ہیں تہہ بہ تہہ — اُس رشکِ گل کو دیکھ گلستاں کو کیا ہوا
اُس جامہ زیب غنچہ دہن کو چمن میں دیکھ — حیراں ہوں میں کہ گل کے گریباں کو کیا ہوا
آنے سے تیرے خط کے یہ کیوں ہے گرفتہ دل — بتلا کہ تیری زلفِ پریشاں کو کیا ہوا
روتے ہی تیرے غم میں گذر گئی ہے اُس کی عمر — پوچھا کبھی نہ تو نے کہ تاباں کو کیا ہوا

ہمیشہ رات گھر غیروں کے رہنا — پھر آ کے صبح کے تئیں ہم سے کہنا
عجب احوال ہے تاباں کا تیرے — کہ رونا رات دن اور کچھ نہ کہنا

تجلی (۲)

عرف میاں حاجی ولد میر محمد حسین کلیم جوانے است در فن ریختہ بے نظیر و ہمشیرہ زادہ میر محمد تقی میر۔ دیوان ضخیم ترتیب دادہ و مثنوی لیلیٰ مجنوں را نیز بنائی خوبی نہادہ اکثر مخمس و مسدس خوب خوب و غزلہائے بحر کامل از و بر زبان شائقان زمان ورتہاجہان آباد جاری است۔ عمرش قریب بہ چہل خواہد بود روزگار در فرقۂ سپاہ گری با تیاز تمام کردہ می کند۔ با فقیر بسیار آشنائی داشت حق تعالیٰ سلامت دارد ایں چند شعر کہ مشتی نمونہ از خروار ی در ینجا یاد باید کرد۔ از وست۔

کئی دن ہیں روٹھ گئے ہیں وہ نہ پیام ہے نہ سلام ہے
جو یہی طرح رہی ہمنشیں تو ہمارا کام تمام ہے
کبھی پاس بھی جو بلاتے ہو تو ہزار ضد باتیں سناتے ہو
مرے صاحب اتنا تو جانیے کوئی کیا تمھارا غلام ہے

طرب کا رنگ رخ گل پہ آشکار آیا
کلی سے کھل گئے جو نہیں وہ گلعذار آیا
تڑپ کے جان نکل جائے گی ابھی صیاد
نکہیو باغ میں پھر موسم بہار آیا
ملا میں خاک میں مر کے آہ پر تو بھی
نہ بے قراری دل کے تئیں قرار آیا
مری وفا پہ تجھے روز[1] شک تھا اے ظالم
یہ سر یہ تیغ ہے لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھولدیں آنکھیں سنا جو یار آیا

جب رات تھی دراز ملاقات کم ہوئی
ملنے کے دن جو آئے تو اب رات کم ہوئی

عشق میں کرتے ہیں بدنام تجلی کو عبث
وہ بچارا کبھی اس کوچہ میں آیا نہ گیا

---

(۱) زور بجائے روز۔ (ن خ)

یہ تارِ دم ہر صورت باز کار شتہ کہ ہر صورت   چلے جاتے ہیں پردے میں لئے ناچار جب کھینچا

(۳) تنہا

کہ محمد عیسیٰ نام دارد وطن بزرگانش شاہجہاں آباد و خودش در لکھنؤ تولد یافتہ عمرش قریب بست و ہفت رسیدہ۔ جوان صلاحیت شعار و خوش اطوار از ابتدائے عمر بہ سبب موزونی طبع چیزے موزوں میکرد حالا ریختہ[1] گفتہ و می گوید و از نظر فقیر می گذراند خیالش بسیار رساست۔ شوق مرثیہ خوانے و گفتن سلام ہم دارد و روزگار در فرقہ سپاہ گری بسر می نماید[2] من کلامہ[3].

غیر سے شکوہ مرا بس دیکھی دانائی تیری   میں ہوا رسوا تو کیا ہو گی نہ رسوائی تیری
اب پشیماں ہوں کہ یہ کیا بات مجھ سے ہو گئی   روبرو غیروں کے کیوں میں نے قسم کھائی تیری

حیران تھا کل وہ آئینہ یکبار دیکھ کر   کچھ میں بھی رہ گیا اُسے لاچار دیکھ کر
میں وہ اسیر سیر چمن ہوں شکستہ بال   روتے ہیں جس کو مرغ گرفتار دیکھ کر
دل ہے وہ جنس بد جسے بازارِ دہر میں   مونھ پھیر لیوے اپنا خریدار دیکھ کر
بلبل کو لیکے نکلا تھا صیاد کل کہیں   شاید کہ خوش ہو یہ گل و گلزار دیکھ کر
گلشن تلک پہنچنے نہ پایا کہ مر گئے   چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھ کر
تلوار پر نہ ہاتھ رکھو جان مر گیا   تنہا تمہاری ابروئے خمدار دیکھ کر

آئے تو وے آن کے اِک آن نہ ٹھیرے   میں کتنا کہا وہ کسی عنوان نہ ٹھیرے
مجلس سے دیا تو نے اٹھا اپنی جو مجکو   شاید تری نظروں میں ہم انسان نہ ٹھیرے
آغاز ہی میں ہو گئی وحشت مجھے تنہا   اس فصل میں شاید کہ گریبان نہ ٹھیرے

---

(۱) انچہ (ن خ) (۲) می کند بجائے می نماید (ن خ) (۳) از دست بجائے من کلامہ۔ (ن خ)

ہو کر جدا وہ سب سے جب ہم سے آملے گا
البتہ اپنے دل کو تب کچھ مزا ملے گا

بلبل کے توڑتا ہے کیوں بال و پر دوانے
ان کاوشوں سے تجھ کو صیاد کیا ملے گا

گو قافلے سے یارو تنہا رہا ہے پیچھے
دن تو ابھی بہت ہیں کیا ڈر ہے جا ملے گا

مذکور سے چلا تھا شب ہمنشیں کسی کا
جی میں خیال گزرا میرے وہیں کسی کا

سینہ پہ ایک پرزا اب جیب کا نہیں ہے
دیکھا تھا ہاتھ میں نے بے آستیں کسی کا

تنہا رکھیں توقع کس بات کی کسی سے
ہاں سچ تو یہ ہے بھائی کوئی نہیں کسی کا

کرتا ہے ستم ہم پہ تو آسان سمجھ کر
ہم کچھ نہیں کہتے تجھے نادان سمجھ کر

مر جائیں نہ زندانی ترے اتنے خوشی سے
ٹک کھولیو ظالم در زندان سمجھ کر

معمورۂ دنیا میں یہ کثرت ہے کہ اللہ
آئے تھے اسے ہم تو بیابان سمجھ کر

کیوں ترک کیا اس کی ملاقات کو تنہا
کرتا ہے جو کچھ بات تو انسان سمجھ کر

یہ تو فرمائیے ہم آپ کا کیا لیتے ہیں
آپ بے وجہ جو منہ ہم سے چھپا لیتے ہیں

دل بھی کیا جنس زبوں ہے کہ خریدار آکے
لیتے ہیں پر اسے سو جا پہ دکھا لیتے ہیں

تھم کے بے وجہ تڑپتے نہیں بسمل تیرے
آب خنجر کا یہ رہ رہ کے مزا لیتے ہیں

خاک میں دل کو ملا کہتے ہیں قیمت کیا دوں
چیز اگر لیتے ہیں تو پہلے چکا لیتے ہیں

اک آدھ کا ڈر ہم کو نہ دو چار کا خطرا
ہے بھی تو تری خوئے ستمگار کا خطرہ

کوئی گل لے گلشن سے جو دامان میں آیا
دل ہو کے لہو دیدۂ گریان میں آیا

کیا کہیئے اے یارو کہ اس دست جنوں سے — یہ نقص پڑا اپنے گریبان میں آیا
زندانیوں میں آج ہے اک حشر سا برپا — شاید نیا قیدی کوئی زندان میں آیا
کیا تو نے کیا زہر کو کیوں کھا لیا تہتا — کیا بیٹھے بٹھائے یہ ترے دھیان میں آیا

رویا جو میں اک شب بت نادان کے آگے — وہ صبح لگا کہنے ہر انسان کے آگے
اے دست جنوں چاہیے تو کر اس کے بھی پرزے — اب باقی ہی دامن ہے گریبان کے آگے
بجلی کی چمک شعلۂ جوالہ کا عالم — ہے گرد تری جنبش داماں کے آگے
زنداں سے ہمیں عید کو اس نے جو نکالا — ہم گر پڑے غش کر در زنداں کے آگے
کچھ شعر پہ موقوف نہیں سنتے ہو تہتا — گر بات بھی کہیے تو لب انسان کے آگے

عجب طرح کی بہاراں دنوں کسی پر ہے — نہ حور پر وہ لطافت ہے نا پری پر ہے
کہا جو میں نے کہ ہم پاس اب نہیں آتے — تو بولا وہ کہ یہ موقوف اپنے جی پر ہے
چمن میں آکے جماہی یہ کس نے لی ہے نسیم — شگفتگی سی جو ہر گل کی یہاں کلی پر ہے
ادھر کو پھیر کے منہ پھیر بھی ذرا ہنس(۱) لو — کہ جان اپنی غش اس آپ کی ہنسی پر ہے
نہ غافل اب ہو بارشاد مصحفی تہتا — بہوش باش کہ عالم روا روی پر ہے

ہم سے کرتے ہو بیاں غیروں کی یاری آن کر — رہ گئی ہے آپ کی یہ دوستداری آن کر
ہم کو آنے سے تمہاری بزم کے کیا تھا حصول — دیکھ لیتے تھے مگر صورت تمہاری آن کر
رو اٹھے پر میرے کیا لازم تھا ہو جانا خفا — بلکہ کرنی تھی تسلی خاطر ہماری آن کر
طعن بدخواہاں سے تو اکدم نہ پاوے گا قرار — کی جو تیرے در پہ ہم نے بے قراری آن کر
تھا اگرچہ عشق میں مجنوں ولیکن آنکھیں کھل گئیں — سر پہ اس کے جس گھڑی لیلیٰ پکاری آن کر

---

(۱) ہنسیو — (ن خ) (۲) کرتے تھے (ن خ)۔

جس جگہ کشتہ کا تیرے لاشہ تھا خوں میں پڑا — خوب سا رویا وہاں ابر بہاری آن کر
میں بھی کیا برگشتہ طالع ہوں کہ تنہا رات کو — پھر گئی در تک مرے اس کی سواری آن کر

(۴) تصوّر

سید احسان[1] حسین ولد سید حیدر حسین خاں از سادات زیدیہ متوطن قصبہ نکوڑ[2] جوانِ صلاحیت شعار و خوش ظاہر است۔ مشورہ شعر از میاں قلندر بخش جرأت کردہ و میکند و سلسلہ نسبش بحضرت امام زین العابدینؓ منتہی می شود۔ عمرش بست و پنج سالہ خواہد بود۔ از وست ۔

صدمۂ غم متصل جب تیرے بایل پر رہے — ہاتھ اس مضطر کا ہر دم کیوں نہ پھر دل پر رہے

مرقدسے میرے ہاتھ قدمبوسی کو نکلیں — گر بعد فنا بھی وہ مرے خاک پر آوے
رونا کہیں موقوف کریں ہیں مری آنکھیں — جب تک نہ تسلی کو دل آوے جگر آوے
لگ جائے تصور کے گلے آکے وہ بت آج — اللہ کرے اُس کی یہ امید بر آوے

مجھے بے تاب آتا دیکھ کر کوچہ میں یہ بولا — بھلا کیوں دوڑ دوڑ آتا ہے یہ کیا اس کی شامت ہے
تصوّر گرمجوشی یار کی مجھ کو رُلائے گی — بہت گرمی کا ہونا مینہ برسنے کی علامت ہے

میرے دل کو کرو تم شاد یوں تمہیں چاہئے — اور مجھ پر اس قدر بیداد یوں نہیں چاہئے
ذکر شکوہ سے بھی میرا تم کبھی کرتے نہیں — واہ کیا دل سے بھلائی یاد یوں نہیں چاہئے

ہجر و وصال یار سے اپنا یہ ملک دل — ویراں ہوا کبھی کبھی آباد ہو گیا

---

(۱) سید احسان حسین نام دارد ولد حیدر حسین خاں۔ (۲) نیکو ربہ رائے فارسی۔ (ن م)

ناصح تو کسی بت سے تو جا آنکھ لڑا دیکھ | سُن میری نصیحت یہ ٹک اس کا بھی مزا دیکھ
کیا اُس کے تصوّر میں تری بن گئی صورت | لے آئینہ شکل اپنی تصوّر تو ذرا دیکھ

لے گئے یوں ترے کوچہ سے تصوّر کو لوگ | جوں اٹھا دیں کسی بدمست کو میخانے سے

یہ کہتے ہیں طبیب آ کر سر بیمار پر تیرے | ہمیں آتا ہے رونا اب تو جانِ زار پر تیرے

گو وہ گیا پر اپنی آنکھوں کے سامنے سے | جاتا ہی کوئی اُس کی رفتار کا تصوّر

خفا تعظیم کی خاطر نہ ہووے دوستاں ہرگز | کہ بستر پر سے ہل سکتا نہیں یہ ناتواں ہرگز
تصوّر مر گیا گھٹ گھٹ کے ظالم عشق میں تیرے | ہوا ظاہر نہ اس کا آہ کچھ دردِ نہاں ہرگز

(۵) تسکین

میر سعادت علی جوان شائستہ وصلاحیت شعار است۔ دم از شاگردی میر قمرالدین منت میزند۔ از وست۔

حالِ دل کہئے تو ہم سے وہ صنم رُکتا ہی | اور چپ رہئے تو مشکل ہی کہ دم رُکتا ہی
کس کا کوچہ ہی یہ یارب نہیں معلوم ہمیں | خود بخود یاں کے پہنچتے ہی قدم رُکتا ہی

(۶) تسلی

تخلص لالہ ٹیکا رام پسر گوپال رائے بخشی برادر خورد لالہ بھولا ناتھ کہ خدمت دیوانی کچہری بخشی گری فوج نواب وزیر تعلق باینشاں دارد۔ جوانے است مہذب الاخلاق

خصوصاً بہ اہل کمال ہر فن بہ تواضع و تعظیم پیش می آید وطن بزرگانش موضع کرل قریب بہ آناؤ و خودش در لکھنؤ نشو و نما[1] یافتہ. چوں از ابتدائی عمر ذوق موزونی شعر دلنشین خاطرش بود حالا کہ بفضل الٰہی سن عمرش از بست و پنج متجاوز خواہد بود شعر ہندی و فارسی بہ سلیقہ تمام می گوید اما در بند شہرت نیست. اکثر مثنویہا و دواوین اساتذہ جمع ساختہ[2] و انتخاب زدہ[3] زیبا ئیدہ چنانچہ فقیر ہم یک دیوان فارسی و دو دیوان ہندی خود مع تذکرۂ فارسی حسب الاشارہ نوشتہ دادہ و دیوان اول فقیر را در عالم[3] کمتب نشینی کہ فقیر در آں روزہا نو وارد ایں شہر بود از کمال اشتیاق آدم فرستادہ طلبیدہ بدست خود در عرصہ قلیل نقل گرفتہ. اگرچہ ذہانتِ طبعش چنداں محتاج مشورہ نیست. اما احتیاطاً اشعار فارسی را از نظر مرزا محمد فاخر مکین می گزرانند و دہ پانزدہ غزل ہندی کہ گفتہ. مشاطگی آں موقوف بر رائے فقیر داشتہ. غرض کہ با ہمہ خوبیہا کہ دارد اخلاق ایشاں بر زبان کہہ و مہ جاری است چنانچہ فقیر ہم در آں جملہ مرہون حسن[4] سلوک ایں بلند اقبال است. حق تعالی ہمیشہ بر مسند ایالت ذاتِ شریفش را متمکن داشتہ. در سایۂ حفظ خود نگاہ دارد. از وست.

دیکھے سماں جو اس مژۂ اشکبار کا — ہو جائے شق جگر رگِ ابر بہار کا
جس کے قدم تلے دلِ خوباں ہیں لگے گو — مذکور کیا ہے اپنے دل خاکسار کا
فہمید والے کرتے ہیں دولت پہ کب گھمنڈ — کیا اعتماد زندگی مستعار کا
آنکھیں سحر تلک مری در سے لگی رہیں — کیا پوچھتے ہو حال شبِ انتظار کا

اب بھی اس نیم جاں میں کچھ ہے — فائدہ امتحان میں کچھ ہے
کیوں ستاتا ہے دیکھ تو پیارے — اس دل ناتواں میں کچھ ہے

جو چاہے سلطنت اُسے ظلِ ہما ملے — مجھکو یہی ہوس ہے کہ وہ مجھ سے آملے

---

(۱) تولد و نشو و نما در نخ، (۲) ساختہ در نخ، (۳) ایام در نخ، (۴) حسن نیست در نخ

دیتے اگر نہیں ہو تسلی کو تم کچھ اور — بوسہ ہی ایک شعر کا اس کے صلا دے

تجھ سا جو بے وفا ہوا ہوگا — اس کا عاشق نہ کوئی جیا ہوگا
کیوں تسلی سے اب نہیں ملتے — غیر نے کچھ سکھا دیا ہوگا

گزر چمن میں اگر وقت صبح تو نہ کرے — نسیم پاس نہ جا گل کے اس کو بو نہ کرے
کوئی بشر نہ زمانے میں ہووے گا ایسا — کہ جس کے دل میں جگہ تیری آرزو نہ کرے
کوئی اڑانے سے باز آئے ہے صبا اس کے — ہماری خاک کو جبتک کہ کو بکو نہ کرے
جہاں میں اور تسلی کا کون پوچھے حال — جو اس کے حال پہ اے یار رحم تو نہ کرے

تو نہ میری ہی جان ہے کافر — تجھ پہ شیدا جہان ہے کافر
بھاگتا ہے مرے تصور سے — کس قدر بدگمان ہے کافر
دن پھرے پھر مگر تسلی کے — ان دنوں مہربان ہے کافر

کیا پوچھتے ہو حال تم اس غم نصیب کا — میں تو یہی کہوں گا برا ہو رقیب کا

کب میں نے کہا پیارے تم مجھ سے جدا بیٹھو — پہلو سے مرے تکیہ پہلو کا لگا بیٹھو
آتے ہی کہا تم نے بس گھر کو میں جاؤں گا(۱) — آخر کو تو جاؤ گے اک دم تو بھلا بیٹھو
کیا جانے تمھیں کس نے یہ بات سکھائی ہے — جب پاس مرے آؤ تب منہ کو بنا بیٹھو
مانگا جو تسلی نے اک بوسہ تو دو پیارے — منہ پھیر کے ظالم نے یوں ہنس کے کہا بیٹھو

---

(۱) جاتا ہوں۔ (ن خ)

جب ہمیں دکھلا کے بیٹھا گالی کیا خوب ‏ ‏ ‏ بارے اب آپ نے یہ وضع نکالی کیا خوب

بھلا اور تو مجھ کو دو چار کہہ جا ‏ ‏ ‏ بُرا میں نہ مانوں گا کہہ یار کہہ جا
خفا کیوں ہوا بیوفا کہنے سے تو ‏ ‏ ‏ جفا کار تو ہم کو سو بار کہہ جا
دھڑکتا ہے جی کیونکہ میں تجکو چھوڑوں ‏ ‏ ‏ پھر آوے گا سچ مجھ سے عیار کہہ جا
کیا ترک ملنا مرا کس سبب سے ‏ ‏ ‏ وہ بات آکے مجھ سے تو اکبار کہہ جا
تسلی سے کب ایسی باتیں تو کہتا(۱) ‏ ‏ ‏ کسی کے سکھانے سے دلدار کہہ جا

دکھاتا ہے مہ حسن کا اپنے جلوہ ‏ ‏ ‏ اگر تم بھی آؤ لب بام کیا ہو
ترے لب سے غنچہ کرے ہمسری کیا ‏ ‏ ‏ ترے آگے گل نازک اندام کیا ہو
تسلی عجب بیوفا کو دیا دل ‏ ‏ ‏ اس آغاز کا دیکھیں انجام کیا ہو

عالم اُس بت پہ مبتلا ہی رہا ‏ ‏ ‏ اُن میں فدوی بھی اک فدا ہی رہا
اٹھ گئی دوستی زمانہ سے ‏ ‏ ‏ آشنائی نہ آشنا ہی رہا
نہ سنی تو نے ایک بات کبھو ‏ ‏ ‏ ہم کو اس بات کا گلا ہی رہا
تم خفا ہی رہے تسلی سے ‏ ‏ ‏ اور وہ تم پہ نت فدا ہی رہا

میاں جو کچھ تری سج دھج میں نرالی نکلتی ہے ‏ ‏ ‏ کہاں مرزا مزاجوں میں وہ رعنائی نکلتی ہے
ادا و ناز جو تجھ میں ہیں اوروں میں کہاں پیارے ‏ ‏ ‏ کہ تیری وضع میں کچھ اور زیبائی نکلتی ہے
صبا مذکور جب کچھ سے چلی ہے تیری زلفوں کا ‏ ‏ ‏ چمن سے بوئے سنبل ہو کے سودائی نکلتی ہے
خدا سے ڈر برابر کر نہ اوروں کے تسلی کو ‏ ‏ ‏ کہ تیرے عاشقوں میں اس میں یکتائی نکلتی ہے

---

(۱) کہتا ؟ (ن خ)

تجھ پہ آفت یہ نئی پھر دل زار آئی ہے — لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے[1]
خوں ٹپکتا ہے تری تیغ نگہ سے ظالم — کسی مظلوم کو شاید کہ یہ مار آئی ہے
دیکھیے حال تسلی کا ہو کیا اب کے سال — لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

کیا منہ جو کوئی آوے ترے تیر کے منہ پر — یہ ہم تھے کہ منہ رکھ دیا شمشیر کے منہ پر
گو دل میں خفا ہو تو یہ اس بات کو ناداں — کہہ مت تو مت عاشق دلگیر کے منہ پر
میرا ہی جگر ہے یہ کہ میں سینہ سپر ہوں — رستم تو جڑے اس بت بے پیر کے منہ پر
جب سے تری تصویر لکھی کلک قضا نے — وہ حسن نہ دیکھا کسی تصویر کے منہ پر
جانے دے تسلی تو نہ کر فکر سخن کا — پھبتا ہے سخن مصحفی و میر[2] کے منہ پر

حرف الثا

---

(۱) ثنا

میر شمس الدین ثنا تخلص۔ بزرگانش اہل خطہ بودند و خودش در عظیم آباد متولد شدہ۔ شاگرد شاہ مشتاق طلب بود۔ کم کم فکر شعر کردہ۔ از وست

شب فرقت میں تیری نالہ و زاری ہے اور میں ہوں — جھپکتی ایک پل نہیں آنکھ بیداری ہے اور میں ہوں
چمن ہے خندۂ گل ہے رے مینا ہے اور تو ہے — فغاں ہے نالہ ہے فریاد ہے زاری ہے اور میں ہوں

(۲) ثاقب

میاں شہاب الدین درویشے بود از سابقین۔ گویند کہ شعر خود را بہ میاں شاہ مبارک

---

(۱) مجلس (دن خ) (۲) مصحفی پیر (دن خ)

آبرو می نمود و نیز بجان آرزو مشورہ داشت "یک شعر از و بہم رسیدہ اینست"(۱)
ثاقب کی نعش او پہ قاتل نے آکے پوچھا   یہ کون مرگیا ہے کس کا ہے یہ جنازا(۲)

حرف الجیم

(۱) جوشش

محمد عابد جوشش تخلص پسر جسونت ناگر، گویند جوانِ قابل است و در عظیم آباد بسر می برد. فقیر او را ندیدہ دو شعر از و بہم رسیدہ این است۔
تمھارے در پہ جو دربان نے آستیں پکڑی   برنگ نقشِ قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ   رہتا ہے مدام آب دیدہ

(۲) جوشش

تخلص رحیم اللہ جوانے است ورزش گیر۔ در ابتدا بہ شاہجہاں آباد در مجمع و ہنگامہ ہا ریختہ بازی میکرد۔ چوں طبعش موزوں بود و از کلامِ اساتذہ دفترہا یاد داشت آخر آخر خود ہم چیزے موزوں کردن شروع نمودہ رجوع برائے اصلاح آں بفقیر آوردہ و چند سال کامل خود را دریں شغل مصروف داشت حالا در گفتن شعر قوت تمام پیدا کردہ۔ غزل درست بستہ بسر انجام میرساند۔ بالفعل یک شعر از و بخاطر است طرحیٔ مشاعرہ فقیر در شاہجہاں آباد۔
دریا مری آنکھوں سے نت جاری لہو کا ہے   بیدرد تو کیا جانے کیا رنگ کسو کا ہے

---

(۱) یک شعر الخ نہیں ہے اس کی جگہ صرف "از دست ہے" ان خ (۲) جنازہ (ان خ)

(۳) جہاندار

تخلص شاہزادۂ ولیعہد خورشید رکاب صاحب عالم خطاب کہ از بس علو ہمت و سمو منزلت مرتبۂ عالیجائی خود را باوجِ افلاک رسانیدہ و دست دُر بارش ہنگامۂ ابر نیساں را سرد ساختہ۔ با وصف استغنائے مزاج کہ خاصۂ بادشاہان است خود را بکسب علم و ہنر نیز مصروف داشتہ و کمالاتِ بسیار در ذات بابرکاتش جمع آمدہ۔ معہذا بمقتضائے موزونی طبع گاہ گاہے شعر ہندی و فارسی نیز می فرماید، از وست۔

کون سی بات تری ہم سے اٹھائی نہ گئی | پر جفا جو یہ تری نت کی لڑائی نہ گئی
قصد ہر چند کیا سیکھنے کا بلبل نے | وضع نالہ کی مرے اُس سے اڑائی نہ گئی
دلِ سوزاں کی جہاندار ترے تا بفلک | کونسی آہ تھی جو مشل ہوائی نہ گئی

کہاں طالع جو پہنچیں اُس کے در تک | رہیں دور ہی سے ہم اس کو مگر تک
رسائی میرے نالہ اور دعا نے | کہاں پائی اجابت اور اثر تک
بجھاؤں شمع ساں کیا اب جہاندار | شرارِ عشق تو پہنچا جگر تک

میں تو سو بار ترے ملنے کو آیا تنہا | ایک افسوس کبھی تجھ کو نہ پایا تنہا
شرک سے خالی کسی کا نہ نظر آیا دل | وہ بڑے ظرف ہیں جن میں تو سمایا تنہا
کس کو دعویٰ نہیں الفت کا تری عالم میں | عاشقوں میں ترے میں ہی نہ کہایا تنہا
بلکہ کل میں ترے جی بھی ہمارا ہی اسیر | دام میں زلف کے دل ہی نہ پھنسایا تنہا
کل جہاندار ہم اور یار سے تھے ٹک مل بیٹھے | بخت ناساز نے پھر آج بٹھایا تنہا

وہ نوخطاں دنوں جو مشق جفا کرے ہے
صاف اپنا ہاتھ ہر دم مجھ پہ کیا کرے ہے

میں اور تیری نصیحت مانوں یہ دخل کیا ہے
ناصح تو مجھ کو ناحق اب کیوں خفا کرے ہے

بیمار عشق اب تک جانبر بھی کوئی ہوا ہے
تو لے طبیب ناحق میری دوا کرے ہے

پچھتائے گا تو اک دن سنتا ہے اے جہاندار
دیتا تو ہے دل اس کو لیکن برا کرے ہے

زلف آشفتہ[1] جو رخ پہ یہ صنم رکھتے ہیں
روز اور شب کو باعجاز بہم رکھتے ہیں

ٹھان لیتے ہیں وہ پہلے ہی سر اپنا دینا
تیرے کوچہ میں جو لے شوخ قدم رکھتے ہیں

بوالہوس تیغ جفا کا تیری رد کش کیا ہو
دعویٰ اب سینہ سپر کرنے کا ہم رکھتے ہیں

ہر دم زیست کے مانند ہیں ہر دم مے
ساقی ہم جب تئیں[2] دم اپنے میں دم رکھتے ہیں

نہ جہاندار سا پاؤ گے جہاں میں عاشق
حیف ایسے پہ روا آپ ستم رکھتے ہیں

ہم نہ کہتے تھے کہ دل خوباں کو دینا خوب نہیں
کیوں جہاندار اضطراب تو بھی تو پچھتانے لگا

کون میکش اے جہاندار آج گذرا باغ میں
ہاتھ میں ہر شاخ گل کے مے کا پیالہ دیکھنا

نرگس کے انتظار میں یہ بے اجل گیا
آنکھیں جو یوں کھلی رہیں اور دم نکل گیا

(۴) جرأت

تخلص یحیی مان است، قلندر بخش نام وار و یحیی مان نام آبائی اوست بدیں جہت کہ خود را از اولاد یحیے رائے مان می گوید و اشخصے گذشتہ کہ ہنوز در محلہ کہ متصل

---

(۱) آشفتہ (ن خ) (۲) تئیں (ن خ)

چاندنی چوک جائے بود و باش او بود، بکوچۂ رائے مان شہرت دارد۔ مشارٌ الیہ از انقلاب زمانہ مع عشایر در صغرسن بہ پورب رسیدہ دہم اینجا نشوونما یافتہ وجوان گردیدہ۔ از ابتدائے موزونی طبع مشق ریختہ پیش میاں جعفر علی حسرت کردہ کلام خود را بہ پایۂ پختگی رسانیدہ۔ چنانچہ الحال بقول جمہور از استاد خویش پائی کمی نمی آرد۔ و در شعر خود تلاشِ ماتیانہ بسیار می کند و پاس تمام از کلامش تراود و مزاجش بطرفِ مسلسل گوئی و غزل در غزل گفتن بیشتر مائل است۔ شاگردان بسیار بہم رسانیدہ و معہذا در علم نجوم ہندیاں وستار نوازی نیز مہارتے دارد۔ حیف کہ چشمش در عین جوانی بہ یک ناگاہ نابینا شدہ۔

از وست۔

ہم کچھ اسیر ہوتے ہی خاموش ہوگئے — سب چہچہے چمن کے فراموش ہوگئے

میری اور اس کے جو پوچھو ربط کیا کیا کچھ نہ تھا — پر دل اس کا پھر گیا ایسا کہ گویا کچھ نہ تھا

آئے جو میرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے — یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

ہمنشیں باتوں پہ تیری کیا کہوں ہر بار ہوں — تجھ کو اک قصہ لگا میں جان سے بیزار ہوں
کوئی آوے کوئی جاوے منع کر سکتا نہیں — ہوں تو میں در پر ترے پر صورتِ دیوار ہوں
دوست ہوں اس کا بھی جو ہو دشمنِ جانی مرا — وہ نہیں میں جو کسی کے درپئے آزار ہوں

ہوگئے سنتے ہی ہم وصل کا پیغام تمام — کام دل کچھ نہ بر آیا کہ ہوا کام تمام
ایک دن کا ہو جو رونا تو کہیں جرأت ہم — یہاں تو روتے ہی کٹے عمر کے ایام تمام

ہوا ہے اب تو یہ نقشہ ترے بیمار ہجراں کا
کہ جس نے کھولکر منہ اُس کا دیکھا بس وہیں ڈھانکا

قفس میں ہمصفیرو کچھ تو مجھ سے بات کر جاؤ
بھلا میں بھی کبھی تو رہنے والا تھا گلستاں کا

خدا جانے کرے گا چاک کس کس کے گریباں کو
ادا سے اس کا چلنے میں اٹھا لینا یہ داماں کا

وصل کے دن بھی میں کانپ اٹھوں ہوں بیٹھے بیٹھے
یاد آتے ہیں وہ صدمے جو شب ہجراں کے

عزیزو وصل میں بھی ہم جو رو رو کر نہ سوتے تھے
سو اندیشہ تھا روز ہجر کا اس دن کو روتے تھے

سخت تجھ بن قلق اس دل کا ستاتا ہے مجھے
گہ بٹھاتا ہے یہ اور گاہ اٹھاتا ہے مجھے

یہ تو میں کیونکے کہوں کچھ نہیں بھاتا مجکو
کچھ تو بھایا ہے کہ اب کچھ نہیں بھاتا ہے مجھے

صحبت اب یار میں او مجھ میں ہے جوں شعلہ و خس
جوں جوں میں اس کو بڑھاؤں وہ گھٹاتا ہے مجھے

گلشن دہر میں جوں خار یہ ہے قدر مری
جس کے دامن سے لگوں ہوں وہ چھڑاتا ہے مجھے

بارے کچھ جذبۂ دل نے تو اثر اس پہ کیا
اب جو آتا ہے سو فرد وہ یہ سناتا ہے مجھے

منہ ترے گھر کی طرف کرکے یہ کہتا تھا وہ شوخ
اس طرف کو کوئی کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

زخم تازہ کی طرح چرخ کہن اے جرأت
ٹک ہنساتا ہے تو پھر خوب رلاتا ہے مجھے

پر اس کو ہر سرشک چشم سے داماں تر پایا
تری دولت سے بس اے عشق ہم نے خوب پھل پایا

رتبہ گل بازی کا دلا کاش تو پاتا
ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا

دیکھکر کل لیلیٰ و مجنوں کی وہ تصویر کو
اپنے تئیں دیکھے تھا گہ اور گاہ مجھ دلگیر کو

تپش سے غم کی اب اعضا تمام جلتے ہیں ۔۔۔ جو ہم سے دل کوئی بدلے تو ہم بدلتے ہیں

ترے فراق میں جرأت نے جی دیا لے شوخ ۔۔۔ ہزار حیف نہ لی تو نے اس جواں کی خبر

غم بہت دنیا میں ہیں پر عشق کا غم اور ہے ۔۔۔ ہر اسی عالم میں لیکن اس کا عالم اور ہے

بر ہم کبھی قاصد سے وہ محبوب نہ ہوتا ۔۔۔ گر نام ہمارا سر مکتوب نہ ہوتا

جس سے پوچھا میں اس نے ملنے میں ۔۔۔ جان کر خوب عاقل اور دانا
جیتے جی کس کو کہتے ہیں مرنا ۔۔۔ ٹک مجھے اتنی بات بتلانا
سن کے بولا وہ کھینچ کر دم سرد ۔۔۔ سچ کہوں تجھ سے دل کا لگ جانا

عجب انداز سے کل بزم خوباں میں وہ آتا تھا ۔۔۔ کہ دل ہی دل میں اس کی ہر کوئی قربان جاتا تھا

کیوں ہجر کی رات آئی بستر پہ لٹانے کو ۔۔۔ پہلو یہ تہی بس تھا کچھ یاد دلانے کو
یہاں پھونک دیا دل کو واں یار کو بھڑکایا ۔۔۔ نالے بھی قیامت ہیں کچھ آگ لگانے کو

جیسے کہ موت خیالِ جمالِ یار میں آئے ۔۔۔ تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
پس از فنا جو ترے دل جلے کی خاک اڑے ۔۔۔ تو مضطرب سا دھواں اک نظر غبار میں آئے

(۵) جولان

بہادر علی شاہ جولاںؔ تخلص ساکن شاہجہاں آباد کہ پیش ازیں در عالم دنیا دری

رمضانی نام داشت، عمرش قریب بہشتاد خواہد بود۔ گویند در عالم جوانی در علم تیراندازی یگانۂ روزگار بود۔ از وست۔

کنج قفس میں دیکھ کے بے بال و پر مجھے
اے ہمصفیرو چھوڑ گئے تم کدھر مجھے

(۶) جوان

مرزا نعیم بیگ جوان تخلص، اصلش شاہ جہاں آباد اقامت در کوچۂ چیلہ ہا۔ جوان وجیہ و خوش قامت و خوش تقریر و عظیم الشان و خندہ روئے ملازم خاص الخاص مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہ۔ چوں از آغاز شباب طبع موزوں داشت، بسبب ہم محلگی و ز بلیماں آباد گاہ گاہے کہ اتفاق ملاقاتش می افتاد بسیار بے تپاک و نیاز مندی پیش می آمد۔ از یک دو سال کہ دریں شہر تقریر بار یاب مجلس حضور پر نور شدہ ادرا برہمان طریقہ راسخ الاعتقادی معترف یافتہ۔ اگرچہ چنداں بگفتن شعر سرو کارش نیست اما چوں در موزونان شمردہ می شود لہذا پیش ازیں روز ہائے کہ در حضور مشاعرہ بود بموجب ارشاد والا بسر انجام غزلہائے طرحی و غیرہ سعیٔ بلیغ بکار بردہ بواسطۂ معرفت سابق آنہا بہ نظر اصلاح مولف می گذرانید۔ غرض کہ از ابتدا تا انتہا معتقد ایں خاکسار بے مقدار است۔ خیالش بسیار نفاستے دارد۔ از وست۔

پہلو میں دل اپنے کو بھی غمخوار نہ پایا
یہ خوبیٔ قسمت کہ کوئی یار نہ پایا

ظلم و ستم و جور سبھی ہم نے اٹھائے
جب اور کوئی تجھ سا طرحدار نہ پایا

ہم بیچتے آئینۂ دل تیرے ہی ہاتھوں
پر ہم نے تجھے اس کا خریدار نہ پایا

از بسکہ ہوئی گرمیٔ خورشید قیامت
کوچہ میں ترے سایۂ دیوار نہ پایا

شب درد سے کرتا تھا جواں نالہ و فریاد
محفل میں تری اس نے مگر بار نہ پایا

جائیں تھے اشک تو کل دیدۂ گریاں سو لپٹ | آج کیا ہو کہ جدا ہوتے ہیں مژگاں سو لپٹ
تربت سوختہ جانوں پہ نہ اس طرح پھر د | شعلہ جاوے گا کوئی آپ کے داماں سو لپٹ
ساتھ ہر اک کے اُسے شوق ہو اب کشتی کا | اب جو آں تو بھی تو اُس فتنۂ دوراں سو لپٹ

گر اُس کی بیوفائی کا شکوہ بیاں کروں | تو رفتہ رفتہ جمع میں اک داستاں کروں
اُس سے تو اپنے حسن کا شعلہ چھپ سکا | میں ضبط آہ کیونکے بھلا اے جواں کروں

جب تیغ و سپر لے وہ سپاہی پسر آوے | کیا تاب ہو رستم کی جو اُس سے بسر آوے
جیتا نہیں پھرتا ہے کوئی اُس کی گلی سے | مجھ تک مرے دلدار کی کیونکر خبر آوے
اٹھ چل نہ جو آج تو پھر اُس کی گلی کو | شاید وہ نکلتا ہوا گھر سے نظر آوے

یہ ان دنوں جو ہم سے آنی رکھائیاں ہیں | شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ سجھائیاں ہیں
اے عندلیب سچ کہہ کیا فصل گل پھر آئی | نوجیں جنوں کی ہم پر کیسی چڑھ آئیاں ہیں
کس بے ادب نے تم سے گلبازی آج کی ہے | موہنہ پر تمھارے چوٹیں کیا سخت آئیاں ہیں
دیوار و در کی چھاتی سوراخ ہو گئی ہے | کیا روزنوں سے اُس نے انکھیں لڑائیاں ہیں
پیوستہ ابرو اس کی میں دیکھ کر یہ سمجھا | دو شاخیں ہیں کہ جھک کر ملنے کو آئیاں ہیں

نقاب اُلٹ کے جو شب کو وہ مہ لقا نکلے | تو چاند شرم سے بادل میں منہ چھپا نکلے
مزا تو تب ہے کہ کشتہ کے اپنی تربت پر | حنائی ہاتھوں کو ملتا ہوا وہ آ نکلے
شتاب سے اسے ٹانکے کھڑا ہے کیا جراح | نہ ہووے یہ کہ مرے زخم سے ہوا نکلے

جو دیکھ کر درِ گوش اس کا مرگیا موتی
بجا ہے خاک سے گر اس کی موتیا نکلے

کسی کو اپنی سفارش کے واسطے اس پاس
جو لیکے جاؤں تو اُس کا وہ آشنا نکلے

غزل حسن کی پڑھی جائے جبکہ محفل میں
زبانِ اہلِ فراست سے مرحبا نکلے

چین نہیں ہے جی کو ٹک آہ جگر خراش سے
ہوک اُٹھے ہے دمبدم دل میں عجب تلاش سے

حرف الحا

(۱) حسن

میر غلام حسن حسن تخلص ولد میر غلام حسین ضاحک۔ وطن بزرگانش ہرات است وخودش در شاہجہاں آباد تولد یافتہ در عمرِ دوازدہ سالگی قضا اورا بطرف پورب افگند۔ بقیہ عمر در فیض آباد و لکھنؤ گذرانیدہ در سرکار نواب سالار جنگ بہادر یعنی برفاقتِ سردار جنگ خلف نواب موصوف ممتاز بودہ۔ چوں از اوائل عمر طبعش موزوں بود اکثر خود را مشغول بایں شغل خطیر میداشت وشعرِ خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیا کہ در آں ایام ایشاں از مستعدان زمانہ دریں دیار بودند می گذرانید۔ بعد ازاں کہ دور دورِ مرزا رفیع شد و زبان ریختہ چنانکہ بود زیادہ بر آں دریں دیار رواج یافت۔ بحکم قوت ممیزہ قدم بر جادۂ مستقیم اساتذۂ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی میر گذاشتہ کلامِ خود برتبۂ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ دیوانِ ضخیم ومثنویہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ۔ خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ الحق کہ کار کارِ اوست۔ قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش

(۱) گسوزن (غ)

بسیار با مزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ۔ تا زندہ بود با فقیر بسیار رابطۂ دوستی درست داشت در عشرۂ ماہ محرم رحلت او ست عمرش از شصت متجاوز خواہد بود فقیر تاریخ رحلتش چنیں یافتہ۔ تاریخ ؎

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں — روازیں گلزار رنگ و بو تافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفیؔ — شاعر شیریں زبان تاریخ یافت
۱۲۰۱

از وست۔

شب وصل صنم ہے آج اے ہمدم کسی ڈھب سے — گریبان سحر کو ٹانک رکھتا دامن شب سے

صیاد کی مرضی ہے کہ اب گل کی ہوس میں — نالہ نہ کریں مرغ گرفتار قفس میں

ساتھ سونے کو ہمارے یہ مگر آتے نہیں — جن سے چین آتا ہے جی کو وہ نظر آتے نہیں
مر گئے اس مہربانی پر رقیب اور ہم جئے — جو نہیں دیکھا اس نے کہا مجکو ادھر آتے نہیں
دل ہی اک پامال کر جاؤ ہو بس دیکھا تمھیں — تم کو آنکھوں پر کسی کے پاؤں دھر آتے نہیں
جب سے دیکھی ہیں قبا میں گھنڈیاں گلگوں تیرے — شرم سے غنچے چمن میں شاخ پر آتے نہیں
رات دن بیخود رہا کرتے ہیں اس کی یاد میں — مدتیں گذریں حسنؔ ہم اپنے گھر آتے نہیں

اے گرد باد طرف چمن تک گذار کر — بلبل کے پر پڑے ہیں گلوں کے نثار کر

سب نقش اس فلک کے نگینے پہ آرہے — کار جہاں تمام کمینے پہ آرہے
غصہ میں جوش مارا جو دریائے حسن نے — جلوے نزاکتوں کے پسینے پہ آرہے
دو دن کے چاؤ چوز حسنؔ کے بھی ہو چکے — پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پہ آرہے

دل اب تو بات بات میں پیتا ہے اے حسنؔ — کیا جانے اس میں کس کی نزاکت سما گئی

مرنے کے بعد گل کی ہوا و ہوس کے بیچ — بلبل کے پر بھی اڑاتے ہیں کنجِ قفس کے بیچ

ہے دھیان جو اپنا کہیں اے ماہ جبیں اور — جاتا ہے کہیں اور تو جاتا ہوں کہیں اور
آخر تو کہاں کوچہ ترا اور کہاں ہم — کر لیویں یہاں بیٹھ کے اِک آہِ حزیں اور
میں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جاتے ہی تیرے — برپا ہوئی ایک مجھ پہ قیامت تو نہیں اور
تھا عرصۂ زمیں تنگ زبس ہم نے نکالی — رہنے کے لئے شعر کے عالم میں زمیں اور
نکلے تو اسی کوچہ سے پر گم شدہ نکلے — ڈھونڈے ہے حسنؔ دل کو تو پھر ڈھونڈو وہیں اور

کیوں ان دنوں حسنؔ تو اتنا جھنک گیا ہے — ظالم کہیں ترا دل کیا پھر اٹک گیا ہے

دی تھی یہ دعا کس نے مرے دل کو الٰہی — اُجڑے یہ گھر ایسا کہ پھر آباد نہ ہووے

فائدہ آنے سے ایسے آ کے پچھتاتے ہیں ہم — اٹھ گئی جب یہاں کی گذری آہ تب آئے ہیں ہم

آنی جا گر نہ ملی اور کہیں مجھکو کیا — تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھکو کیا
میں ہوں آئینہ تو اپنا ہی تماشائی آپ — تیری آنکھیں جو مجھے دیکھ رہیں مجھکو کیا
تم تو لڑ بھڑ کے حسنؔ یار سے بس ایک ہوئے — مفت میں میں نے یہ باتیں جو سہیں مجھکو کیا

دور سے باغِ جہاں دکھلا کے دیوانا کیا — متصل جانے نہ پایا میں کہ ویرانا کیا

دیکھتے ہی مے کے ساغر کا کھینچا انتظار — مارے جلدی کے میں اپنا لہو پیا کیا

قفس میں ہیں انہیں دیکھو پکارا نہ کیا — ہم صفیروں نے پر ادھر کو گذارا نہ کیا
اشارہ کو سمجھنے نہ لگے غیر کے دہ — میں نے اس ڈر سے کبھی اسکو اشارہ نہ کیا

یتا حسن کی اُس کے اداؤں تیری چاہ — ہائے کیا دن تھے حسن اور زمانہ(۱) کیا تھا

(۲) حیران

میر حیدر علی حیران اصلش از شاہجہاں آباد است و عمرش در پورب گذشتہ و از بسکہ اوقاتش صرفِ معاشِ دنیاداری شدہ و می شود۔ اکثر در مشاعرہ بہ ہنگام خواندن غدر لم بنا سبنئ طبع بہ شعر علی رؤس الاشہاد کردہ والحق کہ دروغ نباشد چرا کہ ایں فنِ شعر بے تعلقی بسیار می خواہد۔ الغرض تا ایں ہمہ حتی المقدور در تلاشِ معنی بیگانہ دارد و مزاج حریفانہ ظریفانہ۔ قطعۂ آخرِ غزلش ضرب المثلِ اکثر سامعان است۔ و وضع خواندنش نیز اگرچہ پسندِ فقیر نہ آمدہ۔ شاگردی رائے سرب سکھ دیوانہ تخلص کہ بندہ احوالش مفصل در تذکرہ فارسی نوشتہ ام مشہور است و بگمانِ خویش شاعری خود را معذور۔ مرد سپاہی پیشہ است از چندے در سرکار راجہ ٹکیٹ رائے در سواران عز و امتیاز دارد و بندہ او را در لکھنؤ دیدہ ام از دوست۔

دم نکلتا ہے اب کوئی دم میں — بیٹھ جا کچھ نہیں رہا ہم میں

کل جو حیراں کو میں دیکھا روتے — بن گئی دو کھنی کی گھات مری

---

(۱) اور وہ زمانہ (ن خ)

اُن کی خدمت میں ادب سے میں نے — عرض کی دیکھی کرامات مری
میں نہ کہتا تھا کہ دل آپ نہ دیں — بندگی قبلۂ حاجات مری

کیا اک خلق کو اُن ابرؤں نے قتل اے حیراں — کہاں جاتا ہے وہاں تلوار پڑ لوار چلتی ہے

صفِ مژگاں سے اس کی جب تب دل اٹکتا ہے — سمجھتا ہی نہیں ہر چند حیراں سر ٹپکتا ہے
وہ کیا تجھ میں نہیں جو دیر و کعبہ میں ہے بتلا تو — عبث کیوں لے کے دل بیہودہ تو در در بھٹکتا ہے
جلا جاتا ہوں حیراں آتشِ عشقِ نہانی سے — بجھا جاتا ہے دل اور جی سینہ آسا چٹکتا ہے

(۴) حسن

خواجہ حسن حسن تخلص ابن خواجہ ابراہیم نبیرۂ حضرت خواجہ کمہاری[1] قدس سرہ العزیز از فرزندان خواجہ مودود چشتی درویشی است۔ صوفی مذہب اکثر مسائل صوفیہ ہا را کہ مراد از وحدت وجود باشد بدلائل و براہین چنانکہ شیوۂ صوفیان با فضل و کمال است از روئے نص[2] وحدیث باثبات رسانیدہ[3] و در ریختہ موزوں ساختہ و دیوان ضخیم ترتیب دادہ۔ پیش ازیں در بریلی استقامت داشت و بعد ازاں در فیض آباد حالا در لکھنؤ، نواب وزیر و صاحب عالم بسیار عزت و حرمتش می کند۔ مشورہ بہ شعر در ابتدا بہ میاں جعفر علی حسرت کردہ و نیز بہ قلندر بخش جرأت دوستی داشت۔ ازبسکہ باوجود ایں ہمہ بزرگی شوخ طبع و ظریف مزاج و تماشا دوست واقع شدہ سرے بہ نسواں ہم دارد و قدم در راہ طلسم و شعبدہ بازی نیز می گذارد۔ و در مقطع ہر غزل آوردن لفظ بخشی را کہ نامِ محبوبۂ اوست سکون بخشی میداند فرق تخلص میر حسن و ایں بزرگ بر ہوشمند[4] آں از وضع کلام اش پیدا است۔ از وست۔

---

(۱) کمہاری (ن۔خ) (۲) فقہ و حدیث (ن۔خ) (۳) نسخہ خ میں "و" نہیں ہے۔ (۴) دانشمنداں (ن۔خ)

جھٹک کے ہاتھ سے دامن خفا جو یار ہوا — تو وہ میں پیرہن صبر تار تار ہوا
یہ دوستی نے حسن بخشی اُس(۱) کی کچھ تاثیر — کہ دشمن آج ہر اک اپنا دوستدار ہوا

کونسا نقصان اس میں آپ کا ہو جائے گا — اس طرف ٹک مڑ کے دیکھوگے تو کیا ہو جائیگا
جاؤگے گر جان بخشی کو حسن کی نزع میں — کیا بُرا ہے اک بچارے کا بھلا ہو جائیگا

جس جا کہ نہ بنتی تھی کبھی بات کی صورت — ٹھہری پھر اُسی گھر میں ملاقات کی صورت
کہتے ہیں جسے ہجر کی شب سخت بلا ہے — یارب نہ دکھانا مجھے اُس رات کی صورت
کس رنگ ہے شیشہ میں جھمک دخترِ رز کی — ٹک دیکھیو اس کافرِ بدذات کی صورت

جان بخشی کر حسن کی نزع میں آ کر شتاب — ورنہ یہ ارمان اس کو لے بتاں رہ جائیگا

آئینہ دیکھ کے حیراں جو ہوا آتا تو — ہم تو تھے محو ترے تو نے بھلا کیا دیکھا
وہ تو آیا تھا تماشے کو مرے نزع کے پر — میں نے اُس وقت میں بھی اسکا تماشا دیکھا

پہنچا تھا ہاتھ چوری سے رات اُسکے پاؤں تک — پر میرے بخت خفتہ نے اس کو جگا دیا
کوچہ میں اپنے دیکھ مجھے بول اٹھا وہ شوخ — میرا گھر اس دِوانہ کو کس نے بتا دیا
بخشی حسن یہ لذتِ غم اس کی یاد نے — راحت کا جو مزا تھا سو ہم نے بھلا دیا

اشک اس کو نہیں سمجھتے ہم — جس میں لخت جگر نہیں آتا

---

(۱) اس کی بخشی کچھ تاثیر (ن خ)

یہ ظرف تیری کرم بخشی سے ورے صاحب   حسن نبیرۂ خواجہ کہار[1] سنے پایا

(۴) حسرت

جعفر علی حسرت خلف الصدق ابوالخیر عطار کہ دوکانِ عطاری در لکھنؤ متصل اکبری دروازہ چیدہ جوانِ خوش خلق و حلیم و سلیم واقع شدہ۔ از مدت بسیار مشق سخن می کند شاگردان بسیار بہم رسانیدہ۔ فقیر اورا در مشاعرہ ہائے لکھنؤ دیدہ تا ایں مدت معاش بہ پیشۂ شاعری بسر بردہ۔ آخر آخر چندے[2] در سرکار صاحب عالم مرزا جاندار شاہ ہم عز و امتیاز داشت چوں پدرش جہان فانی را پدرود کرد نوکری صاحب عالم گذاشتہ خود بجائے پدر دوکان نشیں گردیدہ بود کہ یک ناگاہ بہ ایمائے بزرگے خرقۂ درویشی پوشیدہ و ترکِ لباس دنیائی کردہ کنج عزلت اختیار نمود۔ شعرائے ایں دیار اورا از اول بہ استادی قبول کردہ اند۔ در قصیدہ و غزل[3] ید طولیٰ دارد و خود مشورۂ شعر برائے سرب سکھ دیوانہ کردہ، چوں الحال شانش مقتضیٔ اقرار نمی شود قدری منحرف است۔ چندیں شعر ازو نوشتہ شدہ۔

زخمی بے شمار ہے تیغ جفائے یار کا
کس سے کہوں میں جا کے آہ حال دلِ فگار کا

گر ادہر[4] آیئے تو ایک صید ضعیف یاں بھی ہے
ہم نے سنا ہے تم کو ہے شوق بہت شکار کا

یار سے دوریوں میں پھینک دیا ہے ہی غضب
ہم نے کیا تھا کیا گناہ گردش روزگار[5] کا

روتے ہی اسکو گذرے ہے ہجر میں تیری رات دن[6]
حال میں کیا کروں بیاں حسرت بیقرار کا

کس کی نگہ کا تیر لگا آہ کیا ہوا
تڑپے ہے دل مرا اسے اللہ کیا ہوا

---

(۱) کہار (ن خ) کمار (ن ر) (۲) "چندے" ندارد (ن خ) (۳) غزل وغیرہ (ن خ)
(۴) گر ادھر آئے تو لو ایک الخ (ن خ) (۵) روز و شب (ن خ) (۶) حال بیاں میں کیا کروں (ن خ)

کوئی دم کی بات ہے کہ نہ تھا بے قرار دل — کیا آفت اس پہ آگئی ناگاہ کیا ہوا

حسرت کا حال پوچھے اگر یار لے صبا — کہیو کہ دردِ ہجر سے رو رو کے مرگیا

بیاں کیا کیجے اُس سروِ رواں کے قد و قامت کا — بلا ہے آفتِ جاں ہے نمونہ ہے قیامت کا
ہوا کل پانی پانی دیکھ لے رنگِ چمن تجکو — نہیں شبنم عرق ہے گل کے چہرے پر ندامت کا
ترے لب کے ہلانے میں جو پیارے جی نہ اٹھتا میں — نہ ہوتا معتقد ہرگز مسیحا کی کرامت کا

بادِ خزاں تو باؤ ہے یا تیغ آبدار — گلشن کا ہر شجر ترے آتے ہی چھٹ گیا

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا — تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا
فلک اک دم بھی تو نے وصل کی شب کو نہ ٹھہرایا — یہ ساری عمر میں تجھ تک ہمارا کام آیا تھا
بہاریں بھول گئیں پر یاد ہے آنا گلشن میں — گریباں چاک کرنے کا بھی(۱) اک ہنگام آیا تھا
نہیں معلوم کیا تھا جو سحر تک شمع رویا کی — کچھ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا
ہوا لبریز جامِ زندگی جس وقت اے حسرت — دریغ اس وقت میں ساقی پلانے جام آیا تھا

حسرت نے تیرے ہجر میں رو رو کے جان دی — بے رحم اس کے مرنے کا تجھ کو بھی غم ہوا

تجھ بن ہے اس طرح سے مرے دل کو اضطراب — ہوتا ہے جس طرح کسی بسمل کو اضطراب
دل دیکھتے ہی خنجرِ مژگاں سے بھر گیا — ہوتا ہے سخت جنگ میں جاہل کو اضطراب

---

(۱) یہی بجائے "بھی اک" (ن خ)

آشیاں چھوڑ چلے اے چمن آرا ہم تو — تو ہی لیجائیو سر پہ گلستان اُٹھا

آخر ترے غم میں مر گئے ہم — بھرنا تھا جو دُکھ سو بھر گئے ہم
کل روتے ہوئے جو اتفاقاً — حسرت کے مزار پر گئے ہم
پڑھتا تھا یہ شعر وہ ترا خاک — بس سنتے ہی جس کے مر گئے ہم
واماندوں پہ دیکھئے کہ کیا ہو — اپنا تو نباہ کر گئے ہم

کسے منظور تھا یوں تلخ کیجے زندگانی کو — ولے کیا کیجے حسرت بلائے ناگہانی کو
بصد خون جگر یک قطرہ مژگاں تک پہنچا ہے — نہ دے بربادیوں اے چشم اشک ارغوانی کو

تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا — کہ ملنا ہو گیا دشوار اب مژگاں سے مژگاں کو

جوں لالہ بہار کر رہا ہے — یہ سینۂ داغدار اپنا

سارباں محمل لیلیٰ کو ادھر ٹک لے چل — خاک مجنوں کی بھٹکتی ہے بیاباں کے بیچ

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے — لو دل تمھیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے
دل لینے کو اوروں سے بھی کہہ دیکھو بھلا کچھ — لاویں گے بجا ہم تو جو ارشاد کروگے
بے خوابی و حیرانی و طغیانیِ گریہ — سب آنکھوں پہ ہم لیں گے جو امداد کروگے
تاراج کیا صبر و دل و جاں پھر آکے — کیا خاک ہی مجھ میں ہے جسے برباد کروگے
کہیو جو صبا ٹک تو جوانانِ چمن سے — فرصت ہے کسی دل کو اگر شاد کروگے

پانی کریں پتھر کو بھی حسرت کی یہ آہیں　　دل اپنا بتاں کب تئیں فولاد کروگے

ہر آن میں مژگاں پہ لختِ جگرِ تازہ　　یہ نخلِ محبت کا دیکھا ثمرِ تازہ
ہر دم دلِ سوزاں کا احوال ہے کچھ کا کچھ　　جو قاصدِ اشک آیا لایا خبرِ تازہ

کوڑیوں کے مول بیچا مصر میں تو نے فلک　　ہائے اس یوسف کو جو تھا سارے کنعاں کی نشاط[1]

ترے سامنے ہو یہ دل جان کیا ہے　　غضب ہے بلا ہے تری آن کیا ہے
کہا کرتے ہیں پھر نہ ملئے گا اُس سے　　پر اس سے نہ ملنے کا امکان کیا ہے

(۵) حجام

عنایت اللہ حجام، مولدش قصبۂ سہارنپور[2] است از مدت مدید در شاہجہاں آباد پیشۂ سرتراشی باقتیاز بسر می برد یعنی از بازار گردیدن و بر دوکان نشستن مثل سرتراشان دیگر عار کلی دارد و ہمیشہ خانہ نشین می باشد۔ چوں طبعش از ابتدا موزوں افتادہ بود باوجود کم علمی شعر ہندی را بخوبی سر انجام می دہد و معنی ہائے[3] نازک تر از موئے می یابد، چنانکہ در اکثر مشاعرہ ہا موردِ تحسین و آفریں یاران بودہ۔ و در مقطع ہر غزل رعایت پیشۂ خود را از واجبات می شمارد و سامعان را بداں محظوظ می کند۔ وضیع و شریفِ شاہجہاں آباد او را بسیار دوست می دارند۔ ازیں جہت ہمیشہ[4] فخر شاگردیِ مرزا رفیع سودا می کند۔ و فخر دیگرش اینکہ دست بیعت بہ سلسلۂ چشتیہ پیشِ قدوۃ الاولیا و زبدۃ الاصفیا مولوی فخر الدین صاحب گزاشتہ، در حین

---

(۱) بساط (ن خ) (۲) لکھنؤ کے نسخے میں یہ لفظ نہیں ہے۔ (۳) معنی ہائے تازہ (۴) ہمیشہ ندارد (ن خ)

حیاتِ آں بزرگ اکثر بہ اصلاحِ خطِ مبارک و بستنِ خضاب در تعطیلین یعنی روز سہ شنبہ و جمعہ حاضر می شد و از زمان کہ ایں سعادتِ عظمیٰ از صحبتِ کیمیا خاصیتِ ایشاں حاصل کردہ بود قامتِ حالِ خود را بلباسِ مشائخانہ یعنی پیراہن و تاج آراستہ دارد ہم ازیں جہت در محلہ شاہجی گفتہ می شود و در مجلسِ سماع ہمیشہ در وجد و حال شریکِ یاران است و یکے از نظر کردہ ہائے آں وحیدِ زمان است با فقیر از مدتے آشنائی داشت و بیاز بعجز پیش می آمد۔ عمرش تخمیناً از سی و پنج متجاوز باشد[1]۔ شش سال شدہ کہ در شاہجہاں آباد در گذشتہ از دست۔ طرحِ مشاعرہ فقیر در دہلی۔

ہر دم نظر آتے ہیں نئے یار تمھارے — ہم جی چکے گر ہیں یہی اطوار تمھارے
اک روز نصیبوں سے کہیں واں میں پہنچوں — پھر سر ہے مرا اور در و دیوار تمھارے
ہے دل میں کہ اک روز ان آنکھوں سے یہ پوچھوں — جیتے نہیں کس واسطے بیمار تمھارے
اُس شوخ کے کوچہ میں نہ جایا کرو حجام — چھن جائیں گے اک دن کہیں ہتھیار تمھارے

فلک کے جور کے مارے ہوؤں سے یہ کوئی پوچھے — کہ ہو زیر زمیں بھی دُکھ میں یا آرام کرتے ہو
رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑی پانی — بلا حجام کو جس روز تم حمام کرتے ہو

روز رخسار کے لیتا ہے مزے خوبوں کے — بہتر اس سے کوئی حجام ہنر کیا ہوگا

اب تو حجام شیخ کی داڑھی — تا بہ موئے زہار گذری ہے

بسانِ ناقہ لیلیٰ کے اک دو گام غلط — خدا کرے کہ ادھر بھی ترا سمند کرے

(۱) بود دن ح

مجا آم پڑا سخت حیاناک کے پالے | کچھ اور تو کیا بات کہ وہ منہ سے نکالے
گھ چلتا ہوں اس شوخ سے رستہ میں تو مجکو | جھنجلا کے یہ کہتا ہے کہ چل دور رجا لے

دیکھ عاشق کی ترے رسوائیاں | عشق کی یاروں نے قسمیں کھائیاں

(۶) حزیں

از نامش خبر ندارم از دورِ فردوس آرامگاہ کسی خواہد بود سہ شعرش از عالم مکتب نشینی بیاد ماندہ است

اس بیوفا کے عشق میں کچھ ہم کو حس نہیں | پاؤں تلک بھی اُس کے ہمیں دسترس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یا فلک کہ ہم | چاہیں کہ چل دیں تو کہیں خار و خس نہیں
اس فصلِ گل میں کیوں نہ گریباں کو کیجے چاک | جاتی ہے یوں بہار حزیں ہائے بس نہیں

(۷) حیرت

میر مراد علی حیرت، وطنش مرادآباد است فقیر او را در آوانِ آبادی کٹیھر رو ہیلے در آنولہ دیدہ بود۔ شعر را بہ پاکیزگی می گفت در ہماں ایام شنیدم کہ بطرف کوہ برائے کارے حسب ایمائے رئیسے رفتہ بود کہ آفتابِ زندگیش در ہماں کوہ رو بغروب نہادہ از وست۔

نظر آیا یہ جہاں نقش برآب آخر کار | تاج سر پہ سے گرا مثلِ حباب آخر کار
سادہ رویوں کی وفا ظاہر و غارت بجل | منہ پہ دیویں گے تجھو صاف جواب آخر کار

بجھ کے دیکھا تو بجا ہے سب گلا دل کا | کہ چشم تر نے ڈبویا معاملہ دل کا

یہ اشک و آہ ہے شورِ جنوں ہے وحشت ہے عجب جلوس سے جاتا ہے قافلہ دل کا

یہ قافلے یاروں کے اگر کہیں ٹھیری ہیں آوازِ جرس کم ہے یا کچھ ہمیں بہرے ہیں

(۸) حاتم

شیخ ظہور الدین حاتم کہ شاہ حاتم گفتہ می شد، مولدش شاہجہاں آباد است۔ تاریخ تولدش بقولے از حرفِ ظہور می آید۔ ہمیشہ عمدہ معاش بودہ و اوقات[1] بخوبی گزرانیدہ مرد سپاہی پیشہ از ہندوستان زایانِ قدیم بود۔ روزے پیش فقیر[2] نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرامگاہ دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ با دو سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ داد معنی یابی و تلاشِ مضمونِ تازہ می دادیم۔ غرضیکہ از شعرائے متقدمین است۔ در ایامیکہ فقیر در شاہجہاں آباد طرح مشاعرہ انداختہ اکثر بعد مغرب در مشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ زمانۂ سابق خود را می ستود۔ الحال کہ در دورۂ ما زبانِ ریختہ بسیار بہ پاکیزگی و عمدگی رسیدہ مشارٌ الیہ ہم مرتبۂ[3] سخن تازہ گویان فہمیدہ دیوانِ قدیم خود را از طاقِ دل افگندہ دیوانِ جدید بزبانِ ریختہ گویانِ حال ترتیب دادہ دیوان زادہ نامش گزاشتہ الا بسبب طوالتِ عمر بعض مردم و در دست راکہ اشتباہ حاتم دوم می افتاد برطرف کردہ بحور[4] اشعار را ہم جدا جدا از سرخی بر سرِ ہر غزل نوشتہ و ایں ایجادِ اوست۔ و از ینکہ در درازیِ عمر و قدامتِ شعر از ہمہ بیشتر است۔ نغمہ سنجانِ حال وضیع و شریف او را استاد مسلم الثبوت میدانند بلکہ او خود اسامیِ کسانیکہ از اول تا آخر استفادۂ شعر از و گرفتہ

---

(۱) او قات را (ن خ)۔ (۲) فقیر آمدہ (ن خ)۔ (۳) و تیرہ (ن خ) (۴) بحر (ن خ)

اند۔ بر دو سہ ورق بطریق فہرست بر پشتِ سر لوحِ دیوانِ خود نوشتہ چسپانیدہ تا معلوم کنان گردد کہ حاتم این قدر شاگرد داشت و در آنجملہ اسم مرزا رفیع سودا ہم کہ باتفاق ہمہ یکے از سر آمدِ شعرائے ہندی گویانِ این دیار گزشتہ مسطور است و الحق کہ دروغ نیست۔ قیاس استادیش ازینجا باید کرد و نیز بنابراں میر محمد تقی میر کہ شاعرے است جادو کار اکثر اورا در مشاعرہ بطریق ظرافت واہ الشعرامی گفت۔ چوں دو چار جزو مسودۂ شعر فارسی ہم بطور رصائب داشت لہٰذا بیشتر ازیں در تذکرۂ فارسی احوال او معہ تاریخ رحلتش صورت تحریر یافتہ۔ عرش قریب بہ صد رسیدہ بود و سہ سال است کہ در شاہجہاں آباد ودیعت حیات سپردہ خدایش بیامرزاد۔ از وست۔

مضمون خط کو دیکھ ترے ہم بہت ڈرے   جتنے مسودے تھے رہے طاق پر دھرے
پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر   سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

رات میں خواب میں اس زلف کو پیچاں دیکھا   صبحدم حال دل اپنے کا[1] پریشاں دیکھا
نظر آئے ترے دنداں مسّی آلودہ   رات اور دن کو بہم دست و گریباں دیکھا
کعبہ و دیر میں حاتم بخدا غیرِ خدا   کوئی کافر نہ کوئی ہم نے مسلماں دیکھا

تو صبحدم نہ نھائے حجاب دریا میں   پڑے گا شور کہ ہے آفتاب دریا میں

تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں   دور ہو پہلو سے صحبت کے مری قابل نہیں
عکس سے ہے خونِ عاشق کے فلک اشفق   یہ تماشا ہے کہ رنگیں دامن قاتل نہیں
کس کو ٹانکے دیجئے اور کس کا مرہم کیجئے   کون ہے جو تیغ کا تیری میاں گھائل نہیں

---

(۱) کو (ن۔ع)

خوش حال اُن کا جن کو ہوئی رخصت چمن　　ہم جھانک جھانک رخنہ دیوار رہ گئے

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو　　اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

دل تو چاہ زنخ میں ڈوب موا　　آشنا تھا غریق رحمت ہو

مفلسی اور دماغ اے حاتم　　کیا قیامت کرے جو دولت ہو

مجھے تو دیکھ کر کیا اتک رہا ہے　　ترے ہاتھوں کلیجہ پک رہا ہے

خدا کے واسطے اس سے نہ بولو　　نشہ کی لہر میں کچھ بک رہا ہے

(۹) حشمت

محتشم علی خاں حشمت پسر میر باقی اصلش از شاہجہاں آباد است. شعر فارسی را بسیار بہ لطافت می گفت وگاہ گاہے خیال ریختہ ہم داشت۔ ایں مطلع دلیل بر لطافت طبع او است۔

نکہت گل نے جگایا کسے زندان کے بیچ　　پھیر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

گور کے سوتے دوانوں کو جگاتی ہے بہار　　شور ہے غل ہے قیامت مست آتی ہے بہار

حشمت اپنا درد دکھ تو اس برس ظاہر ہے کہ　　ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار

(۱۰) حیف

میر چراغ علی حیف شاگرد میر شیر علی افسوس، جوان خوش خلق و با تواضع است ایں چند اشعار از وست۔

ملنے بھی نہ پائے اُس جواں سے　　حسرت زدہ ہم چلے جہاں سے

گو آپ نہ آئیے ولیکن | اقرار تو کیجے زباں سے
کافی ہے ترا ہی دید[1] ہم کو | کیا کام بہار[2] و بوستاں سے
ہر دور شراب بسکہ ساقی | ڈرتا ہوں میں دور آسماں سے
لے راہرو تو مری زبانی | کہنا یہ پیام کا رواں سے
رستے میں تھکا ہوا پڑا ہے | اک شخص تمھارے ہمراہاں سے
کیا پوچھے ہے حیف کی حقیقت | ناشاد گیا وہ اس جہاں سے

وہ مہر جہاں تاب اگر بام پر آوے | تابندگی تیرا عظم نظر آوے
کہتا ہے اسے بال کوئی کوئی رگ گل | کچھ میں بھی کہوں تیری کمر جو نظر آوے
ہر اپنے تو نزدیک وفا خوب[3] ولیکن | ہو خوب جو تیری بھی طبیعت ادھر آوے

(۱۱) حضور

لالہ بال مکند حضور تخلص شخص کہنہ مشق است۔ ہمیشہ در مشاعرہ ہائے شاہجہاں آباد حاضر می شد۔ حلقہ شاگردیِ خواجہ میر درد بگردن دارد و فقیر اور ایک دو بار در لکھنؤ ہم دیدہ۔ نقل است کہ روزے در شاہجہاں آباد بخانۂ لطف علی خاں ناطق مشاعرہ بود غزل طرحی میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف اور معنی طرف تقرر داشت۔ و ازیں جہت بعضی از فصحا اور اخلاف اردو شمردہ پیروی‌اش نکردند[4] و اکثرے اطاعت استادیش کردہ اشہب فکر را در میدانِ خیال دوانیدہ۔ مشارٌ الیہ کارے کردہ کہ پیش ہر دو گروہ خفت عقلش مایہ حال نگشتہ یعنی در آں غزل طرحی شعرے طرفہ خواندہ و آں اینست

رکھتا ہوں میر صاحب و قبلہ سے میں[5] سند | یہ جانتا نہیں کہ زباں ہے کہاں کی اور

---

(۱) مجھ کو (ن خ) (۲) واو ندارد (ن خ) (۳) لطف (ن خ) (۴) نہ کردہ بودند (ن خ) (۵) بسند (ن خ)

وفا کو تم جفا سمجھے، ستم کو ہم کرم سمجھے　　ادھر کچھ دل میں تم سمجھے ادھر کچھ دل میں ہم سمجھے

چلے ہو تم جواب اُس بت سے ساز کرنے کو　　حضور یاس بھی کچھ ہے نیاز کرنے کو

(۱۲) حکیم

محمد پناہ خاں حکیم کہ پیش ازیں نثار تخلص میکرد وحالا از چندے تبدیل تخلص کردہ بجائے نثار حکیم قرار دادہ ولد سید محمد شریف خاں الک بخش بقولش سید صحیح النسب است از حضرت ظل سبحانی در سنہ ستہ بخطاب خانی و منصب ہزاری سرفراز شدہ۔ جوان خوش خلق وخوش اختلاط وعاشق پیشہ و دل بدرد رسیدہ دیدمش تاکہ در شاہجہاں آباد اقامت داشت اکثر در مشاعرہ ہا می آمد۔ بلکہ در سفر لکھنؤ با فقیر ہم سفر و ہم قافلہ بود۔ باز بہ شاہجہاں آباد رفتہ باز گردید۔ در علم موسیقی و عمل تکسیر و عبور کتب تواریخ و طب و سیر و دواوین اساتذہ و تذکرہ ہائے سلف یگانہ روزگار است۔ از آنجا کہ بہ شاگردیِ خواجہ میر درد نسبتی دارد شعر درد مندانہ می گوید و تلاش عاشقانہ می کند۔ از وست۔

یہ دل کیا ہے جو تیرے قربان جاوے　　سعادت ہے اپنی اگر جان جاوے
خلل شیخ نے ہم میں آکر کیا ہے　　الٰہی یہ مجلس سے شیطان جاوے
حکیم اُس کے کوچہ میں پوشیدہ جانا　　مبادا کوئی تجھکو پہچان جاوے

پوچھتے کیا ہو حکیم جگر افگار کا گھر　　ایک تکیہ سا ہے اس شوخ کی دیوار کے پاس

یہ کیا ہے آپ بھی شاید کسو کو چاہیں ہیں　　کہ اشک نکلیں ہیں آنکھوں سے ہر دم آہیں ہیں

واشد سی جو گویائی پہ وہ غنچہ دہن تھا — گل جھڑتے تھے ہر بات میں یہ لطف سخن تھا
پامال جو تم کرتے ہو دل ایسی روش سے — اے سرو قداں آگے بھی کیا یوں ہی[1] چلن تھا
خوابیدگی طالع کہوں کیا کہ شب وصل — میں قصۂ دل کہتا تھا وہ نیند میں غن تھا
کیونکر نہ جلے حال پہ دلی کے دل اپنا — یارو یہ خرابہ کبھی اپنا بھی وطن تھا

گرفتار[2] اس کے ہر مو میں دل گبر و مسلماں ہے — یہ کھلایا ہوا سنبل ہے یا زلف پریشاں ہے

آنکھوں سے لخت دل یوں آنسو نکالتی ہے — مرغے کو جس طرح سے پانی اچھالتی ہے

تیرے لیے خلق در بدر ہے — اے خانہ خراب تو کدھر ہے
یہ کیونکہ کہوں کہ آئیے یہاں — تشریف جو لائیے تو گھر ہے
جو اس کے ستم اٹھائے ہے تو — تیرا ہی حکیم یہ جگر ہے

نہ ہم ہی غم سے جل اس شعلہ رو کے خاک ہوئے — اجل رسیدہ ہزاروں یوں ہی ہلاک ہوئے
ہے رشک دستۂ گل کیوں یہ آستیں تیری — سرشک خون تپا کس کے اس سے پاک ہوئے
بہت دنوں میں ملاقات ہوئی جو اس سے حکیم — سنیں تو ہم بھی کہ کیا کیا بہم تپاک ہوئے

جمعیت عالم ہے رہنے میں بندھی جس کے — آفت ہو اگر یار وہ وہ زلف پریشاں ہو
کہتے ہیں حکیم آیا میخانے سے مسجد میں — ہم کو تو تعجب ہے وہ گبر مسلماں ہو

---

(۱) یہی" بجائے یوں ہیں (ن خ)، (۲) ن خ میں یہ شعر فاضل ہے۔

دے چین ٹک تو جان کو جوشِ شکست رنگ　　خاطر یہ یہاں گراں ہے خروشِ شکستِ رنگ

جی ہی جانے کی یہ علامت ہے　　دل کا لگنا نہیں قیامت ہے
ہم تو کیونکر کہیں کہ بوسہ دو　　گر عنایت کرو کرامت ہے
دور مت کیجے حکیم کے تئیں　　اس کو مشفق بڑی قدامت ہے

ملکِ عدم کے یاروں کا احوال نہ کچھ دریافت ہوا
پوچھی خبر کہلا بھی بھیجا سینکڑوں آتے جاتوں سے

(۱۳) حقیقت

میر شاہ حسین المتخلص بہ حقیقت شاگرد جرأت وطن اجدادش بلخ و خود است و خود در بریلی تولد یافتہ و بہ لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ۔ یکے از اجدادش بہ تعلیم کودکانِ نواب محبت خاں اشتغال دارد، غرضکہ ملازادہ و خوش نویس بچہ است پیش ازیں در ترک سواران نوکر بود و دراں روزہاے امردی و نومشقی اکثر بہ کتابتہاے غزلہاے استادِ خویش کہ بہ سبب کوری از نوشتن معذور است مصروف می ماند۔ چوں رسالۂ ایشاں برہم خورد امام بخش خاں کشمیری کہ باوصف جاہلی از مدتے خیال جمع کردن اشعارِ اساتذہ در سر داشت روزے از جرأت درخواست شخصے کرد کہ ہم بہ تعلیم کودکان متوجہ شود وہم بہ نوشتن تذکرہ مصروف باشد۔ مشارٌ الیہ اورا آوردہ روبرو کرد و منت برطرفین گزاشت۔ غرضکہ حسب الاشارہ مومی الیہ و بہ پشت گرمی کور موصلی کہ بہمسری من می میرد و در باطن ہمیشہ تخمِ کینہ می کارد او ہم تذکرہ نوشتہ درست ساختہ است[1] اما

(۱) "است" ندارد (ن خ)

طرفہ اینست کہ خان مذکور پیش ازیں روزی بر مکان فقیر آمدہ بالحاحِ تمام مسودۂ خام تذکرہ مرا کہ دریں مدت بہ ہیچ کس نہ نمودہ بودم از من طلب نمود۔ من سادہ دل غافل از فطرت و بدذاتیِ کشمیریان سابقہ معرفتِ شاہجہاں آباد و آدمیت را کار فرمودہ اجزائی مسودۂ تذکرۂ خود را حوالہ کردم۔ درعرصہ یک دو روز خفیہ از من اشعار و احوال شعرائے دہلی وغیرہ کہ من بہ محنتِ تمام آنہارا بہم رسانیدہ بودم از دست حقیقت بے حقیقت نقل کنانید و دیگر بیاضِ دو جنگ[1] مرزا جہاندار شاہ کہ بعد فوت ایشاں پیشِ او ماندہ بود چیزے از و چیزے از جائے دیگر اخذ نمودہ ہرگاہ مسودۂ تذکرہ بے مغزش کہ آنرا ہیچ دانا نپسند دفی الجملہ صورت گرفت۔ روزے یکے از آشنایان جزو اول آں مجموعہ آوردہ بمن نمود و غافل ازیں مقولہ کہ گفتہ اند۔ شعر۔ پنیر آب دادن نشاید بہ نیش + کہ بیند در و قطرۂ خون خویش۔ چوں در و نظر کردم دیدم کہ ہمیں تخلص آفتاب و آصف بطور تذکرۂ من در[2] و نوشتہ است۔ بسیار برہم شدم و تفحص احوال کردم۔ مشارٌ الیہ حقیقت تذکرہ نویسانیدن امام بخش خاں بگوش من رسانیدہ اگرچہ مرا در بادی النظر از[3] حرکت ایں اصحابِ[4] ثلاثہ آزردگی کمال بہم رسیدہ بود[5] قریب بود کہ ہجوا از من سر زند اما چوں بعبارت پوچ و غلطیِ احوال و اشعار شعرا کہ در آں جریدہ بسمت تحریر یافتہ نگاہ کردم آسودہ شدم و در گذشتم و برہمیں قطعہ طبع زاد خود و یک بیت مولانا نظامی اکتفا کردم

قطعہ

جانتے ہیں سب کہ اک مدت سے یہاں مصحفی کے تذکرہ کا شور ہے
تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا بے حقیقت مصحفی کا چور ہے

---

(۱) "جنگ" بجنسہ (ن خ) (۲) "در و" ندارد (ن خ) (۳) "ازیں حرکت" بجائے "از حرکت" (ن خ) (۴) "ایں اصحاب ثلثہ" یہ عبارت ندارد (ن خ) (۵) "بود" ندارد (ن خ)

اگر برفروزی چو مہ صد چراغ　　زخورشید باشد برو نام داغ

فرضیکہ جائے علی قلی خاں خالی است۔ ازوست۔

کس کے ہیں انتظار میں آنکھیں　　جو کھلی ہیں مزار میں آنکھیں
نہ خفا ہو جو تک رہوں پیارے　　کہ نہیں اختیار میں آنکھیں

کیا ترے عشق میں لے عربدہ جو ہاتھ لگا　　زیست سے ہاتھ بھی دھویا پہ نہ تو ہاتھ لگا

ہجر میں کیوں نہ کروں یاد ملاقات اسکی　　کہ بہلتا ہے ذرا وصل کی تقریر سے دل
سخت اس کا ہو تعجب کہ حقیقت اس کا　　نرم ہو جائے مری آہ کی تاثیر سے دل

غم عشق دل کو جلائے گیا　　اک آتش سی تن میں لگائے گیا
حقیقت وہ کھینچے جدھر تیغ تھا　　ادھر میں بھی سر کو جھکائے گیا

حرف الخا

(۱) خاکسار

میر محمد یار خاکسار تخلص کہ الحال بہ شاہ خاکسار شہرت دارد درویشی است قلندر وضع و آزاد منش در شاہجہاں آباد متصل قدم شریف مدرچہ راہ ہمی باشد فقیر اور اگاہ گاہے از دور دیدہ۔ عالی دماغی از بشرہ او جلوہ ظہور رسیدہ۔ از ہندی گویان قدیم است۔ گویند کہ میر تقی میر در عالم شباب منظور نظر او بودہ۔ چوں زبان خوشی دارد چند اشعارش از تذکرہ میر حسن صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نوشتہ شد۔ ازوست۔

تیغ قاتل سے رہے محروم بے تقصیر ہم   روز محشر کے اٹھیں گے گور سے دلگیر ہم

قیامت بھی ہوگی تو میری بلا سے   مجھے دادخواہی کی طاقت کہاں ہے
شانہ اُس پر نہ کیجیو حجام   تار اُس زلف کا رگ جاں ہے

رونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی   اس خانماخراب کو چپکا[1] خدا کرے

(۲) خلق

میر احسن خلق خلف میر حسن صاحب جوانے است خوش ظاہر و بالم و حیا بمقتضائے موزونی طبع کہ موروثی است کم کم خیال شعری کند و از نظر پدر بزرگوار خود میگذراند۔ عمرش تا امروز نوزدہ سالہ است۔ از وست۔

دل میں تھا آتے ہی اسکے جائیں لگ آغوش ہم   جب وہ آیا سامنے تب رہ گئے خاموش ہم

عجب عالم میں بے ہوشی کے وہ مجھکو نظر آیا   کہ اتنا بھی نہ آیا ہوش جو پوچھوں کدھر آیا
گلی میں اس کی میں کس کس توقع پر گیا لیکن   نہ دیکھا جاکے واں اس کو تو آہ سرد بھر آیا

دل لگاتے تو لگایا یہ نہ تھا کچھ معلوم   جی پہ کیا گذرے گی اور جان پہ کیا ہووے گا
بے قراری میں کٹی رات تو یہاں اپنی تئیں   چین سے زلف میں دل کیونکہ رہا ہووے گا

اک بار اس کے کوچہ میں جانا ضرور ہے   یہ حال اپنا اُس کو دکھانا ضرور ہے

(۱) چپکا (ن خ)

مدت سے تیرے طالب دیدار ہیں صنم　　کھڑے سے ٹک نقاب اٹھانا ضرور ہے

وہ ہلال ابرو نکل کر بام سے جاتا رہا　　اک[1] جھلک دکھلا کے مجکو شام سی جاتا رہا
گل کے آنے کی خبر بھی اب صبا لاتی نہیں　　موسم گل شاید اس ایام سے جاتا رہا

مزا ہووے ابھی گر وہ ادھر ادھر سے آ نکلے　　کچا ید ھرسے گلا نکلے کچھ ادھر سے گلا نکلے
نہ وہ آتا ہے میرے ہاں نہ میں جا سکتا ہوں اس تک　　دل ناشاد کی حسرت کہو کیونکر بھلا نکلے

رباعی

آئے ہیں عدم سے چپکے روتے ہیں پڑے　　دو دن کی یہ زیست ہے سو کھوتے ہیں پڑے
اے خلق خوش احوال انھوں کا جو وہ　　آرام سے زیر خاک سوتے ہیں پڑے

خلیق (۳)

میر محسن خلیق برادر خورد میر حسن نیز از شانزدہ سالگی شوق شعر پیدا کردہ چیزے بخیال خویش موزوں می کرد و درست و نادرستش را والد بزرگوارش برائے پاس خاطر پسر درست کردہ میداد اما آنہم در عالم خوردی زیادہ از ذہنش معلوم می شد۔ چوں در آں ایام فقیر تازہ وارد ایں شہر بود و شائز الیہ بعد ملاقات چند بسیار محظوظ شدہ[2] برائے از دیاد بنائے خلت و وداد آں عزیز را پیش من فرستاد و آموختہ کرد کہ ایشاں دریں فن نظیر ندارند[3] اکنوں کہ فرصت وقت است تا میتوانی چیزے از ایشاں بیاموز۔ مومی الیہ اتقیاد امر والد ماجد را واجب شمردہ برہنمونی شوق روزافزوں اکثر حاضر می باشد و مشورہ شعر از من میگرفت۔ بندہ مناسب طبعش شعر دریافتہ در ہماں ایام گفتہ بودم کہ اگر زمانہ

(۱) یک (ن خ) (۲) بعد شدہ "نقطہ بود" (ن خ) (۳) بے نظیر اند و نظیر ندارند (ن خ)

فرصت خواہد داد خوب خواہد گفت۔ از وست۔ (اشعار ایام خوردی۔ ر)

جس گھڑی تم کو نہیں پاتے ہیں ہم
جی ہی جی میں اپنے گھبراتے ہیں ہم
سر جھکا لیتا ہے لالہ شرم سے
جب جگر کا داغ دکھلاتے ہیں ہم

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا
تھا ستارا کہ آسماں سے گرا
آتشِ گل پہ جل کباب ہوا
رات بلبل جو آشیاں سے گرا
شیشۂ دل تو⁽¹⁾ چور ہو جاتا
کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا
میں نے آنکھوں سے لے لیا اُس کو
پھول جو دست باغباں سے گرا
ہنس دیا یار نے جو رات خلیق
کھا کے ٹھوکر اُس آستاں سے گرا

کہا جو میں نے اسے گل کچھ وفا کر
تو وہ ہیں ہنس پڑا وہ کھل کھلا کر

نزع میں گر مری بالیں پہ تو آیا ہوتا
اس طرح اشک میں آنکھوں میں نہ لایا ہوتا
میرے خورشید نہ ہوتا یہ مرا روز سیاہ
تو نے گر زلف میں مکھڑا نہ چھپایا ہوتا
باغ جنت میں بھی کیا خوب گذرتی میری
وہاں بھی سر پر جو تری زلف کا سایا ہوتا
ناصحا چاکِ گریباں کے سلانے کا حصول
چاک آنکھوں کا مری تو نے سلایا ہوتا
پھول پڑتا نہ خلیق آتشِ گل سے اس پر
آشیاں ہم نے تنک اونچا جو بنایا ہوتا

گر بُرا مانے نہ تو کہدوں کہ کیا تجھ میں نہیں
اور سب باتیں ہیں لیکن اک وفا تجھ میں نہیں
بے مروت ہو تو کیا جانے تو ظالم کیا کرے
اس مروت پر تو پاسِ آشنا تجھ میں نہیں

---

(۱) جو (ن خ)

کل جو جا بیٹھا میں اسکے پاس اٹھ کر اخلق ‏ ‏ رک کے بولا آدمیت اک ذرا تجھ میں نہیں

کمر باندھی ہے ہر قندق نے تیری دلربائی پر ‏ ‏ تصدق جان میری اس تری دستخائی پر

حرف الدّال

(۱) درد

خواجہ میر درد تخلص خلف الرشید شاہ محمد ناصر مصنف کتاب نالۂ عندلیب در عہد فردوس آرامگاہ سپاہی پیشہ بود۔ آخر آخر ترک روزگار کردہ بر سجادۂ درویشی نشستہ در علم و فضل یگانۂ روزگار است۔ گاہے در تمام عمر از شاہجہاں آباد باوجود چندیں تفرقہ کہ عالمے را ازاں دیار طیوفتاں آوارۂ اطراف وجوانب ساختہ پائے بیروں نگزاشتہ چوں در علم موسیقی ہم مہارت تام داشت اکثر از استادان ایں فن بوسیلۂ بیعت حاضر مجلس او می گشتند۔ اگرچہ سلسلۂ آں بزرگ نقشبندیہ است اما واردات درد کہ نسخۂ الیست مختصر از تصنیف او برائے ہدایت مریدان خویش حرمت غنا را بطوریکہ مست گذاشتہ باوجود[1] دکہ گاہ گاہے مرتکب ایں امر می شد گناہ آں بر ذمہ خود گرفتہ طلب آمرزش از ایزد بیہال خواستہ۔ تا مرغ روحش زمزمہ سنج باغ ہستی بود در ہر ماہ بتاریخ دویم بر قرار پدر خود مجلس غنا ترتیب میداد۔ آں روز ہمہ خورد و بزرگ شہر حاضر مجلس او می شدند مغنیان چابکدست و بین نوازان بے کاسہ مست دادِ قانون نوازی و نغمہ پردازی میدادند بعد سہ پاس[2] روز مجلس برخاست می شد۔ غرضکہ جامع جمیع فنون غریبہ بود و در فقر و توکل و استغنا نظیر نہ داشت۔ شمۂ بیان بے پروائیش اینکہ روزے حضرت ظل سبحانی

---

(۱) خود کردن نخ (۲) بعد "روز" "رفتہ" دن نخ

برائے زیارت ایشاں آمدہ بودند بعد نشستن در مجلس عذر در میان آوردہ آمدگی یارا دراز ساختند۔ مشارٌالیہ از مشاہدۂ ایں حال منغض شدہ ایں قاعدہ را خلاف معمول دانستہ خود ہم بطرف بادشاہ پا دراز ساخت۔ علم الکتاب از تصنیف او بر صفحۂ روزگار یادگار است۔ و شعر ہندیش از بس شہرت تمام مشہور ہر دیار۔ اگرچہ شعر فارسی ہم دارد فقیر تا کہ در شاہجہاں آباد بود بعد سالی دماہی پیش آں بزرگ بے غرضانہ می رفت۔ یک سال است کہ در دہ عوریش شفا یافتہ و بہ شافی علی الاطلاق واصل گشتہ۔ از کلام اوست۔

مژگان تر ہوں یا رگ تاک بریدہ ہوں | جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں
ہر شام مثل شام رہوں ہوں سیاہ پوش | ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں
اے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے | میں غمزدہ تو قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

جاؤں میں کدھر جوں گل بازی مجھ گردوں | جانے نہیں دیتا ہی ادھر سے نہ ادھر سے

نزع میں تو ہوں وے تیرا گلا کرتا نہیں | دل میں ہی وہ ہی وفا پر جی کہا کرتا نہیں
عشوہ و ناز و کرشمہ ہیں سبھی جاں بخش لیک | درد مرتا ہی کوئی اس کی دوا کرتا نہیں

کہیں ہوا ہی سوال و جواب آنکھوں میں | یہ بے سبب نہیں ہم سی حجاب آنکھوں میں

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں | زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

نزع میں ہوں پہ وہی نالہ کئے جاتا ہوں | مرتے مرتے بھی ترے غم کو لئے جاتا ہوں

کچھ کام نہیں وہ بتِ خود کام کہیں ہو　　پر اس دلِ بے تاب کو آرام کہیں ہو

ہر طرح زمانہ کے ہاتھوں ہوں ستمدیدہ　　گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ
اے شورِ قیامت رہ اودھر ہی میں کہتا ہوں　　چونکے ہے ابھی یہاں سے کوئی دل شوریدہ
اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں　　ادھر کو نگہ کوئی پھینکو ہو تو دزدیدہ
مجھ پر بھی یہ عقدہ ٹک تو کھول صبا اے　　زلفوں سنے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ
بدخواہ سبھی عالم گو ہو دیں تو ہوں لیکن　　یارب نہ کسی کے ہوں دشمن دل و دیدہ
کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ　　اے درد ترا تو یہ ہر مصرعۂ چسپیدہ

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے　　اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
اے گل تو رخت باندھ اٹھاؤں میں آشیاں　　گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے
کچھ اور کنجِ غم کے سوا سوجھتا نہیں　　آتا ہے یاد جب کہ وہ کنجِ دہاں مجھے

ہم چشمی ہے وحشت کو مری چشمِ شرر سے　　آتی ہے نظر پھر وہی غائب ہو نظر سے
اے ہموطنان آپکے یہ غربت زدہ کیوں ہیں　　پھرنے کا نہیں عمر کی مانند سفر سے

گر باغ میں خنداں وہ مرا لب شکر آوے　　گل سامنے داماں سے منہ ڈھانپ کر آوے
قاصد سے کہو پھر خبر اودھر ہی کو لیجاوے　　یاں بے خبری آگئی جبتک خبر آوے
کہتے ہیں کہ یکدست تری تیغ چلی ہے　　تب جانئے جب یک دو قدم چل ادھر آوے

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا　　بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
اذیت مصیبت ملامت بلائیں — ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھکو داغوں نے سرو چراغاں — کبھی آ کے تو نے تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے — ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

تو ہی نہ اگر ملا کرے گا — عاشق پھر جی کے کیا کرے گا
کہتے ہیں یہ تیرے ڈھنگ ظالم — دیکھیں تُگے کوئی دفا کرے گا

لیتا نہیں کبود کی اپنے عناں ہنوز — پھرتا ہے کس تلاش میں لے آسماں ہنوز
ہے بعد مرگ بھی یہی آہ و فغاں ہنوز — لگتی نہیں ہے تالوسے میری زباں ہنوز
سو سو طرح کی ہجر میں ہوتی ہے جاں کنی — مرتا نہیں ہوں تو بھی تو میں سخت جاں ہنوز

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں — جان سے اپنی جو کوئی کہ گذر جاتے ہیں
موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے — مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
آہ معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز — لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں
تا قیامت نہیں مٹنے کا دل عالم سے — درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

ربط ہے ناز بتاں کو تو مری جان کے ساتھ — جی ہے وابستہ مرا ان کی ہر اک آن کے ساتھ
اپنے ہاتھوں کے بھی میں زور کا دیوانہ ہوں — رات دن کشتی ہی رہتی ہے گریبان کے ساتھ
درد ہر چند میں ظاہر میں تو ہوں مور ضعیف — زور نسبت ہے دلے مجھکو سلیمان کے ساتھ

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظر میں
ہوتی ہے بت پرستی اب تو خدا کے گھر میں

اگر میں نکتہ رسی سے ترا دہاں پاؤں
کمر کو جاہوں تو اُس کے تئیں کہاں پاؤں
یہ رات شمع سے کہتا تھا در تہ پروانہ
کہ حالِ دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں

جی میں ہے سیر عدم کیجے گا
یک بیک خلق سے رم کیجے گا
مورد قہر تو یہاں ہم ہی ہیں
اور کس پر یہ کرم کیجے گا
سخت بیباک ہے یہ خامۂ شوق
اپنے ہاتھوں کو قلم کیجے گا

تو اپنے دل سے غیر کی اُلفت نہ کھو سکا
میں چاہوں غیر کو سو یہ مجھ سے نہ ہو سکا
دشت عدم میں جا کے نکالوں گا جی کا غم
کنج جہاں میں کھول کے دل میں نہ رو سکا
گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو در گذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

رسوائیاں اٹھائیں جور و عتاب دیکھا
عاشق تو ہم ہوئے پر کیا کیا عذاب دیکھا

دنیا میں کون کون نہ یک بار ہو گیا
پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے جو گیا
پھرتی ہے خاک میرے لئے در بدر صبا
اے چشم اشکبار یہ کیا تم کو ہو گیا

ناصح میں دین و دل کے تئیں ہاتھ کھو چکا
حاصل نصیحتوں سے جو ہونا تھا ہو چکا

ایک تو ہوں شکستہ دل، تسپہ یہ جور اور جفا
سختیِ عشق واہ واہ، جی نہ ہوا اتم ہوا

اس کو سکھلائی یہ جفا تو نے
کیا کیا اے میری وفا تو نے

بیکسی کو عبث کیا بے کس
قتل کر مجھ کو کیا کیا تو نے

دردؔ کوئی بلا ہے شوخ مزاج
اُس کو چھیڑا بُرا کیا تو نے

فرصتِ زندگی بہت کم ہے
مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

نہ ملیں گے اگر کہے گا تو
تیری خاطر ہمیں مقدم ہے

دردؔ کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہی رونا ہے نت وہی غم ہے

نہیں کچھ محتسب سے جان کا مجھکو تو اندیشہ
کہیں ایسا نہ ہووے ہاتھ سے وہ چھین لے شیشہ

جگر پہ داغ نے میرے یہ گل فشانی کی
کہ اُس نے آپ تماشے کو مہربانی کی

مراد جی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے

تمنا تری ہے اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

کیا سیر سب ہم نے گلزارِ دنیا
گلِ دوستی کی عجب رنگ و بو ہے

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پہ
جدھر دیکھتا ہوں وہی رو برو ہے

صورتیں کیا کیا ملیں ہیں[1] خاک میں
ہے دفینہ حسن کا زیرِ زمیں

---

(۱) میں (ن خ)

درد درویش ہوں مری تعظیم ‌ ‌ ‌ ‌ کرتے ہیں لوگ کہہ کے یا اللہ

(۲) داغ

میر مہدی داغ کہ پیش ازیں آہ تخلص میکرد پسر میر سوز جوان ملیح وخوش رو ی دخوشخو بود با وجود شاہدی قدم درراہ شاہد پرستی گذاشتہ بر زنے اہل سوق وارفتہ بود غافل ازیں کہ فراق ایں قوم فریبندہ اگر آدم را بہ کشتن دہد سر موئے رحم بحالش نکنند۔ قضائے کار بعد از انقضائے چندے مہاجرت در پیش آمد۔ خو کردہ وصال تاب جدائی نیاوردہ بر بستر بیماری افتاد۔ دریں اثنا خطی از مطلوب رسید، ایام وفاتش قریب رسیدہ بودند کہ در خط جواب ایں شعر حسب حال خود نوشتہ رواں کرد و بعد آں جان شیریں بہ جاناں سپرد۔ شعر ایں است ؎

ازجاں رمقے بود کہ مکتوب تو آمد ‌ ‌ ‌ ‌ دیگر چہ نویسم خبرم خوب گرفتی

ازوست۔

رباعی

یہ چاہ نہیں بھلی بری ہوتی ہے ‌ ‌ ‌ ‌ جی لیتی ہے دوستی بری ہوتی ہے
کلتاہی نہیں ہے جی کہیں اس بن آہ ‌ ‌ ‌ ‌ سچ کہتے ہیں یہ لگی بری ہوتی ہے

حرف الذال

(۱) ذوقی

شاہ ذوقی، ذوقی تخلص، درویشی است خانہ بر دوش۔ بشعر را لطور بازاریان می گوید۔ ازوست۔

جلد آ مل جو تجھ کو آنا ہے ورنہ کوئی دم کو دم روانا ہے
تجھ کو ڈھونڈے کوئی کہاں فوقی نہ ترا ٹھور نا ٹھکانا ہے

اُس کا شکوہ نہ گاہ کیجے گا جس طرح ہو نباہ کیجے گا
اپنی یہ چاہ اُس کی وہ صورت اے عزیزاں نگاہ کیجے گا
اپنے ذوقی کے گھر میں شغل مَن گر کرم گاہ گاہ کیجے گا
اس کے دیوانہ پن کے عالم کو دیکھ کر واہ واہ کیجے گا

حرف الرّا

(۱) رضا

مرزا محمد رضا، رضا تخلص شاگرد مرزا محمد رفیع، صاحب دیوان است[1]۔

یہ یقیں ہے کہ اس کی موت آئی ہے جس کو ملتا ہے یار ہرجائی
ہجر کی رات کیونکے گذرے گی یہ تو ساتھ اپنے آفتیں لائی

یارب یہ آرزو کہیں پانے میں دل نہ جائے جب تک کہ یار آوے یہاں دم نکل نہ جائے
کس کس کا جور و ناز اٹھایا کرے یہ دل چھوٹے اگر ذرہ بھی آنکھوں کا بل نہ جائے

شام ہجراں گر نہ بیتابی کرے دل کیا کرے دمبدم ہوتی ہے آفت سر پہ نازل کیا کرے

---

(۱) از وست (۲) پانے

جواب یہاں سے تشریف لیجائے گا | یہیں بھی کبھی یاد فرمائے گا
یہ دل ہی رہا ہے ترے ساتھ پیارے | بھلا کس طرح اس کو بہلائے گا
چلا جب کہا میں نے کیا حال میرا(۲) | لگا کہنے تجھ کو بھی بلوائے گا
وہ ہرچند روٹھا ہے پر اس کو پیارے | یہاں تک کسی طرح سے لائے گا
رضا یہ زمیں ہے نہایت شگفتہ | غزل در غزل اس کو کہلائے گا
ترے در سے پیارے اگر جائے گا | بہت دل کے ہاتھوں سے دکھ پائے گا
نہ کہیے کہ عاشق نہیں جان دیتے | تماشا تمھیں یہ بھی دکھلائے گا
ستانا کسی کا نہیں خوب ہرگز | عزیزو یہ بات اس کو سمجھائے گا
سمجھتے ہو تم خوب غیروں سے ملنا | کئے کو بہت اپنے پچھتائے گا
کبھی اے عزیزو قدم رنجہ کرکر | ق اگر اس کے کوچہ تلک جائے گا
رضا مر چلا ہے جدائی میں تیری | مرا یہ پیام اس کو پہنچائے گا

(۲) رقت

مرزا قاسم علی رقت(۳)، قوم مغل ملقب بہ عراقی وطن اجدادش مشہد مقدس کہ شہر بزرگانش در خطۂ کشمیر ہم اقامت داشتند امّا مولدش شاہجہاں آباد است و در فیض آباد بسن تمیز رسیدہ طبعش از چہاردہ سالگی بطرف شعر میلان تام داشت۔ آخر گفتہ گفتہ پرگو شدہ در آں ایام مشق سخن از میاں قلندر بخش جرأت کردہ لیکن زبانش(۴) چنیں است کہ من از جعفر علی حسرت کہ استاد جرأت است استفادہ کردہ ام خیر ہرچہ باشد یک سلسلہ است عمرش سی سالہ خواہد بود۔ از دست۔

خط وہ بھیجے رقیب کا لکھا | یہ بھی اپنے نصیب کا لکھا

---

(۱) مل ان خ، (۲) تیرا ان خ (۳) رقت کے بعد لفظ تخلص ن خ، (۴) زبانیش ان خ

ہمارے سامنے مست ابر بار بار برس | جو ہم سے ہو سکے تجھ سے نہ ہو ہزار برس
جوان تم ہوئے نام خدا پہ رقت تو | گھٹا کے دیکھے ہو ابتک بھی تین چار برس

نہ کر گھمنڈ رقیب اُس سے گر ہوا اخلاص | کسی زمانہ میں ہم سے بھی تو نہیں تھا اخلاص

چھٹ جائے کسی سے نہ ملاقات کسی کی | اللہ بگاڑے نہ بنی بات کسی کی

و دلنے اس پہ سب نادان و دانشمند ہوتے ہیں | یہ عالم اُس کا دیکھا ہے کر رستے بند ہوتے ہیں

دیوارِ گل رخاں کا سایہ مگر پڑا ہے | زاہد بتا تو مجھکو طوبیٰ میں شاخ کیا ہے

(۳) رنگین

سعادت یار خاں رنگیں پسر طہماسپ بیگ خاں تورانی کہ مشارٌ الیہ در عہد نواب نجف خاں مرحوم اقتدار کلی داشت۔ جوان فہیدہ و سنجیدہ در فن سپاہ گری و سواری اسپ بے نظیر و در فکر سخن خامہ خیالش بلند خوش تحریر۔ ہر چند چنداں بہرۂ از علم ندارد اما ذکاوت طبعش بر صاحب علمان غالب۔ در ایام آغاز شوق شعر تا در دہلی بود شعر خود را از نظر شاہ حاتم علیہ الرحمۃ می گزرانید۔ حالا کہ بفضل الٰہی در نظم کلام ترقی و امتیاز تمام پیدا کردہ از راہ انصاف دیوانِ خود را از اول تا آخر بنظر مؤلف در آوردہ۔ کلامش بسیار کم اصلاح برآمدہ و چوں مزاجش عشقباز افتادہ اکثر قطعہائے خوب خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ نظم کشیدہ۔ ہمیشہ بحضور مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہٗ حاضر می باشد و تقرب و امتیاز تمام دارد۔ ایں کلام از دیوان اوست

ل تھا جو بسلا اپنی سو گذران چکے ہیں — جی نذر کریں جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں
ست چوک ادھر دیکھ یہ ہی مفت کا سودا — اک بوسہ پہ دین و دل و ایمان چکے ہیں
سو بار کہا آؤں گا اور آئے نہ ہرگز — یہ عہد ہو تم ہم تمھیں پہچان چکے ہیں
پھر چل، نہیں کچھ فائدہ بس سونے دے رنگیں — وہ منہ پہ دوپٹے کے تئیں تان چکے ہیں

یک بیک چونک کے وہ کہنے لگے رات نہیں — روک مت جانے دے گھر ہم کو یہ کچھ بات نہیں
اتھ میں ہاتھ ہی پر بوسہ نہیں لے سکتے — دست رس اتنی بھی ہرگز ہمیں ہیہات نہیں
رات دن یار تو رہتا ہی اُسی کے گھر میں — کون کہتا ہے کہ رنگیں پہ عنایات نہیں

قسمیں کروڑ جس نے ملنے کی کھائیاں ہوں — یہ سوچ ہی اب اس سے کیونکر صفائیاں ہوں
نرگس کو وہ چمن میں کیا بھر نگاہ دیکھو — وہ انکھڑیاں نشیلی جس کو خوش آئیاں ہوں

مجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہی — مجھکو تنہائی میں بہر دل خفقان رہتا ہی
شکوہ ہم کرتے ہیں کیوں رسم ہی دنیا کی یہی — دل جو لگتا ہے تو پھر پاس کہاں رہتا ہی
جو ترے پاس سے آتا ہی میں پوچھوں ہوں یہی — کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہی
پنکھڑی گل کی جو کروٹ تلے دب سکے آئے — نازک اتنا ہی بدن اس کا نشاں رہتا ہی
اُس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا ق — کوئی رنگین بھی ترے کوچہ میں یاں رہتا ہی
تو کچھ اک تاؤ سا کھا چیں بہ جبیں ہوکے وہیں — گالی دے کر یہ کہا اُس نے کہ ہاں رہتا ہی

اپنی ہر اک مژہ سے اشک جھڑتے ہیں تو قاش ہے — لوگ چھڑکتے ہیں گلاب جیسے گلاب پاش سے
تجھ کو جو چاہتے ہیں یار کیوں نہ وہ کشتنی بھلا — نکلا ہی تیغ بدل کے تو آج غضب تراش سے

دیکھا نہ آنکھ بھی اٹھا مان کے غیر کا کہا
دامن اٹھا گذر گیا بچ کے ہماری لاش سے

مجھکو جو گالی دیتے ہو کیا یہ کچھ بھلمنسائی ہے
کون تھا وہ استاد تختی تم کو جس نے پڑھائی ہے

نشہ حسن نے جس وقت وہ مخمور ہوئے
ہاتھ سے اُن کے کئی شیشہ دل چور ہوئے
بدگماں اتنا ہوں گذرے مجھے لاکھوں ہی خیال
تم جو نظروں سے مری ایک گھڑی دور ہوئے

اب ہم کو سفر دور کا درپیش ہے جانی
دے ہاتھ کا چھلا تو مجھے اپنی نشانی
خیاط نے دامن کا کیا گھیر زیادہ
ڈرتا ہوں کہ پریزاد کرے اُس کی گرانی
جل بل کے ہوا خاک ترے ہجر میں تو نے
افسوس کہ رنگین کی میاں قدر نہ جانی

جی بیچ کے یہ عشق کا جنجال خریدا
اُس جنس کو کھو ہم نے عجب مال خریدا

عبث ہے قصد دلا اس سے چاہ کرنیکا
نہ ہووے جس میں سلیقہ نباہ کرنے کا

تجھکو اپنے سے یار کرنا
ہے جبر کو اختیار کرنا

ایسے ظالم کو دل دیا ہم نے
آہ اللہ! کیا کیا ہم نے

دل ہو خون اور حنا کو بھاگ لگے
اس تری منصفی کو آگ لگے

باغ میں جس دم کہ تو چلتا ہے اے گل ناز سے
سرو کو کہتا ہوں میں ہٹ جا بلند آواز سے

بھلا کرنے آئے بُرا کر چلے
ہم آئے تھے کیا کرنے کیا کر چلے

جو کوچہ میں اُس نازنیں کے نہ ٹھیرے
تو پھر یہ کہو ہم کہیں کے نہ ٹھیرے

اے دستِ جنوں چل تو گریباں کی طرف بھی
اور جی میں ترے آئے تو داماں کی طرف بھی

شب کو جو آپ اُٹھ گئے نیند مری اُچٹ گئی
تارے ہی گنتے گنتے پھر رات وہ ساری کٹ گئی

غم سے تیرے یہ دلِ وحشی دیکھیں کب تک رہے
ہم سے تو در در یار دیکھیے کب تلک رہے

ہر صبح میاں رنگیں جمنا کے نہانے کو
کیا نیل کے کپڑے سے انسان نکلتے ہیں

میں نے چاہا جو اُس کو اے رنگیں
مجھ سے ہر ایک بدگماں ہوا
تو تتے جوڑتی ہے کیا کیا خلق
جی لگانا بلائے جاں ہوا

جب میں نے کہا کہ مجھ کو تم سے
ملنے کا ہے اشتیاق بے حد
یک بار وہ کھل کھلا کے رنگیں
بولے کہ چہ خوش چرا نہ باشد

(۴) رفافت

مرزا لکھن رفافت تخلص، شاگرد جرأت خوش خلق و خوش تقریر بود۔ بعمر بست و دو

سالگی بمرض دق درگزشت۔ ازوست۔

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی ۔۔۔ گر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی
واں کیونکے رہئے کہ منادی جہاں یہ ہو ۔۔۔ زانو پہ سر کو دھر کے نہ بیٹھا کرے کوئی
لے فرش گل پہ غیر کو بٹھاوہ اپنے پاس ۔۔۔ منظور ہے کہ خاک پہ لوٹا کرے کوئی
برسوں کی ایک دم میں رفاقت جو چھوڑ دے ۔۔۔ کیا ایسی زندگی کا بھروسا کرے کوئی

خوف سے تیرے نہیں بولتے اغیار سے ہم ۔۔۔ ورنہ بھڑ جانے کو موجود ہیں دو چار سے ہم

(۵) رضا

میر رضا علی طغرا نویس کہ رضا تخلص دارد اگرچہ در سلکِ شعرا نیست اما شعر تصنیفِ خود کہ رو بروئے ایں جانب خواندہ بسیار آبدار است۔ ازوست

ہدفِ یار جو کل سینہ کا صندوق ہوا ۔۔۔ تیر جو دل میں لگا سو لب معشوق ہوا

رہا عالم یہ شب (۱) اپنا کہ اس بن دل جو گھبرایا ۔۔۔ کبھو تکیہ پہ سر پٹکا کبھی پٹی سے ٹکرایا
یہ دام سبزہ رنگ اس مرغ دل کو آہ پھنسوایا ۔۔۔ سیہ بختی نے کیسا مجھکو باغ سبز دکھلایا

کچھ ان دنوں جو ایسا بے ربط ہو گیا ہے ۔۔۔ شاید رضا کو یارو کچھ خبط ہو گیا ہے

ستم زمانہ سے مجھ پہ یہ دن برے ایکبار ہی پڑ گئے ۔۔۔ وہ جو آشنا تھے سو لڑ گئے وہ جو دوست تھے سو بچھڑ گئے
کبھی آئے آکے خفا ہوئے جو گئے تو چلکے بلا لیا ۔۔۔ کبھی لیٹے لیٹے مچل گئے کبھی بیٹھے بیٹھے بگڑ گئے

---

(۱) "رہا یوں عالم شب اپنا اس بن دل جو گھبرایا" (ن خ)

مت پوچھو رضا کا کچھ حالِ غمِ تنہائی — اک دل تھا سو کھو بیٹھا اک سر ہے سو سودائی

ستم زمانہ سے مجھ پہ دن مجھے ایک بار ہی پڑ گئے — وہ جو آشنا تھے سو اڑ گئے وہ دوست تھے سو بچھڑ گئے
کبھی آئے آ کے خفا ہوئے جو گئے تو جا کے بلا لیا — کبھی لٹے لپٹے مچل گئے کبھی بیٹھے بیٹھے بگڑ گئے

رباعی

جس دل کو قلق نے آہ گھیرا ہوگا — آنکھوں میں پھر اس کی اک اندھیرا ہوگا
کیوں گرد سے اپنے تئیں بچاتا ہے رضا — اک خاک میں آخر ش بسیرا ہوگا

دیگر

گر غصہ یہ غصہ پوچھیں دل کھاوے گا — گھبرا گھبرا کے دم نکل جاوے گا
اُس شوخ کے غم میں آ کہا مان رضا — اتنا مت رو وگرنہ مرجاوے گا

جو یکبار بھی دیکھنے تجھ کو پاؤں — بلائیں میں لے لوں تصدق بھی جاؤں

(۶) رند

نواب مہربان خاں رند تخلص کہ در زمانۂ اقبالِ خود بہ علم موسیقی و شعر و مرثیہ شوق تمام داشت ہزار ہا دریں کار بر باد دادہ و در نیکنامی بر روئے خود کشادہ۔ اگرچہ شخص جاہل بود اما سلیقہ صحبت شعرا او را ہم بہ عرصۂ قلیل بہ مرتبہ والائے شاعری رسانیدہ فقیر حسب اتفاق رونے برائے دیدنِ آن بزرگ ہمراہِ مرزا قتیل در رستم نگر بر مکانش گزر انگندہ بود مخرج زبان ہم درست نہ داشت آخر ہمیں جادر گزشت۔ از وست۔

یارب کہیں سے گرمی بازار بھیج دے — دل بیچتے ہیں کوئی خریدار بھیج دے
دیتے ہیں عقدِ حسن میں عاشق ہر دو جہاں — آتا نہیں جو آپ تو تلوار بھیج دے

ہم کو نہ کچھ سیم و نہ زر چاہیے — لطف کی اک تیری نظر چاہیے
کس لئے تلوار خریدی میاں — باندھنے کو بھی تو کمر چاہیے

مجھکو صدقے تو یار ہونے دے آپ پر سے نثار ہونے دے
میری چھاتی پہ رکھ کے برچھی کو نہ اٹھا دل کے پار ہونے دے
ہی تری جان کا بھی دشمن رند اس دل کو خوار ہونے دے

(۷) رُسوا

آفتاب رائے رسوا۔ گویند جوہری پسرے بود از قید مذاہب برآمدہ سر سودا برآوردہ سیاہی تا بہ بر رو مالیدہ و در ڈولی نشستہ در کوچہ و بازار می گردید و تودۂ خرمہرہ پیش خود داشتی۔ عوض یک خرمہرہ یک سرخنگ از دست طفلان وغیرہ بخوشی تمام می خرید و نیز بہ شرب خمر مصروف بود و ایں بیت در زبان داشت۔ بیت

اس عاشقی کے پنتھ میں جس کا گذر ہوا رسوا ہوا خراب ہوا دربدر ہوا

نقل است کہ بمقتضائے شوریدہ سری چندے برائے سیر تا قصبۂ امروہہ آمدہ بخانۂ یکے از سادات آنجا فروکش شدہ۔ چوں در آں زمانہ باطراف و اکناف شاہجہاں آباد مردم شاہجہاں آباد را عزت بیشتر بود خصوصاً کسی کہ قابل و دانا باشد، صاحب خانہ رسم مہمانداریش بخوب ترین وجہی بجا می آورد۔ چوں موی الیہ بے شرب شراب یک ساعت آرام نمی یافت میزبان روزے یک طفل را برائے آوردن شراب بہ احمد نگر کہ محلہ بیرون شہر واقع شدہ فرستاد چوں آمدنش دیر کشید بایشاں گفت کہ بیائید تا شرب آیدانہ کے سیر باغ کنیم بدیہا از زبانش برآمدہ۔ شعر

لڑکا گیا شراب کو کاہے کی سیر ہو۔ ہم گذرے اس شراب سے لڑکے کی خیر ہو۔

دوستے نقل میکرد کہ ہرگاہ وقت رحلتش در رسید وصیت کرد کہ مرا بہ شراب غسل دہند چنانچہ دوستاں ہمیں کردند ہرگز کفن و میتش بوئے شراب نداشت۔ و در روایت دیگر چنیں است کہ بر جوہری پسرے کہ شیفتۂ او گردیدہ سودا بہم رسانیدہ بود، در سیر باغ از دست او بہ شمشیر کشتہ شدہ وَاللہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

از وست۔

وصل میں بے خود ہو اور ہجر میں بیتاب ہو　　　اس دوانے دل کو رسوا کس طرح سمجھائیے

کوئی جا نہیں زمین میں کہ اشکوں سے نم نہیں　　　رسوا ابھی اس زمانے میں مجنوں سے کم نہیں

حرف الزا

(۱) زار

میر جیون زار اصلش از کشمیر است و خودش در شاہجہاں آباد نشو و نما کردہ اکثر در مشاعرہ ہائے دہلی داخل صحبت می شد۔ جوانِ چیچک رو و شورش طلب است پیش ازیں سودائے ہم رسانیدہ بود۔ بندہ او را در دہلی و چہ در لکھنؤ مکرر دیدہ ام۔ عمرش از سی متجاوز خواہد بود۔ از دست

شب جھڑے آنسو ہیں یوں لخت جگر بھیگے ہوئے　　　گل جھڑیں شبنم سے جوں وقت سحر بھیگے ہوئے

موسم برسات ہی ساقی شتابی دے شراب　　　مینہہ میں آنکلے ہیں ہم بھی تیرے گھر بھیگے ہوئے

کس سے ہولی کھیل کر آیا ہے اے رشک بہار　　　رنگ میں کپڑے ہیں سارے تر بتر بھیگے ہوئے

ایک دن آ گئے ہی دنیا سے اٹھانا ہم کو　　　(۱) شب فرقت پہ الٰہی نہ دکھانا ہم کو

فصل گل کی کچھ ہوئی آمد جو اس دل کی تئیں　　　(۲) شور غل طفلوں کا اور دستِ جنوں جانے لگا

ایک تجھ کو زار کے احوال پر آیا نہ رحم　　　(۲) ورنہ ہر اک حال اس کا دیکھ غم کھانے لگا

---

(۱) ان نسخ دو میں اشعار اتا ۱۱ مظہر علی زار کے نام درج ہیں۔

حق نہ رکھے دور یار و یار کے تئیں یار سے (۴) کوئی مرض مہلک نہیں دنیا میں اس آزار سے
لا سکو اس کو تو اس سے اور کیا بہتر ہے آہ (۵) بات یہ بھی پوچھنے کی ہے بھلا تکرار سے
ان دنوں میں زار سچ کہہ کیا ہوا تیرے تئیں (٦) کچھ تجھے مغموم پاتا ہوں میں ان دو چار سے

یہ وہ ہے عشق لا مذہب نہ جس کا دین و ایماں ہے (۷) نہیں پوچھے ہے اتنا بھی تو کافر یا مسلماں ہے

لے جاؤ گے تم اُس کی گلی سے جہاں مجھے (۸) آرام جو یہاں ہے نہ ہوگا وہاں مجھے
فصلِ بہار تجھکو مبارک ہو عندلیب (۹) بن یار ایک سی ہے بہار و خزاں مجھے
بن دیکھے اُس کے ایک بھی دم آہ رہ سکوں (۱۰) اتنی تو ناصحا نہیں تاب و تواں مجھے
رہتی نہیں ہے ذکر کئے بن تو یار کا (۱۱) رسوا کرے گی زار یہ تیری زباں مجھے

زار ( )

میر مظہر علی زار بہ سرکار احمد علی خاں شوکت جنگ علاقۂ روزگار دارد گاہ گاہے خیال شعر کردہ میکند۔ ازوست۔

تیری ہی قسم تجھ بن کچھ اور جو بھاتا ہو (۱) کافر ہو اگر اس میں کچھ بات بناتا ہو

اب رہائی نے کیا اور پریشاں مجھکو (۲) خوب تھا اس سے وہی گوشۂ زنداں مجھکو

اگر کچھ بس ہی ہو اپنا تو کاہے کو یہ خواری ہو (۳) نہ چاہیں اس کو اے ناصح جو الفت اختیاری ہو
قسم ہے جی سے کہتا ہوں ستاؤ جس قدر چاہو (۴) خوشی اپنی بھی وہی ہے خوشی جس میں تمہاری ہو

---

(۱) ن خ میں اشعار ۱ تا ٦ میر جیون زار کے نام درج ہیں۔ (ن خ)

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں (۵) خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

وہ وعدہ وہ تپاک وہ اقرار ہو چکے (۶) بس دو ہی دن کے دیکھ لیا یار ہو چکے

(۳) زمان

سید محمد زمان زمان تخلص از سادات عالی تبار قصبۂ امروہہ جوان منحنی و بسیار قابل و قابل دوست بود۔ مومی الیہ در ایامیکہ نظر بہ بے وفائی دنیا کردہ[1] تبدیل لباس نمودہ در باغیچہ تنہا نشستہ می ماند۔ فقیر ہمراہ اُستاد خود رفتے در عالم کتب نشینی و ابتدائے شوقِ موزونی بہ صحبتِ ایشاں رسیدہ بود اگرچہ چنداں بخیال شعر سر و کار نداشت اما اگر گاہے چیزے موزوں مے کرد بسیار سنجیدہ چنانچہ ایں مطلعش دلیل بر ذکاوت طبع اوست۔

عارض ہر گل کا صاف و لیکن جھلک نہیں نرگس کی چشم ہے پہ کھُلی پلک نہیں

حرف سین

(۱) سائل

مرزا محمد یار بیگ سائل، قوم اُزبک ہندوستان زاد و سپاہی پیشہ، و در ابتدا شاگرد شاہ حاتم و بعد ازاں رجوع بہ مرزا محمد رفیع سودا کردہ۔ شخص کہنہ مشق است و ایں شعر او دلیل بر صدق ایں مقولۂ اوست۔

حاتم کی تو خدمت سے تھا فیض بہت مجکو سودا کی دے صحبت اکسیر نظر آئی

---

(۱) دنیا تبدیل لباس کردہ، دنیا کے بعد لفظ کردہ زائد ہے اور نمودہ کی جگہ کردہ ہے (ن نخ)

آشنائی کا تری مجکو گماں یوں ہیں ہے ‌ ‌ ‌ اس میں کچھ جھوٹ نہیں سچ ہو یاں یقین ہے

حرزِ جاں لیتے ہی اُس کی چشم نے ابرو کیا ‌ ‌ ‌ شیر کے ناخن کو گویا ہیکل آہو کیا
وہ حمائل ہو گیا دستِ شکستہ کی طرح ‌ ‌ ‌ آہ جس کو میں نے اپنا قوتِ بازو کیا

اٹھ گیا جب کہ تعین تو جہاں اپنا ہے ‌ ‌ ‌ جس جگہ بیٹھ گئے پھر وہ مکاں اپنا ہے

(۲) سوز

محمد میر سوز تخلص کہ بطرز خود اُستاد است و وضع خواندنِ شورش دیگرے راکم یاد[۱]۔ گویند اول میر تخلص میکرد چوں درآں ایام میر محمد تقی ہم شہرت بہ میر داشت لہٰذا ازآں درگزشتہ بجائے میر سوز قرار دادہ۔ کمالاتے[۲] ایں بزرگ ما درائے کمالِ شاعری و درویشی بسیار اند، چنانچہ در تیر اندازی و سواریِ اسپ و نوشتن خط نستعلیق و شفیعا و نازک بندی و نزاکت فہمیِ شعر و آدابِ صحبتِ ملوک و سلاطین و ظرافتِ طبع و خندہ روئی و ندامت پیشگی و تحصیلِ معاش و گفتن کلمۃ الخیر در حقِ دیگرے و با ایں ہمہ استغنائے مزاج کہ خاصۂ شعراست نظیر خود ندارد۔ گاہ گاہے کہ با فقیر ملاقات میشود بسیار مہربانی می فرماید و غائب و حاضر از[۳] ہیچ مدان حظ وافی بر داشتہ بے تکلف در ستایش دوستانہ می افزاید۔ عمرش از ہفتاد متجاوز خواہد بود حق تعالیٰ بایں شفقت بزرگانش[۴] دیرگاہ سلامت دارد۔ از دست۔

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے ‌ ‌ ‌ دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

---

(۱) "یاد" کا لفظ زائد ہے۔ (۲) کمالات۔ (۳) حاضر از مزخرفات ایں ہیچمدان۔ (۴) بزرگانہ سلامت دارد "ش" اور لفظ دیرگاہ ندارد (ن خ)

شبنم آسا گلشن دنیا میں آہ　　سوزؔ ہم با دیدۂ پُرنم گئے

کشورِ دل میں نہیں کوئی کہ آباد رہے　　یوں اجاڑا ہے اُسے تم نے بھلا یاد رہے

شہد میں جیسے مگس ہم حرص کے پابند ہیں　　وائے غفلت اس زنیہ نداں میں یعنی خرسند ہیں
رزق کا ضامن خدا، شاہد کلام اللہ ہے　　تو بھی اپنی صورتوں کے روز حاجتمند ہیں
مقبروں میں دیکھتے ہیں اپنی ہم آنکھوں سے روز　　یہ برادر یہ پدر یہ خویش یہ فرزند ہیں
تو بھی رعنائی سے ٹھوکر مار کر چلتے ہیں یار　　سوجھتا اتنا نہیں ہم خاک کے پیوند ہیں
جب تلک آنکھیں کھلی ہیں دکھ یہ کم دیکھے گا　　مند گئیں جب انکھڑیاں تب سوزؔ سب آنند ہیں

زندگانی میں کسے آرام حاصل ہووے گا　　ہائے آسودہ جہاں میں کونسا دل ہووے گا

تو ہم سے جو ہم شراب ہوگا　　عالم کا جگر کباب ہوگا
ڈھونڈے گا سحاب چھپنے کو مہر　　جس وقت[1] تو بے نقاب ہوگا

اہلِ ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہوگیا　　آہ یا رب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا

سُنے ہے سوزؔ! تو ملنے کا قصد مت کریو　　اُٹھا سکے ہے تو کب ناز بے دماغوں کا

مروت دشمنا، غفلت پناہا　　ادھر بھی دیکھ لیجو مُڑکے آہا

---

(۱) جس دن وہ بے نقاب ہوگا (ن خ)

کٹی اوقات سب بطالاں میں میری   خدا وندا، کریا، یا د تُنا ہا
صَرَفْتُ الْعُمُرَ فِی لَہْوٍ وَّ لَعِبٍ   فَآہًا، ثُمَّ آہًا، ثُمَّ آہًا

مجھے گر حق تعالیٰ عشق میں کچھ دسترس دیتا   تو دل ان بیوفاؤں کو کوئی میں اپنی بس دیتا
قسم ہے سوز گر وہ قتل کرتا اپنی آنکھوں سو   تو بھی دیتا ہوئے بھی صوت اُس کی تیکھ ہنس دیتا

رات آنکھیں تھیں مُندیں پر بخت ٹک بیدار تھا   تا سحر دل محوِ دیدارِ خیالِ یار تھا
سوز کیوں آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا میں تو   وھاں تجھے کیا تھی کمی یہاں تجھکو کیا درکار تھا

اگر کچھ سوز نے پایا تو میخانہ کی خدمت سے   حرم کے در پہ ورنہ بارہا سر مار مار آیا

غم ہے یا انتظار ہی کیا ہے   دل جو اب بیقرار ہی کیا ہے
وائے غفلت نہ سمجھے دنیا کو   یہ خزاں یا بہار ہے کیا ہے
قفس تن تو جل کے راکھ ہوا   آہ ہی شرار ہے کیا ہے
کچھ تو پہلو میں ہی خلش دیکھو   دل ہی یا نوک خار ہی کیا ہے
کھینچ کر تیر مار بیٹھے بس   سوز ہی یا شکار ہے کیا ہے

جس کا تو آشنا ہوا ہوگا   اُس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا
تھرتھراتا ہی اب تلک خورشید   روبرو تیرے آگیا ہوگا

بستیاں بستی ہیں اور اجڑے نگر آباد ہیں   وے کہاں جن کے جدا ہونے سے ہم ناشاد ہیں

مسی پر سرخی پان دیکھ میری عقل بھولی ہے — کہ ہے خورشید تاباں پہ ایسی شام پھولی ہے

امیدیں دل کی ساری ہی بھر آئیں میں نے آہ — اے سوز بعد مرگ تو اب مدعا ہے یہ
دامن کشاں وہ لاش پہ آکر مجھے کہے — ہے ہے کسو کے پیچھے ترستا ہوا ہے یہ

منہ لگانے سے مرے کیوں تو خفا ہوتا ہے — جان من بوسہ کے لینے سے تو کیا ہوتا ہے

پرکار کی روش چلے ہم جتنی چل سکے — اس گردش فلک سے نہ باہر نکل سکے
رونا بھی تھم گیا ترے غصہ کے خوف سے — تھی چشم ڈبڈبائی پہ آنسو نہ ڈھل سکے
منہ دیکھو آئینہ کا تیری تاب لا سکے — خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

یوں تو نکلی نہ مرے دل کی اپا ہے گا ہے[1] — اے فلک بہر خدا رخصت آہ ہے گا ہے
سوز سے ایک نے پوچھا کہ صنم سے اپنے — اب بھی ملتے ہو بدستور کہ گاہے گاہے
دیکھ کر منہ کو گھڑی ایک میں بھر کر دم سرد — یوں اشارت سے جتایا سر لاہے گا ہے

غم عاشق سے کون محرم ہے — محرم عشق خلق میں کم ہے
لخت دل مت نکل ابھی باہر — پیرہن اشک سے بھرا نم ہے
پھلجھڑی کی طرح سے جھڑتا ہے — اشک کا بھی تو زور عالم ہے
نتھ کے موتی پکارتے ہیں پڑے — تیرے عاشق کا ناک میں دم ہے
کیسی کیسی یہ باتیں کرتا ہے — سوز ہے یا کہ جان آدم[2] ہے

---

(۱) (ن) نہیں نکلے ہے مرے دل کی اپا ہے گاہے۔ (۲) عالم (ن خ)

چین نا دن ہی ان آنکھوں کو نہ شب آرام ہی ‏ شام سے تا صبح رونا صبح سے تا شام ہی
لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص عاشق ہے کہیں ‏ عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہی

کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا ‏ مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا

یہ چال یا قیامت، یہ حسن یا شرارا ‏ چلتا ہے کس جھمک سے ٹک دیکھیو خدا را
جوڑا لپیٹے جب تک روزِ حساب آخر ‏ بل بے تری بناوٹ اے خود نما خود آرا
غرفہ کو جھانکیو ٹک کیسی جھمک ہی اللہ ‏ یہ نور یا تجلی خورشید یا ستارا
کس کا یہ گورستاں تیرے شہید پیارے ‏ زیرِ زمیں سے اُٹھ اُٹھ کرتے ہیں بہرِ نظارا
پوچھے ہے مجھ سے سنیو عاشق کباب ہے کیا ‏ کچھ جانتا نہیں ہے بھولا بہت بچارا
اتنی جراحتوں پر جیتا ہی سوز اب تک ‏ سینہ ہی یا کہ ترکش دل ہی کہ سنگِ خارا

دامن تلک کو تیری کہاں دسترس مجھے ‏ تیری گلی کی خاک بھی ہوں تو ہوس مجھے
کیا آمدِ بہار ہے اس غل کو پوچھیو ‏ اے وائے سوجھتا نہیں چاکِ قفس مجھے

تو جو پوچھے ہے کہ تیرا دل تھا کس نے لیا ‏ بس حیا آتی ہی مجھکو مت لگا کس نے لیا

سرِشکِ شمع آخر شمعِ محفل ایک دن ہوگا ‏ یہ آنسو رفتہ رفتہ جمع ہو دل ایک دن ہوگا
تجھے اے دل بغل میں منتوں سے میں نے پالا تھا ‏ نہ جانا تھا کہ تو میرا ہی قاتل ایک دن ہوگا

آتا ہے وہ جفا جو تیغِ ستم کشیدہ ‏ دامن بدست چیدہ ابرو بہم کشیدہ

صورت گر قضا نے تجھ سا نہ کوئی کھینچا ہاں حسن ماہ کہئے سو ہے قلم کشیدہ

غرورِ حسن ہے تجھ کو تو مجھکو تمکیں ہے تو سنگدل ہو تو میری بھی آہ سنگیں ہے
اگر رحیم ہے تو میں بھی ایک عاصی ہوں جو تیغ زن ہو تو میری طرف سے تحسیں ہے
تو عشق ہو تو میں دل ہوں تو درد ہو تو میں سوز تو کوہکن ہے تو مجھ پاس جان شیریں ہے

رُباعی

بس سوز سنبھل یہ آہ و زاری کبتک بس ہاتھ نہ مل یہ بیقراری کبتک
آپ ہی عاشق ہو تو اور آپ ہی معشوق پردے سے نکل یہ شرمساری کبتک

(۳) سعادت

میر سعادت علی سعادت تخلص از سادات قصبہ امروہہ معاصر شعرائے ایہام گوئی محمد شاہی است شور البطر زیکہ در آں زمانہ رواج داشت بسیار بخوبی و تلاش می گفت۔ گویند روزے در مجلسی دردانہ نام رقاصہ رقص میکرد اتفاقاً کفش نوے ایشاں گم شد ہرگاہ از مجلس برآمد کفش را نیافت نظر افتاً بدیہہ از زبانش سرزد ایں شعر ؎

سعادت شب تماشے میں اگر تیرا نیا جوڑا گیا تو جانے دے دردانہ کے جوڑوں کے سر صدقے

بے محابا زلف کے کوچہ میں جاگا بار بار سر چڑھایا ہی بہت تم نے میاں شانے کے تئیں

(۴) سکندر

کہ در مرثیہ گوئی شہرت دارد شاگرد میاں ناجی است در ابتدائے فکر شعر بیشتر قصہ خوانی میکرد آخر آخر طبعش بطرف نظم مرا ئی مائل افتادہ۔ شخص دائم الخمر دخوش طبع وظریف

مزاج دیدش وطنش بطرفِ پنجاب است۔ عمرش از پنجاہ متجاوز خواہد بود اکنوں ہم گاہ گاہ فکر شعر بطور قدیم وجدید میکند۔ از دست۔

کبھی فرقت میں شب کو آنکھ میری گر جھپکتی ہے اسی دم روح کوچہ میں ترے جا کر بھٹکتی ہے
سحر گذرا چمن سے کونسا خورشید رو یارب کہ شبنم گل کے منہ پر اب تلک پانی چھڑکتی ہے
مبادا آگ لگ جاوے مرے دل کی ترے دلکو گلے لگنے سوا اس دل سوز کے چھاتی پھڑکتی ہے
کرے گی مجھکو دیوانہ سکندر یا کہ متوالا پری کی طرح صہبا پردۂ مینا سے تکتی ہے

گرا ہے مانگ میں دل میرا آہ ڈھونڈوں کدھر کہ آدھی رات ادھر ہے اور آدھی رات ادھر

نہ دیکھا ہو جو کسی نے حباب میں دریا وہ دیکھ لے مری چشم پر آب میں دریا

رباعی

اے زاہدو تم سے کیا جھگڑ کر لوں میں ناحق میں دل اپنے کو کروں کیوں خوں میں
میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے ہوں میں ہمیں میں جو کچھ کہ ہوں میں سو ہوں میں

(۵) سوزاں

مرزا[۱] احمد علی خاں شوکت جنگ المتخلص بہ سوزاں خلف نواب مرزا علی خاں مرحوم چوں باداب و امتیاز است طبعی رسا داد از دست۔

لیجا نہ شب فراق جاں کو کیا زندگی مجھ سے ناتواں کو
مجنونِ شکستہ پا ہے پیچھے کہدیجو پیام ساربان کو

---

(۱) نواب مرزا احمد علی خاں (ل، خ)

مت دل لگا بتوں سے کہنے پہ جا کسی کے ہرگز ہوئے نہ ہوں گے یہ آشنا کسی کے
خوبی ہے کیا ستمگر اس ہفتہ دوستی میں اپنا کسی کو کیجے ہو رہیے یا کسی کے
فرقت میں مر اس کی سوزاں ناحق کو جان دی ہائے اُس لا اُبالی کو غم مرنے سے کیا کسی کے

(۶) سر سبز

مرزا زین العابدین خاں عرف مرزا مینڈو سر سبز تخلص از فرزندان نواب سالار جنگ مرحوم جوانے است با علم و حیا و صاحب فہم و ذکا ہمتش اکثر اوقات بمطالعۂ کتب دینی و مسائل یقینی مصروف و برخلاف خاندان خود طبعش از غنا وغیرہ مجتنب سلسلۂ نسبتش در قوم مالک اشتر منتہی می شود و بزرگانش در عہد فرخ سیر بہ ہندوستان قدم گزاشتہ اند و برتبۂ عالی جاہی فائز شدہ ہمیشہ مقرب ملوک و سلاطین بودہ اند چوں مرزائے مذکور را بسبب موزونی طبع عشق شعر ہندی از طفولیت دامنگیر حال بود رفتہ رفتہ بسن ہفدہ سالگی رسیدہ دیوانے ترتیب دادہ فقیر پیش ازیں مدت چار سال بصیغۂ شاعری ملازم و رفیق ایشاں ماندہ بسیار بہ عزت دوست میداشتند۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ من کلامہ

قفس میں گذرے گی کیا عندلیب خستہ و بے پر نے گی جس گھڑی ہر آن نوں عالم گلستاں پر

شمع جب چہرۂ پر نور دکھاتی ہے مجھے یاد عارض میں ترے اور جلاتی ہے مجھے
خندۂ گل میں نکلتا ہے کہاں یہ عالم ہائے کیا وضع ترے ہنسنے کی بھاتی ہے مجھے
اُس کے کوچہ کی طرف میں تو نہ جاؤں سر سبز کشش دل ہے کہ کھینچے لئے جاتی ہے مجھے

جو دوست مرا اس کو پیغام سناتا ہے وہ صاف اُسے یار و دشنام سناتا ہے

دید کو تیری ہم جو آتے ہیں — سینکڑوں آفتیں اٹھاتے ہیں
بے تکلف تھے دل کے لینے تک — ہم سے اب آپ منہ چھپاتے ہیں
آپ ادھر کھینچئے علم شمشیر — ہم ادھر اپنا سر جھکاتے ہیں
ہر طرح اپنے یار کو سرسبز — روز اکبار دیکھ آتے ہیں

شب انتظار گذری ہیں انتظار کرتے — کبھی دوست دوست کرتے کبھی یار یار کرتے
ترا یار اس جگہ تھا نہ ہوا تو ہائے سرسبز — اگر اس گھڑی تو ہوتا تجھے ہم دوچار کرتے

بیٹھا ہوں میں تو کب سے سر راہ یار پر — کچھ تو نگاہ ٹک تو مرے انتظار پر
کیا حال گریہ پوچھے ہے ہمدم سرک کہیں — اب تو نچوڑ ہے مژۂ اشکبار پر
سرسبز ہو کے سینہ میں افسردہ رہ گیا — یہ کیا بلا پڑی دل امیدوار پر

یہ جو کانوں میں بتاں عقد گہر رکھتے ہیں — میرے آنسو ہیں کہ یکجا انھیں کر رکھتے ہیں

منہ موڑ لیا تم نے اگر مہر و وفا سے — ہم ہاتھ اٹھانے کے نہیں دست دعا سے
میں نے جو کہا اس سے کہ جاتی ہے مری جاں — منہ پھیر کے یوں کہنے لگا میری بلا سے

کل کبک دیکھ تیری رفتار مر گیا — رسوا ہوا کہ برسر بازار مر گیا
صیاد نے خبر بھی نہ لی اور قفس کے بیچ — سرکو ٹپک کے مرغ گرفتار مر گیا

---

(۱) کبھی (ن خ) (۲) دیکھ کر (ن خ)

ترے گلشن سے کہہ جاویں کدھر ہم | کہ ہیں اے باغباں بے بال و پر ہم
نہ گذرا تو کبھی ایدھر سے ہو کر | گئے اس آرزو ہی میں گذر ہم
ہماری آہ پر ہنستا ہے کیا تو | دکھاویں گے تجھے اس کا اثر ہم

جگہ پاویں گے اتنی باغ میں اے باغباں ہم بھی | کبھو آ کر بناویں گے چمن میں آشیاں ہم بھی
دماغ اپنا نہیں اس وقت اے خضر ہم کو مت چھیڑو | سناویں گے کسی دن تم کو اپنی داستاں ہم بھی
جہاں سے ہم صفیروں کو ہوئی بر خانہ ویرانی | اسی گلشن میں چھوڑ آئے تھے اپنا آشیاں ہم بھی

خبر لائی باد بہاری کسی کی | ود خنداں ہوئی بیقراری کسی کی
زلیخا کو یوسف ہی کا دھیان گذرا | جو اس رہ سے آئی سواری کسی کی
ترے ہاتھ سے بوئے مشک آئی شانے | مگر تو نے کاکل سنواری کسی کی
میں سر سبز روتا ہوں آتی ہے جب یاد | وہ صورت مجھے پیاری پیاری کسی کی

کب خوش آتی ہے ہمیں سیر گلستاں تجھ بن | نظر آتا ہے[1] چمن خانہ ویراں تجھ بن
خواب[2] میں ہی نظر آ جا کہ تسلی ہو مری | پر شوش ہوں میں اے زلف پریشاں تجھ بن
اپنے عاشق کی تو بالیں پہ نہ آیا صد حیف | جان دی اس نے بصد حسرت و ارماں تجھ بن
چل تو سر سبز گلستاں میں غزل خوانی کو | بولتے وہاں نہیں مرغان خوش الحان تجھ بن

( ) سلیمان

مرشدزادۂ آفاق مرزا احمد سلیمان شکوہ سلیمان تخلص کہ محامد ذات قدسی آں

---

(۱) آتشکدہ ہیں (ن خ) (۲) خواب ہی میں (ن خ)

مہر و زخشانِ آسمانِ جلالت و ماہِ فروزانِ برجِ ابہت از تحریر و تقریرِ اقلام و السنۂ فصحا و بلغا
مافوق است چوں بفضلِ الٰہی در جمیع فنونِ دانشمندی یگانۂ روزگار اند بمقتضائے موزونیِ
طبع کہ بادشاہانِ سلف را نیز بودہ است اکثر رخشِ خیال را در میدانِ فصاحت می تازند
و شعرِ خوب را از ہر کہ باشد دوست میدارند در ایامیکہ حکمِ ترتیبِ مجلسِ مشاعرہ شدہ بود
اکثرے از کاردانانِ ایں فن در حضور آمدہ حاضر می شدند۔ ایں فقیرِ حقیر ہم چوں نسبت
دیگراں باوصفِ گوشہ نشینی دریں کار زیادہ رسوائی داشت بگفتۂ میر انشاء اللہ خاں
حسب الطلبِ حضور باوصفِ کم بغلی و شکستہ حالی شریکِ مجلسِ یاران شدہ بود
چنانچہ در ہماں[1] تاریخ بحلقۂ[2] ملازمانِ حضور در آمد و بعد چندے از کلامِ فقیر محظوظ شدہ
در جائزۂ قصائدِ مدحیہ کہ مشتمل بر تہنیتِ عیدین بودند بانعامِ تبریک مکرر سر احقر را از
حضیضِ خاک باوجِ افلاک رسانیدند۔ و ہمچنیں قلندر بخش جرأت کہ پس از فقیر بعد سہ
چہار ماہ دولتِ ملازمتِ حضور حاصل نمودہ[3] بنوازشِ خسروانہ در آمدہ و نیز نوکر شدہ
و میر سوز کہ کسوتِ درویشی بقامتِ حالِ خود راست داشت در اوائلِ مشاعرہ
بانعامِ یک دوشالہ و یک ٹٹو سرفرازی یافتہ راہِ خود پیش گرفت و میر انشاء اللہ خاں
کہ نائب و مختارِ حضور یعنی خاں صاحب و قبلہ خان زاد خان بہادر کہ ایشاں در شعر
فہمی و نثر نویسی نظیرِ خود ندارند صیغۂ اخوت خواندہ اند۔ ہمیشہ موردِ گوناگوں الطافِ خسروی
می باشند و چند بار بانعامِ لائقہ قبا و گوشوارۂ سر مباہات برافراختہ اند حق تعالیٰ ایں
قدرشناس شعرا را کہ دریں زمانۂ دوں قدرِ سخن باخاک یکساں شدہ بر تختِ سلطنت و
جہانبانی زود مسلط گرداناد و مرادِ دلِ دولت خواہانِ حضور کہ شب و روز دست
بردعا دارند زود برآرد۔ آں زمان بیانِ داد و دہش ہمت عالی کردہ خواہد شد حالا
کلامِ معجز نظام حضرت نوشتہ می شود و آں ایں است۔

---

(۱) از ہماں ان نخ، (۲) در حلقہ ان نخ، (۳) کردہ ان نخ،

ہم تو کب آپ تلک آپ سے آسکتے ہیں　　آپ چاہیں تو ہمیں پل میں بلا سکتے ہیں
جبہ سائی کا نشاں جائے جبیں سے کیونکر　　کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں
دھار ہے بحر محبت کی سروہی کی سی　　بوالہوس اس میں کوئی آکے نہا سکتے ہیں
اپنے مکھڑے پہ دوشالہ وہ رکھیں گے تا چند　　کوئی خورشید کو پردے میں چھپا سکتے ہیں
تاج و تخت اپنے سلیمان کو یا شاہِ نجف　　آپ چاہیں تو ابھی پل میں دلا سکتے ہیں

دل اُس کے سینہ سے یوں لگ رہی ہے　　جڑا جوں دھگدُگی پر نگ رہی ہے
سلام شوق کہیو نجد میں جا　　صبا واں اک مرا ہم تنگ رہی ہے
ستاتی ہے مجھے واں ناتوانی　　جہاں سے اُس کا گھر دو ڈگ رہی ہے
یہ طفلِ اشک آنکھوں سے نکل کر　　مری چھاتی سے پھر دل لگ رہی ہے
ہمیں[1] خاتم نمط اُس کی سلیماں　　تلاشِ پائے بوسی سنگ رہی ہے

ساقیا ہے یہ جام کا عالم　　جیسے ماہِ تمام کا عالم
کبک رفتار اپنی بھول گئے　　دیکھ اُس کے خرام کا عالم
اب خدا پھر ہمیں نہ دکھلائے　　شبِ ہجراں کی شام کا عالم
تجھ پہ ہے ان دنوں میں نام خدا　　کچھ عجب دھوم دھام کا عالم

اوروں کی طرح سے اب نہ ٹالو　　ہم کو اپنے گلے لگا لو
گالی نہ دیا کرو کسی کو　　بس بس اپنی زباں سنبھالو
غرفہ میں سے جھانک پاس اپنے　　غیروں کو نہ ہنسی خوشی بلا لو

---

(۱) خاتم (ن خ)

اور ہم سے ہزار حیف پیارے — منہ کو شرما کے یوں چھپا لو
ہے قافلہ عمر کا روانہ — رخت اپنا مسافرو سنبھالو
بت خانہ کی راہ کو سلیماںؔ — چھوڑ دو تم اور رہِ خدا لو

گھر سے برقع جو الٹ وہ مہِ تاباں نکلا — چونک اٹھی خلق کہ اِس مہرِ درخشاں نکلا
مہ کو اور تجھکو جو میزانِ خرد میں تولا — اس سے تو حسن میں اے یار دو چنداں نکلا
رہ گئے ہوش دھواس و خرد و طاقت سب — یوں ترے کوچہ سے میں بے سر و ساماں نکلا
یہاں تلک تیر قضا کھائے ہیں میں نے[1] اس کے — جائے سبزہ مرے مرقد پہ نیستاں نکلا
تیرے بیمار کی سنتے ہیں یہ حالت ہے کہ اب — جو گیا اُس کی خبر کو سو وہ گریاں نکلا
واہ کیا توڑ تری تیر نگہ کا ہے کہ یار — جس کے سینہ میں لگا نیستے پیکاں نکلا
سوزشِ دل کو بھی میرے نہ بجھایا تم نے — کام اتنا بھی نہ اے دیدۂ گریاں نکلا
فتح دیکھو تو اے یا شہِ مرداں کہ ترا — ملک گیری کو جو ہے اب یہ سلیماںؔ نکلا

وہاں جو غیر سے وہ رات کو ہم کنار رہا — ہمارے دل کو یہاں سخت اضطرار رہا
نشہ میں رات یہ ساقی کا انتظار رہا — کہ صبح تک مجھے دردِ سرِ خمار رہا
قمارِ عشق میں اُس بت سے میں نہ کچھ جیتا — دل اک بساط میں تھا سو اسے بھی ہار رہا
یہ کس کے دستِ حنا بستہ یاد آئے میں رات — کہ تا بہ صبح مرے دل کو اک فشار رہا
نہ اس نے شرم کے مارے مری طرف دیکھا — میں اس سے رات کو ہر چند آنکھ مار رہا
کسی کے موتیوں کا ہار شب جو یاد آیا — تو تارِ اشک سحر تک گلے کا ہار رہا
تری جو زلف کو سونگھا کیا تو ساری رات — زبانِ شانہ سے سنتا میں بار بار رہا

---

(۱) اُس کی میں نے دن نخ،

شب فراق میں میں کیا کہوں سلیماںؔ آہ ۔ کہ کس(۱) طرح سے دل اپنا یہ بے قرار رہا

جب تیغ کو پکڑ وہ خونخواہ گھر سے نکلا ۔ تب میں بھی جان سے ہو بیزار گھر سے نکلا
ہر موکر کے سو سو بل پڑ گئے کمر میں ۔ ٹیکا جو باندھ کر وہ بلدار گھر سے نکلا
کشتہ کو تیرے در سے افسوس لے گئی گل ۔ اور تو نہ اک قدم بھی ملے یار گھر سے نکلا
چھوڑا نہ جب گریباں دستِ جنوں نے میرا ۔ تب چیر کر میں اس کو ناچار گھر سے نکلا
روزن سے اس نے اوپر مجھکو کھڑا جو دیکھا ۔ کھنکھار کر وہیں وہ عیار گھر سے نکلا
اس بت کے دیکھنے کو کر ترک دین و ایماں ۔ میں ڈال کر گلے میں زنار گھر سے نکلا
چہرہ دل پہ عاشقوں کے زردی سی پھر گئی تب ۔ جب باندھ وہ بسنتی دستار گھر سے نکلا
لوگوں کے خوف سے پھر کل شب کو میری خاطر ۔ لاچار پھاند کر وہ دیوار گھر سے نکلا
وہ شاہِ حسن میرے اس ملکِ دل پہ یارو ۔ جس دم کہ دوڑنے کو یلغار گھر سے نکلا
ق
کھول آہ کا(۲) علم اور لے اشک کے قشوں کو ۔ یوں میں بھی ہو کے اس دم تیار گھر سے نکلا
کچھ تو اثر کیا ہے دل کی ترے کشش نے ۔ پڑھتا جو وہ سلیماںؔ اشعار گھر سے نکلا

شب دل سے مری آہ کا شعلہ جو اٹھا گرم ۔ منقل کی طرح تا بہ سحر سینہ رہا گرم
سچ گرم، ہنسی گرم، نگہ گرم، ادا گرم ۔ تھمنے کی بھڑک اس کے ہیں ان سب سے لگو گرم
ہوں سوختہ میں آتشِ الفت کا طبیبو ۔ لکھیو نہ مرے نسخہ میں تم کوئی دوا گرم
گرمی کا یہ موسم ہے تو خس خانہ سے اپنے ۔ باہر نہ نکلنا کہ نہایت ہے ہوا گرم

جب کہ دیکھے ہی ترے طرۂ دستار کے پھول ۔ توڑ ڈالے ہی صبا باغ میں گلزار کے پھول

(۱) کہ جس طرح سے ۔ (ن خ)، (۲) کے (ن خ)

نرگستان میں تو کیا سیر کناں پھرتا ہے — ہو گئے آج ترے کشتۂ دیدار کے پھول
کون کہتا ہے یہ ہے عقد ثریا۔ مہ نے[1] — نقرئی پھینکے ہیں مجھ پر سے کئی وار کے پھول
میرے گلدستہ کو مت دے تو چھڑی سے تشبیہ — کہ یہ الفت کے ہیں گل اور وہ بازار کے پھول
گالیاں سینکڑوں ہر بات میں آپ دینے لگا — دیکھو جھڑتے ہیں کیا منہ سے مرے یار کے پھول
گر لگاوٹ نہیں منظور تو کیوں پھینکتے ہو — متصل بیٹھ کے تم رخنۂ دیوار کے پھول
رات چوٹی کے ترے دیکھتے ہی پھندنے کو — چونک اٹھا میں کہ ہے یہ منہ میں یہ مار کے پھول
چشم بد دور ادھر دیکھ ان آنکھوں پر سے — صدقے کر ڈالے تھے سو نرگس بیمار کے پھول
کس طرح یوں ہی بلائیں کروں کیونکر تعظیم — دست و پا اپنے گئے دیکھتے ہی یار کے پھول
ہاتھا پائی میں سلیمان وہ پری مجھ سے جو رکی[2] — میں نے بکھرا دیئے توڑ کئی ہار کے پھول

(۸) سودا

شیر بیشۂ سخندانی مرد میدان پہلوانی مرزا محمد رفیع المتخلص بہ سودا پسر مرزا محمد شفیع کابلی کہ در عصر خویش سر آمد شعرائے ریختہ گو گذشتہ۔ بعضے او را دریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش می کنند بعضی بہ سبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دہند، غرض ہر چہ بود در روانی طبع نظیر خود نداشت۔ غزلہائے آبدار و قصیدہائے سحر کار و ہجوہا و مثنویہائے متعدد و غیرہم نگاشتہ خامۂ خیالش بر صفحۂ روزگار یادگار است۔ دیوانش بہ فرنگ و صفاہان رسیدہ، دیگرے ایں شہرت در خواب ندیدہ۔ اگر در مثال بندی اشعار غزل صائب و قتش گویم بجا است و اگر در علو مراتب معانی ابیات قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست، حالا ہر کہ گوید پیرو و متبعش خواہد بود۔ فقیر در عہد

(۱) یہ شعر ندارد۔ (ن خ) (۲) لڑ پڑی (ن خ)

نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دیدن ایں بزرگ بخانہش رسیدہ بود بہ پرورش سگان ابریشم پشم شوق تمام داشت۔ و بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ وسلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آنہا نیز قادر۔ غرضکہ شخص جامع الکمالات بود ہر جا کہ می رفت عزت وحرمت تمام می یافت۔ نواب مرحوم ومغفور نیز بودن او را در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند۔ وفاتش در لکھنؤ ومرقدش در امام باڑہ آقا باقر۔ روزے درماہ محرم فقیر آنجا رفتہ بود کہ بہ ایمائے بزرگے[1] اتفاق زیارتش افتاد ونظر بر کتابہ فرش کردم درہماں تاریخ وفاتش گفتۂ میر فخر الدین ماہر کہ ہمدم وہم نشیں او بود کندہ دید۔ تاریخ اینست ؎

خلد کو جب حضرتِ سودا گئے ۔۔۔ فکر میں تاریخ کے ماہر ہوئے

یوں لکھی مصرعِ بدرکرِ ملک اُنادل ۔۔۔ شاعرانِ ہند کا سرور گیا

چوں تعمیۂ ایں تاریخ خلافِ قانونِ مورخان بود در خیال فقیر گزشت کہ چنیں شخص را تاریخ گوئے بایست آخر ہماں روز از تائید فیض ربانی تاریخ وفات آں مرحوم ومغفور بے کم وکاست از خامۂ خیال سحر کارِ مولف بیروں تراویدہ واز غایت انبساط وسرور کہ از موزونی ایں مصرعۂ فصیحہ مادہ تاریخ کہ کاملانِ ایں فن را بدشواری دست دہد خود طبیعت خود را ہزار آفریں گفتہ، آرے تاریخ چنیں شخص چنیں می باید۔ تاریخ۔

مرزا رفیع آنکہ ز اشعارِ ہندیش ۔۔۔ ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستان غلو

ناگہ چو در نوشت بساطِ حیات را ۔۔۔ گردید مدفنش ز قضا خاک لکھنؤ

تاریخ رحلتش بدر آورد مصحفی ۔۔۔ سودا کجا و آں سخن دلفریب او

من کلامہ۔ غزل سردیوان اوست۔

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا ۔۔۔ جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

---

[1] عزیزے (ن خ)

پردے کو یقیں کے در دل سے اٹھا دیکھ — کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ — جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا
اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار — لیکن نہیں خواہاں کوئی واں حسن[1] گراں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو — مضموں یہی[2] ہے جرس دل کی فغاں کا

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں
جس سے پوچھا میں دل خوش ہے کہیں دنیا میں — رو دیا اس نے اور اتنا ہی کہا کہتے ہیں

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — میری طرح فریفتہ ہو تجھ پہ خدا کرے
ظالم ہماری نعش کو تشہیر ہے ضرور — آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے

عجب بیداد مجھ پر یہ مرا صیاد کرتا ہے — دکھاتا ہے اُسے مجھکو جسے آزاد کرتا ہے

اے دیدہ خانماں تو مرا ہی ڈبو سکا — لیکن غبار یار کے دل کا نہ دھو سکا
سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

تصور میں ترے کہیو صبا اُس لاابالی سے — گلے لگ لگ میں رو دیا رات تصویر نہالی سے

---

(۱) حسن گراں دو نسخ میں بجنسہ "جنس گراں" ہونا چاہئے۔ (۲) مضموں یہی ہے دو نسخ

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی کہ عاشق کا دل بنا

جو گذری مجھ پہ اُسے مت کہو ہوا سو ہوا
بلا کشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مِرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

پہنچ چکا ہے سرِ زخم دل تلک یارو
کوئی سیو کوئی مرہم رکھو ہوا سو ہوا

کہے ہے سن کے مری سرگذشت وہ بیرحم
یہ کون ذکر ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا

خدا کے واسطے آ درگذر گنہ سے میرے
نہ ہوگا پھر کبھو اے تندخو ہوا سو ہوا

دیا اُسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا
پھر آگے دیکھئے جو ہو سو ہو ہوا سو ہوا

حالِ دل سے مرے جب تک وہ خبردار نہ تھا
جز دمِ سرد کوئی محرمِ اسرار نہ تھا

جو عمل چاہئے کیجے مرے دکھ دینے کا
وہ نہ کیجے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا

پیار و اشفاق و وفا مہر و محبت الطاف
دل کو جس روز لیا کون سا اقرار نہ تھا

صحبتوں کا نہ کرو غیر کی مجھ سے اخفا
کونسی شب تھی کہ میں ہاں پسِ دیوار نہ تھا

شب تری بزم میں سودا کو میں دیکھا جب تک
کچھ خموشی کے سوا اس کو سروکار نہ تھا

میں دشمنِ جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا
سو حضرتِ دل سلمہ اللہ تعالیٰ

کہتا ہے نگہ سے یہ ترا گوشۂ ابرو
دیکھے جو کوئی خون گرفتہ تو لگا لا

اتنا ہے تو یوسف سے مشابہ کہ عدم سے
پردہ میں چھپا اُس کے تئیں تجکو نکالا

سودا گرفتہ دل کو نہ لاؤ سخن کے بیچ
جوں غنچہ سو زباں ہیں اُس کے دہن کے بیچ

پانی ہو بہہ گئے مِرے اعضا بدن کی راہ
باقی ہے جوں حباب نفس پیرہن کے بیچ

جس نے نہ دیکھی ہو شفقِ صبح کی بہار — آکر ترے شہید کو دیکھے کفن کے بیچ
کل رخصتِ بہار تھی شبنم صفت میں زور — رویا تر ایک گل کے گلے لگ چمن کے بیچ
سودا میں اپنے یار سے چاہا کہ کچھ کہوں — ایسی کی اک نگہ کہ رہی من کی من کے بیچ

یہ ہاتھ ہو سکے زلف اُس کی سے کہاں گستاخ — نسیم و شانہ اگر ہو تو ہووے وہاں گستاخ
ضرور ہے ادبِ خفتگانِ خاک اے یار — قدم زمیں پہ نہ رکھ زیرِ آسماں گستاخ

شبنم کرے ہے دامنِ گل شست و شو ہنوز — بلبل کے خون کا نہ گیا رنگ و بو ہنوز
ہمرہ صبا کے خاک بھی میری ہے دربدر — جاتی نہیں ہے مجھ سے تری جستجو ہنوز

قد کو ترے جس جگہ مشقِ خرامِ ناز ہے — اُس جگہ شورِ قیامت فرشِ پا انداز ہے
خط کے آتے ہی چلے اکثر غلامی سے نکل — بندہ پرور دیکھئے آگے ہنوز آغاز ہے
شاعرانِ ہند کا تو گو کہ پیغمبر نہیں — پر سخن کہنے میں اے سودا تجھے اعجاز ہے

کیا جانئے کس کس سے نگہ اس کی لڑی ہے — جس کوچہ میں جا دیکھو تو اک لوتھ پڑی ہے
ٹھیرا ہے تری چال میں اور زلف میں جھگڑا — ہر ایک یہ کہتی ہے کہ لٹک مجھ میں پڑی ہے
گو پیر ہوئی شاعری سودا کی جوانو — تم سے نہ کھنچے گی یہ کماں سخت کڑی ہے

شو(د) جوں شمع نہیں گرمیِ بازار مجھے — ہوں میں وہ جنس کہ آتش دے خریدار مجھے
ہے قسم تجھکو فلک دے تو جہاں تک چاہے — جلوۂ حسن اُسے حسرتِ دیدار مجھے
ہوں تصدق ترے اے عالمِ فانوسِ خیال — گو تحیر نے کیا صورتِ دیوار مجھے

اے غم یار مرا خون جگر کتنا کچھ
نظر آتی ہے فراخور تری دشوار مجھے
نہ پھرا ملک عدم سے کوئی یار لے سودا
جانا اب اُن کی خبر لینے کو لاچار[1] مجھے

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

نہ بھول اے آرسی گر یار سے تجھ کو محبت ہے
بھروسا کچھ نہیں اس کا یہ منہ دیکھے کی الفت ہے

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کیا ضد ہے خدا جانے مجھ ساتھ وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

اس دل کی تف آہ سے کب شعلہ بر آوے
بجلی کو دم سرد سے جس کی حذر آوے
تک داغ سے چھاتی کے سرک جائے جو پھاہا
آتش کے تئیں قدرت خالق نظر آوے
دے شکوہ کی رخصت جو ہمیں شرم محبت
غنچہ کی طرح ٹکڑے ہو منہ تک جگر آوے
افعی کی یہ طاقت ہے کہ اُس سے بسر آئے
وہ زلف سیہ اپنی اگر لہر پر آوے
سب کام نکلتے ہیں فلک تجھ سے ولیکن
میرے دل ناشاد کی امید بر آوے
نامہ کا جواب آنا تو معلوم ہے اے کاش
قاصد کے بد و نیک کی مجھ تک خبر آوے
دیتا ہے کوئی مرغ دل اُس شوخ کو سودا
کیا قہر کیا تو نے غضب تیرے پر آوے
اب لے تو گیا ہے پہ اسے دیکھیو نادان
پل میں وہ اڑا آنہ اگر بال و پر آوے

اے آہ تیری قدر اثر نے تو نہ جانی
گو تجھ کو لقب ہم نے دیا عرش مکانی

---

(۱) ناچار (ن خ)

کیا کیا ملے لیلیٰ نشان خاک میں سودا   گو اپنے ملی محبوب کی دیکھی نہ جوانی
جس سمت نظر موجِ سراب آوے تو یہ جان   ہووے گی کسو زلفِ چلیپا کی نشانی

بھر نظر تجھکو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے   حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

نہیں معلوم کیا اس سینہ میں جوں شمع جلتا ہے   دھواں نوک زباں سے بات کرنے میں نکلتا ہے
مجھے تشنیع گو کرتا ہے ناصح یہ جو آنکھیں ہیں   پر ان خانہ خرابوں سے کسو کا کچھ بھی چلتا ہے
خبر لے جلد سودا کی وگرنہ میں یہ دیکھوں ہوں   سرہانے اس کے بیٹھا ہاتھ سے تو ہاتھ ملتا ہے

صورت میں تو کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے   اک دھج ہے کہ وہ قہر ہے آفت ہے غضب ہے
دشنام تو دینے کی قسم کھائی ہے لیکن   جب دیکھے ہے مجھکو وہ تو اک جنبشِ لب ہے
یعقوب ترے عہد میں یوسف کو جو روتا   کہتا میں کہ یہ فہم پیمبر سے عجب ہے
کہتے ہیں جسے عشق سو وہ چیز ہے سودا   جوں ذاتِ خدا جس کا حسب ہے نہ نسب ہے

جب اپنے بندِ قبا تم نے جان کھول دئے   صبا نے باغ میں جا گل کے کان کھول دئے

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے   یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے
اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوج اشک   لخت جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

عارض پہ حسن خط سے دمک کیا ہے نور کی   یہ دود لڑ رہا ہے تجلی سے طور کی
طوفان طرازیِ مژۂ عاشقاں نہ پوچھ   کچھ آبرو رہی ہے نہ چشم تنور کی

پاس اب ہمارے نکہت گل کو نہ لا نسیم　　دل سے ہوس چمن کی اسیری نے دور کی
سودا کو عاشقی سے رکھا چاہتا ہے باز　　ناصح نصیحت اپنی سے، خوبی شعور کی

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں　　دل لیکے بولتا ہے جو تو اب یہ بولیاں
ہر بات میں کنایہ وہر یک سخن میں رمز　　ہر آن میں کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں
حیرت نے نقش آئینہ منہ نے نہ دیں کبھو　　آنکھیں کسی نے دید کو تیری جو کھولیاں
کس نے کیا خرام چمن میں کہ اب صبا　　لاتی ہے بوئے ناز سی بھر بھر کے جھولیاں
اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک　　جوں خوش قدوں کے بر میں مسکتی ہیں چولیاں
کیا جانیے تجھے سر انگشت پر حنا　　جس بے گنہ کے خون میں جا ہیں کھولیاں
سودا کے ساتھ صاف نہ رہتی تھی زلف یار　　شانہ نے بیچ پڑ کے گرہ اس کی کھولیاں

(۹) سبقت

مرزا مغل سبقت تخلص خلف مرزا علی اکبر۔ بزرگانش اہل خطہ فارس بودہ اند وازچندپشت در شاہجہاں آباد سکونت داشتند۔ بعد از وقوع ہنگامہ شاہ بہ لکھنؤ رسیدہ دریں جا توطن اختیار کردند۔ مشارالیہ جوان قریب بفضیلت است وہمیں جا نشوونما یافتہ درخوش اخلاقی وآداب صحبت وطریق تواضع وخندہ روئی وشگفتہ دلی باغ وبہار دیدنش۔ بمقتضاے موزونی طبع فکر شعر ہندی موافق رواج زمانہ کردہ واز نظر قلندر بخش جرأت گذرانیدہ۔ اما چون نیک نگاہ کنی بسبب معلومات فن وآگاہی نظم ونثر و تصنیف قصیدہ غرا رتبہ شاعریش درنظم قصیدہ از اوستاد درگذشتہ۔ ازوست۔

عرق شرم رکھے کیونکہ نہ پیشانی شمع　　ہے خجل منہ سے ترے چہرۂ نورانی شمع

---

(۱) یار سے دن (خ)

کچھ بھی پروانہ کی رمز اُس پہ نہ مفہوم ہوئی — جھوٹ نکلا سبھی دعوائے زباندانی شمع
سوز پروانہ ہویدا ہے سبھوں پر سبقت — پر کسو پر نہیں ظاہر غم پنہانی شمع

غم نہیں کچھ جو شیشۂ دل گر بنے اور ٹوٹ جائے — ہر الم اُس کا جو شئے بہتر بنے اور ٹوٹ جائے
قصد مجھ سے بیگنہ کے قتل کا جب دل میں ہو — کیوں نہ پھر قاتل کا نت خنجر بنے اور ٹوٹ جائے
سوچ میں رہیئے نہ کیونکر قالبِ انساں کو دیکھ — خاک کے پتلے کا یوں پیکر بنے اور ٹوٹ جائے

کیا کہوں اے ہمدمو میرا کہاں دل لگ گیا — لگ نہیں سکتا کسو کے جو وہاں دل لگ گیا
جائیں اب کیونکر کہیں ہم میکدہ کو چھوڑ کر — آتے ہی اپنا تو اے ساقی یہاں دل لگ گیا
ناقۂ لیلیٰ جو ٹھیرا وادیِ مجنوں میں آہ — بولے کیا تیرا بھی یہاں اے سارباں دل لگ گیا

رباعی

بن تیرے میں کیا کہوں جو مجھ پر گذرا — جو کچھ کہ کہا کسو نے سب کر گذرا
یہاں تک کہ گذر گیا میں اپنے جی سے — لیکن نہ ستم سے اپنے تو در گذرا

دیگر

مت یاد دلاؤ وصل کی راتوں کو — پوچھو کوئی نہ آن ملاقاتوں کو
پھرو نہیں بات پھر نکلتی منہ سے — کرتا ہوں جب اُس کی یاد میں باتوں کو

دیگر

شور و فغاں مدام ہم کرتے ہیں — فرقت میں کسی کے آہ دکھ بھرتے ہیں
افسوس ہے اپنی زندگانی افسوس — ہیں نزع میں جیتے ہیں نہ ہم مرتے ہیں

---

(۱) پتھر (ن خ)

دیگر

سبقت اتنا تو کس لیے روتا ہے ‏ اور جان توانی کیوں عبث کھوتا ہے
کہتے نہ تھے ہم کہ عاشقی مت کرنا ‏ عاشق ہونے میں بس یہی ہوتا ہے

دیگر

بیداد و ستم اگرچہ ہے فن تیرا ‏ لیکن میں دوست کیا کہ دشمن تیرا
ترسا ترسا جو تو نے مارا مجھکو ‏ اب ہاتھ مرا ہے اور دامن تیرا

دیگر

الفت نے ہے جس کی ہم کو مارا افسوس ‏ وہ کر گیا صاف اب کنارا افسوس
سبقت دل و جان سے ہو گئے ہم جس کے ‏ افسوس ہوا نہ وہ ہمارا افسوس

دیگر

اُس آفتِ جاں کو جب سے دیکھا دل نے ‏ بس تب سے کیا ہے حشر برپا دل نے
شکوہ کریں کس کا اور شکایت کس کی ‏ ہم کو تو کیا خراب و رسوا دل نے

ٹھنی ہے اب یہی دل میں کہ ہم کسی سے ملیں ‏ نہ کوئی ہم سے ملے اور نہ ہم کسی سے ملیں

اُٹھا دیتی ہے بیتابی ترے بن ہم جہاں بیٹھیں ‏ کہیں لگتا نہیں ہے جی کدھر جاویں کہاں بیٹھیں
قیامت ہو ابھی برپا اُٹھے ہنگامۂ محشر ‏ سر اپنا رکھ کے زانو پر جو ہم کر کے فغاں بیٹھیں

حرف الشین

(۱) شیدا

شاگرد میر محمدی بیدار، جوان ظریف الطبع بود۔ معاش بہ علاقہ بندی میکرد

وپیوستہ در ہم چشیان باعزت وحرمت بسر می برد۔ از مدتے در شاہجہاں در گذشتہ۔ دیوانش در شہر موجود است۔ از وست۔

لیکے دل اے دلربا کیوں قسم کھاتے ہو تم | ہم نظر بازوں سے آگے سے کہاں جاتے ہو تم
اک نرالے شہر میں بانکے تمھیں پیدا ہوئے | ہر گھڑی تیغ و سپر لیکے دھمکاتے ہو تم
آگے تم سے کیا توقع ہو گی شیدا کو میاں | ایک بوسہ پر چھری تلوار تپلاتے ہو تم

شیدا سنبھل کے جانا کوچہ میں آج اس کے | پتھر لئے کھڑے ہیں ہاتھوں سے پیچ لڑکے

شگفتہ (۲)

مرزا سیف علی شگفتہ خلف نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم ومغفور جوان خوش خلق و باعلم وحیا۔ پیشتر بیان تخلص سے فرمود[1]۔ شعر خود را بہ مرزا کاظم علی جوان می نمود۔ از چندے تبدیل تخلص نمودہ[2] بجائے بیان شگفتہ قرار دادہ۔ فکر سخن بعمدگی وصفائی تمام می کند وقصیدہ[3] ہائے آبدار در سلک نظم کشیدہ اند۔ فقیر ایشاں را در لکھنؤ دیدہ بسیار بخوبی پیش می آیند۔ من اشعار ش۔

حکم اتنا نہیں کہ در کو دیکھ | میرے نالہ کے ٹک اثر کو دیکھ

پاس سے میرے وہ بت اٹھنے نہ پایا ہوتا | ایسا اسباب کوئی حیف خدایا ہوتا

بوسہ لیتے ہوئے ہم دیکھو ادب کرتے ہیں | گالیاں دیتے ہیں آپ غضب کرتے ہیں

---

(۱) فرمودند (بن نخ) (۲) نمودند (ن نخ) (۳) کردہ (ن نخ) (۴) قصیدہ بجائے قصیدہ ہائے (ن نخ)

خرام ناز ترا بس مری نظر میں رہا تمام عمر ہی بیٹھا میں رہ گذر میں رہا

آنکھیں چرا کے شب وہ بہانے سے اٹھ گیا حرف مروت آہ زمانے سے اٹھ گیا

دل و جگر نہیں سینہ کے داغ کے نیچے جلے پڑے ہیں پتنگے چراغ کے نیچے

سوز ہجراں سے ساز کرتا ہوں تو نے جانا کہ اس کو صبر آیا

غم نہ کھائے دل اگر شب زلف کی تاریک ہے پاس ہی رخ اس کا یعنی صبح بھی نزدیک ہے

(۳) شرر

مرزا ابراہیم بیگ شرر تخلص کہ احوال ایشاں در تذکرۂ فارسی بہ شرح و بسط مرقوم است گاہ گاہے خیال شعر ہندی ہم می کرد دو سہ شعر از و بخاطر است۔

تمام عالم ہی دہ پریرو اگر کبھی ہم کلام ہووے کلام سنتے ہی اس کے منہ سی تمام عالم تمام ہووے

سامعان کا نہ فقط سننے سے دم رکتا ہی سرگذشت اپنی جو لکھئے تو قلم رکتا ہے

اسیروں کی زبانی اے صبا یہ اس سی کہنی ہی مگر گردن کا ڈورا کم ہی جو زنجیر پہنی ہے

(۴) شکوہ

محمد رضائی شکوہ از آشنایان مرزا قتیل جوان خوش خلق است۔ اگرچہ در شعر شہرت

ندارد اما بہ سبب موزونیِ طبعِ سلیم آنچہ گفتہ درست بستہ است۔ از وست۔

تجھکو دلدار میں سمجھتا ہوں — کیا غلط یار میں سمجھتا ہوں
گرچہ کہتے ہو پھر بھی آؤں گا — ہے یہ انکار میں سمجھتا ہوں

مت مل تجھے کہتا تھا میں اُس سے زیادہ — پائی نہ سزا اور بھی مل اس سے زیادہ

"ملے ہے شب و روز وہ شوخ سب سے — مگر ایک اے آہ مجھ جاں بلب سے

نہ اس کا وصل ہے ممکن نہ تاب ہے دل کو — عجب طرح کا الٰہی عذاب ہے دل کو

تھوڑی بھی نیک و بد کی گر وہ تمیز رکھے — کافر ہو پھر جو اُس سے دل کو عزیز رکھے

عجب دن وہ ہوگا جو یہ بات ہوگی — کہ اس سے ہماری ملاقات ہوگی

(۵) شایق

میاں پیر محمد شایق جوانِ صلاحیت شعار است۔ بیشتر شعرِ خود را از نظرِ میاں ہاشمی کہ ذکر ایشاں در ردیف ہا خواہد آمد میگذرانید۔ حالا از چندے بہ حلقۂ شاگردیِ قلندر بخش جرأت در آمدہ از وست۔

کہ شیخ و برہمن دیر اور کعبہ کو[۲] کہتے ہیں — رہ دل سے ہیں غافل ورنہ اس میں دو نو رستے ہیں
تماشا دیکھ کر جراح کے مرہم لگانے کا — ہمارے زخم انکے تو ژ کر کھل کھل کے ہنستے ہیں

---

(۱) یہ شعر ندارد۔ (ن خ) (۲) کے بجائے کو۔ (ن خ)

ذرا تو ہٹ کر اوجھل سی دکھا مکھڑا کر جی جاویں | یہ تیرے طالب بدار مدت سے ترستے ہیں
جو لیکر جان عاشق سی ملیں خوبان ہندوستان | سمجھنا مت گراں شایق تمھیں یہ تو بھی سستے ہیں

ظلم کا شیوہ کچھ اُس ظالم کو ایسا یاد ہی | ہر گھڑی ہر لحظہ اک تازہ ستم ایجاد ہی
نچلے ہو کر بیٹھتے یکدم نہیں طفل اشک | چشم گریاں کی بھی کتنی ناخلف اولاد ہی
جائیے کعبہ کو یا کیجے صنم خانہ کا طوف | حضرتِ دل آپ کا اب کیا ہمیں ارشاد ہی
ہاتھی کی وضع پر تو گفتگو کر اختیار | ورنہ فن شعر میں شایق ہر ایک اُستاد ہی

(۶) شہید

از دورۂ میر و مرزا است ۔ پختہ گو معلوم می شود ۔ دو شعراز واز عالم مکتب نشینی یاد دارم از وست ۔

گئے برباد اپنے نالہ و فریاد یا قسمت | بہار آخر ہوئی تب ہم ہوئے آزاد یا قسمت
شہید آخر مقدر تھا ہمیں حسرت میں جی دینا | ہمارے سر پہ آکر پھر گیا جلاد یا قسمت

(۷) شہرت

شاگرد جرأت است ۔ از وست ۔

نامہ جوں ہاتھ میں لیا میں نے | دیکھ قاصد کو رو دیا میں نے

دل ڈھونڈتے ہو پاس مرے دل تو کہاں ہے | اک شعلۂ آتش ہی کہ پہلو میں نہاں ہی

دو دن کی ہی یہ بات کہ پھرتے تھے جن کے ساتھ | اب قبر پر ہماری جو اُن کا گذار ہے

آپس میں یوں وہ کہتے ہیں سب پڑھ کے فاتحہ　　شہرت تھا جس کا نام یہ اس کا مزار ہے

(۸) شوق

شاگرد مرزا رفیع - از دست -

شمع سبزِ لحد بادہ کشاں ہے شیشہ　　مصرعہ آہِ دلِ غمزدگان ہے شیشہ
حال ساقی سے مرا کچھ نہ کہا اور چلا　　میں جو دیکھا تو عجب پنبہ دہاں ہے شیشہ

دامن سے تیرے خون نہ رہے بن بھری ہوئے　　چھوٹے نہ اپنا عشق تو قاتل مرے ہوئے
غارت گروں کے ہاتھ سے مانند طفل اشک　　جاتا ہوں نقدِ دل کو میں آگے دھرے ہوئے

شوق گو عشق میں رسوائے دو عالم ہو وے　　شکر صد شکر ترے پیچھے تو بدنام نہیں

سرشکِ گرم سے ہے دل کباب در تہِ آب　　ہوا ہے چشم کا خانہ خراب در تہِ آب
عرق ڈھلک کے جبیں سے چہ ذقن پہ گرا　　صفائی حسن سے پہنچا یہ آب در تہ آب
گئی ہے نیند سرشکوں کے شوق طوفاں سے　　محال عقل ہے آنکھوں کو خواب در تہ آب

حرف الصّاد

(۱) صفدری

از زمرہ سلف است - از دست -

سبز جامہ بر میں لے کے رنگ جیتا ہے دیکھو　　شمع کافوری کو یہ فانوس مینا ہے دیکھو

موتیا را بیل پھولی ہے گلابی باغ میں ‌ منہ پہ اُس گلرو کے جوں شبنم پسینا ہے دیکھو
حسن کے مہماں کی خاطر کی ہے حاضر حاضری ‌ سبز خط لب کے نمکداں پر پودینا ہے دیکھو
خاتم دستِ سلیماں ہے پری رو کا دہن ‌ لعل لب کا جس پہ یاقوتی نگینہ ہے دیکھو
گر رقیب ہاتھی ہے گھس کر بیٹ میں کرتا ہے کام ‌ صفدری حکمت میں یارو شیخ پھینا ہے دیکھو

(۲) صفا

کہ ہیچ از نام و نشانش خبر نہ دارم مطلع از و بہ سمع رسیدہ ایں است۔

محتسب جھوٹ ہے کس ڈھری شیشہ میں ‌ رہ گئی ہے کہیں آنسو کی تری شیشہ میں

(۳) صادق

میر صادق علی صادق تخلص، فوجدار خان[1] حضرت شاہ عالم بہادر شاہ غازی جوان سعادتمند است وخود بہ فوجداریِ سیلانِ مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر عز و امتیاز دارد۔ گاہ گاہے بہ مقتضائے موزونیٔ طبع وتبعتِ حضور فکرِ شعر کردہ ومیکند و از نظرِ میر انشاء اللہ خاں می گذارند۔ از وست۔

وے ملا خاک میں جب گردشِ افلاک ہوس ‌ اس کے ملنے کی نکالے کوئی کیا خاک ہوس
صادق اب اور سروکار نہیں اُس سے مگر ‌ ایک بوسہ کی رکھے ہے دلِ غمناک ہوس

دوستی کیونکہ نبھے دیکھئے اب یار کے ساتھ ‌ دیکھتا ہوں اُسے ہر وقت میں اغیار کے ساتھ

نصیب[2] اپنے کہاں ایسے جو اُس رخسار کو ملئے ‌ زہے قسمت اگر مہندی ہی پائے یار کو ملئے

(۱) پسر فوجدار خاں۔ (ن خ)، دوسرا مصرعہ غائب۔ (ن خ)

عرقِ آلودہ گر اس کا اگر کھا ہاتھ آجاوے	تو اس سے صادق اپنے سینۂ افگار کو ملئے

نہ آفتاب سے ہر ذرہ یہ چمکتا ہے	وہ ایک نور ہے جو سب میں جھلکتا ہے
صبا نے آئی تھی بو باس کس کے کاکل کی	کہ جس کی بو سے دماغ اب تلک مہکتا ہے
خدا ہی جانے لے کیا ہوا ہے اے صادق	کچھ آپ ہی آپ جو سینہ میں دل سلگتا ہے

جس نے دیکھا ہے تری جلوہ گری کا نقشا	اس کو بھاتا ہے کب اے یار پری کا نقشا
تھی ہی چھب تجھی غضب ایک تو اس کا فرکی	تس پہ پھر یہ پوشاک زری کا نقشا
جلد آ جلد دمِ بازپسیں ہیں میرے	نظر آتا ہے چراغِ سحری کا نقشا
کوئی دیکھے جو مرا زخمِ جگر اے صادق	تیری بیداد کے ہے صاف سری کا نقشا

ہو نام خدا تجھ میں کیونکر نہ خود آرائی	اندازِ سخن یہ کچھ چہرے کی وہ رعنائی
تھی ایک تو کڑتی ہی لاہی کی غضب تس پر	ہے آفتِ جاں کا فر انگیا کی یہ سکڑائی
کچھ اس سے اشاروں میں کہتا ہوں تو کہتا ہے	دانتوں میں دبا انگلی ملے لئے یہ سوائی

(۴) صبا

لالہ کانجی مل صبا تخلص قوم کایستھ سکسینہ۔ وطن بزرگانش فیروزآباد و خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ۔ فقیر در ایامیکہ وارد ایں شہر بود چندے حسبِ اتفاق بر مکان[3] فیاں اقامت داشت۔ مشار الیہ درآں ایام بمقتضائے موزونی طبع شوق شعر پیدا کردہ

---

(۱) ن خ میں پہلا مصرعہ غائب۔ یہ دونوں مصرعے یعنی پہلے شعر کا پہلا اور دوسرے شعر کا دوسرا مل کر ایک شعر بنتا ہے۔ (۲) ن خ تیری بیداد کے ہے صاف سری کا نقشہ۔ (۳) دکان۔ (ن خ)

چیزے کہ بہ زبان خود می گفت آنرا از نظر فقیر باعتقاد تمام میگذرانید۔ تا اینکہ در عرصۂ قلیل دیوان مختصرے درست ساخت طبعش بخیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر عمرش وفا میکرد زیادہ ازیں قدم برجادۂ ترقی می نہاد و احیف کہ بہ عمر بست و پنج سالگی در عین جوانی مدقوق شدہ درگذشت[1]۔ از وست۔

عبث ہے یہ تمہارا پاس میرے بار بار آنا
جدائی میں مجھے مشکل ہے اے یار و قرار آنا

یہی شغل اُس کے کوچہ میں ہے اب آٹھوں پہر اپنا
بصد امید جانا دن کو شب کو شرمسار آنا

ترے دردِ جدائی میں ترا عاشق گیا جی سے
صبا اُس گل کے دروازہ پہ یہ جاکر پکار آنا

جس روز ترے در پہ گذر ہم نے کیا تھا
اُس دن ہی تری خو سے حذر ہم نے کیا تھا

افسوس وہ آرام عدم میں بھی نہ پایا
جس کے لئے دنیا سے سفر ہم نے کیا تھا

سحر جب بستر راحت سے وہ رشک قمر اٹھا
غلامی اُس کی ہیں خورشید لے تیغ و سپر اٹھا

ابھی تسکیں ہوئی تھی اِک ذرا فریاد و زاری سے
لگا دل مضطرب ہونے کہ پھر درد جگر اٹھا

گلے پر میرے خنجر پھیرتا وہ اور بھی لیکن
ہوئی مجھ سے خطا اتنی کہ میں فریاد کر اٹھا

نہیں معلوم اے یار و صبا کے دل میں کیا آیا
ابھی جو بیٹھے بیٹھے وہ یکایک آہ کر اٹھا

فنا ہیں ایک دن سب یہاں عمارت در گھر کس کا
یہ دنیا وہم ہے یارو پدر کس کا پسر کس کا

مجھے آتا ہے تجھ پر رحم اُس قاتل کے کوچہ میں
لئے جاتا ہے نامہ آج تو اے نامہ بر کس کا

دن عید کے جو مجھ سے وہ نا آشنا ملا
رو ٹھا تو تھا میں لیک گلے اُس کے جا ملا

---

(۱) "دو داغ حسرت بر دل باقی ماندگان نہاد" درگذشت کے بعد (ن خ)

اس خاکداں سے جھاڑ کے دامن کو جوں صبا
ایسا گیا کہ پھر نہ سراغِ صبا ملا

چلے دامن اٹھا کر یہ کہو اس شوخ قاتل سے
کہ یہ مدفن نظر آتا ہے رنگیں خونِ بسمل سے

تغیر رنگ میں تاب و تواں نے ہم سے چھوڑی
رعیت جس طرح پھر جائے ہے معزول عامل سے

کہے تھا عاشق لیلیٰ کہ میں اب چل نہیں سکتا
مجھے لے سارباں تو باندھ لے ڈاڑکی محمل سے

صبا ہم نے تو ہرگز کچھ نہ دیکھا جذبِ الفت میں
غلط یہ بات کہتے ہیں کہ دل کو راہ ہے دل سے

مجلس سے اٹھ کے جب وہ رشکِ قمر گیا ہے
اپنا تو روتے روتے نورِ نظر گیا ہے

کیا سحر ہے کہ جا کر واں کا ہی ہو رہا ہے
اس کی گلی میں یہاں سے جو نامہ بر گیا ہے

بھٹکا پھرے ہے مجنوں لیلیٰ کے قافلہ میں
یہ پوچھتا کہ یارو محمل کدھر گیا ہے

کیا تو نے کچھ صبا سے اے تند خو کہا تھا
روتا ہوا ادھر سے با چشمِ تر گیا ہے

ازل سے سوز تیرے عشق کا جو سر میں تھا میرے
گیا میں جی سے اپنے پر نہ وہ سر سے گیا میرے

نہ آیا وہ مسیحا لب دمِ آخر بھی بالیں پر
موا تو میں ولے ارمان یہ دل ہی میں تھا میرے

عاشقِ مضطر کا سوزِ دل نہاں کیونکر رہے
شمع کے شعلہ کی لے یارو زباں کیونکر رہے

اے صبا سچ ہے جدائی میں بقولِ مصحفی
درد مندِ دوست بے آہ و فغاں کیونکر رہے

ہاتھوں میں تیرے پیارے یہ طائر حنا ہے
یا مرغِ دل کسی کا بسمل ابھی کیا ہے

کبھی گل رو مرا جا کر جو دریا میں نہاتا ہے
فروغِ حسن سے گلزار پانی میں دکھاتا ہے

مصور جب کہ مار زلف کی تصویر کھینچے ہے　　تو ہاتھ اپنا وہ دہشت سے دم تحریر کھینچے ہے

حرف الضاد

(۱) ضیا

میر ضیاء الدین ضیا تخلص گویند استفادۂ شعر در ابتدا از میر محمد تقی میر کردہ بطرف پورب آوارہ شدہ۔ رفتہ رفتہ[1] چند شعرش از زبان بعضے آشنایان بسمع رسیدہ۔ میر حسن مصنف مثنوی سحر البیان نسبت شاگردی خود بہ شار الیہ می[2] رسانید و بسیار ثنا خوان و معتقد او بود۔ بندہ او را ندیدہ چند شعر کہ از و بہم رسیدہ ایں است۔

گھر ہی کو اس کے بھولا یا راہ پھیر کی ہے　　یارب تو خیر کیجو قاصد نے دیر کی ہے

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا　　آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کھلانے لگا

کل کی رسوائی تجھے کیا بس نہ تھی اے ننگ خلق　　اس کے کوچہ میں ضیا پھر آج تو جانے لگا

کہا کیا جانے کیا میری طرف سے تجھ سے بدگو نے　　کہ رفتہ رفتہ یہ احوال پہنچایا مرا تو نے

پلا دے آب خنجر ہم کو قاتل تشنہ جاتے ہیں　　جو کوئی مرتا ہے اس کے حلق میں پانی چواتے ہیں

ہے ماتم کس دوانے کا الٰہی آج صحرا میں　　کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اڑاتے ہیں

ضیا رکھ ہاتھ سینہ پر خبر دل کی بھی لے ظالم　　کہ آج آنسو ترے آنکھوں میں کچھ لوہو سے آتے ہیں

---

(۱) ن خ مکرر نہیں ہے　(۲) میر سانید بودند ن خ

حرف ط

طپش (۱)

محمد اسمٰعیل طپش تخلص عرف مرزا جان کہ مولد والدش بخارا است ۔ قوم مغل ، ہندوستان زا از اولاد سید جلال بخاری ، جوانے است سپاہی پیشہ ، ادا بند و ادا پسند ، در سنِ شانزدہ سالگی طبعِ موزوں بہم رسانیدہ چندے بخدمتِ مرزا محمد یار بیگ سائل کہ ذکرِ ایشاں بر صدر گزشت مشقِ سخن نمودہ و بعد ازاں رجوع بخواجہ میر درد صاحب کردہ ۔ شعر را بشستگی و پاکیزگی تمام می گوید و ما سوائے ایں آنچہ گویند والہ شعر است و خط صرافی (۱) و شاشتری ہر دو بخوبی تمام می نویسد و در خوش اختلاطی و آدمیت و وضعِ ملاقات و صحبت داری بسیار بے نظیر ۔ با فقیر از چند سال رابطۂ آشنائی درست وارد ۔ از وست ۔

ساقی ہے دورِ مے ہے شبِ ماہتاب ہے ، لیکن یہی غضب ہے کہ تو مستِ خواب ہے ،

رشک سے تیرے لعلِ گلگوں کے غنچے پیاسے ہیں اپنے ہی خوں کے

دل کچھ اس وقت تلملاتا ہے آہ کون اس کو یاد آتا ہے

اس گلشنِ جہاں میں جو آیا سو داغ ہے گلچینِ روزگار سے کس کو فراغ ہے

---

(۱) صیرافی و شاشتری ۔ (ن خ بجنسہ)

نہ شہر بھاوے نہ صحرا لگے بھلا مجھکو　　آہی بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوا مجھکو

ہرگز نہ سلاسل سے ہو تسخیر ہماری　　جوں زلفِ بتاں چاہیئے زنجیر ہماری
کچھ تیرے سلیقہ سے پھنسے ہم نہیں صیاد　　لائی ہے ہمیں دام میں تقدیر ہماری

دشنام کا نہیں کبھی انعام کا نہیں　　خود کام وہ برا تو کسی کام کا نہیں
دینے لگا طپش جو دل اُن کو تو بول اُٹھے　　رہنے دو اپنے پاس مُرے کام کا نہیں

خاک سے جام کیا جام کو پھر خاک کیا　　تونے کیا کیا نہ کچھ اے گردشِ افلاک کیا

کس کی طرف سے آج طپش تجھکو یاس ہے　　سچ کہہ ہمارے سر کی قسم کیوں اُداس ہے
میں نے کہا کہ کہتا ہوں کچھ تم سے التماس　　کہنے لگے کہ سمجھے ہیں جو التماس ہے

ناز ہے انداز ہے ہر دم نئی اک آن ہے　　دلربائی کا غرض تیار سب سامان ہے
شاعر اکثر آئینہ رو کہتے ہیں معشوق کو　　لیکن آئینہ کو بھی دیکھا تو یہاں حیران ہے

آئے تو ہو کہیں سے آخر ملے دسلے تم　　کیا ہو جو پھر مرے بھی لگ جاؤ اب گلے تم
آواز میری سُن کر غرفہ سے جھک کے بولا　　کس واسطے کھڑے ہو دیوار کے تلے تم

سکے ہی بیٹھوں ہوں محفل میں اس کی دور　　اکل کھرا ہے کہ بیٹھا کرے ہے سب سے دور
خدا کسی کو نہ آزارِ عشق دیوے یار　　کبھی ہمیں بھی یہی عارضہ تھا اب ہے دور

کبھی تو پاؤں کی ٹھوکر سی تیری آشنا ہوتے   اگر خوابیدہ کوچہ میں ترے جوں نقش پا ہوتے

کیا جانئے کس نے تجھے محبوب بنایا   پر جس نے بنایا ہے بہت خوب بنایا

جوں کہا میں دل کو میرا تجھ سوا کوئی نہیں   سنتے ہی بولا کہ ہاں سچ ہے ترا کوئی نہیں

ہماری شمع نے دیکھی جو اشکباری رات   کٹی بچاری کو روتے ہی روتے ساری رات
سرک سرک کے پلنگ پر مچل مچل جانا   یہی ادا ہمیں بس بھا گئی تمہاری رات

ترا وہ نامہ جو تھا ہم نے کر رکھا تعویذ   سو بعد مرگ ہوا وہ ہی قبر کا تعویذ
نہ تیغ چل سکی مجھ پہ تو منفعل ہو کر   لگا یہ کہنے کوئی اس کے ہے بندھا تعویذ

آپ کچھ نہ کو رہے میرے ہی ہوتے ہیں خفا   میں یہ حیران ہوں کہ یارب میں نے کیا تقصیر کی

نہ گرا جب تنِ لاغر سے مرے قطرۂ خوں   کیا ہی جلاد پشیماں ہوا تلوار لگا

تو ہی لطفِ سخن مرا سمجھے   ورنہ کوئی یہ پہیلی کیا سمجھے
میں تو ناحق یہ قصہ کہہ کہہ کر   تم سے کہتا ہوں مدعا سمجھے
رفتہ رفتہ کبھی سمجھ لوگے   ابھی تو آپ کی بلا سمجھے

ترے شہید کے اسبابِ غم نظر آئے   شبِ فراق کے کالے علم نظر آئے

(۲) طالب

طالب حسین خاں طالب تخلص پسر میاں عسکری جوانِ رعنا و کشیدہ قامت و خوش خلق و خوش تقریر کہ داروغگی خاصۂ مرشدزادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر امتیاز تمام دارد۔ پیش ازیں بہ اقتضائے صحبتِ مشاعرہ و شرکت جلسۂ یارانِ موزوں الطبع برائے خوشی مزاج اقدس در غزلہائے طرحی حضور چیزے کہ موزوں کردہ بود آں را بہ نظرِ میر افشار اللہ خاں کہ مرتبۂ دوستیش باایشاں بہ مرتبۂ برادری کشیدہ گذرانندہ۔ چوں بہ فقیرہم باعتقادِ تمام پیش می آید چند شعرش کہ بہم رسیدہ می نویسد۔ از وست۔

مجھ سے جب آنکھ وہ ملاتا ہے — دل ہی سینہ میں لوٹ جاتا ہے
غیر سے مل کے شعلہ خو ناحق — کیوں جلوں کے تئیں جلاتا ہے
مژدہ اے قیس تیری وادی میں — ناقۂ لیلیٰ کا آج آتا ہے
غیر سے کر کے سخت ویرانی — سخت تو جی مرا یکاتا ہے
آج طالب کا عشق میں تیرے — جلد آ ورنہ جی ہی جاتا ہے

اشک یوں جم گئے ہیں اپنی مژگاں سے لپٹ — اوس جیسی کہ رہے خارِ مغیلاں سے لپٹ
دشت میں آہِ شرربار جو طالب نے بھری — ایک شعلہ گیا خاشاکِ بیاباں سے لپٹ

حرف العین

(۱) عارف

محمد عارف رفوگر کہ عارف تخلص مے کرد اصلش از کشمیر است و خود ش در شاہجہاں آباد

نشو و نما یافته (۱) و جوان و پیر شده ۔ معاصرِ میر و مرزا است ۔ شعر را به تلاشِ تمام می گفت و گاه گاہے بطورِ غنی خیالِ شعرِ فارسی ہم کرده ۔ دیوانش بعد فوتش به تدبیرِ یکے از آشنایان صورتِ تدوین گرفته ۔ نقیر ہر گاه به دوکانش میرفت بسیار به دل گرمی پیش می آمد ۔ از وست ۔

اس ابر میں بے ساقی وے جی یہ بنی ہے | ہر بوند کا کھانا مجھے ہیرے کی کنی ہے

ہمیشہ دل میں خیالِ نگار گذرے ہے | اسی خیال میں لیل و نہار گذرے ہے
نگاه یوں دلِ عارف سے پار گزرے ہے | کہ جس طرح سے کہ صابن (۱) تار گذرے ہے
چڑھا ہے خونِ شہیدانِ عشق بر سرِ چرخ | شفق نہیں ہے یہ لوہو کی دھار گذرے ہے

طفلِ ہولی باز کے ہاتھوں سے بچنا ہے محال | موٹھ سے چلتی ہے جو چلتی ہے یہاں مشتِ گلال

کوئی چھپتی ہیں پیار کی آنکھیں | اُن سے ہوتا ہے آشکارا خلوص

دخترِ رز سے جا کہو کہ ملے | ورنہ عارف افیم کھاتا ہے

عظیم (۲)

مرزا عظیم بیگ عظیم تخلص اگرچہ شہرت به شاگردی مرزا رفیع سودا دارد اما در ابتدا چندی از شاه حاتم استفاده کرده (۲) گویند چند روز در فرخ آباد کسوتِ قلندری برخود (۳) داشت ۔ حالا بازور لباس دنیائی آمده ۔ نقیر او را در شاہجہان آباد دیده جوانِ ہیچ‌پیچ رو بود اکثر در مشاعرہا می آمد و بر صدرِ مجلس می نشست ۔ دعوائے شاعری خیلے در دماغش جا داشت

---

(۱) "و" ندارد ن خ ، (ن) ، میں ۔ ن خ ۔ ر ، (۲) گرفته ۔ ن خ ، (۳) برخود راست کرده بود ن خ ،

ہیچ کس را بہ خاطر نمی آورد و خود را از ہمہ ممتاز میدانست با آنکہ ہیچ علم و فن ندارد، مردِ سپاہی پیشہ است۔ در شعر تلاشہائے نمایاں می کند۔ یک دو قصیدہ ہم بقوتِ تمام گفتہ۔ دیوانش بلا تشبیہ بہ شکلِ حمائل واقع شدہ۔ از وست۔

گل چشم خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا — دامن کا تھا جو تختہ اک تختۂ چمن تھا
کیجو عظیم کو بھی یارب غریقِ رحمت — آوارۂ جنوں تھا[1] اک صاحبِ سخن تھا
اور معنی بند ایسا ہندی زباں کا صائب — ہندوستاں سے لے کر مشہور تا دکن تھا
اک دن جو گھر سے نکلا خطِ شعاع کی صورت — بکھرا ہوا بدن پر تار پیرہن تھا
اور ماسوائے اس کے کہتے ہیں مرتے مرتے — عریاں تنی سے اُس کا خوگر زبس بدن تھا
دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پر ہو فانوس — تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

یہاں عذر پذیرا ہو بُرے سے نہ بھلے سے — جوں غنچہ زباں نکلے ہے ٹک لب کے ہلے سے
اُبھرے ہے تو لے شیشہ تبھی اپنے دموں پر — نکلا ہے ترا ہاتھ جو پتھر کے تلے سے
کہتے تھے دلا شیریں لبوں سے نہ مل اتنا — اب مثل مگس فائدہ کیا ہاتھ ملے سے
چھپتا ہے کوئی شمع صفت سوز دل اپنا — سر کاٹو اگر تو ہو نمودار گلے سے
گلریز کی مانند جز آتش کے عظیم اب — لائے نہ کبھی بیل مری پھول پھلے سے

پاسِ سخن بھی ہے یہاں اس کی شان پر — مانندِ خامہ شے جو سر اپنا زبان پر
تقریر سرگذشت نہ پوچھو کہ خامہ وار — آتا ہے گریہ ہر سرِ حرف بیان پر
گھر میں بھی اپنے آئینہ ساں منتظر ترا — حیراں[2] کھڑا رہوں ہوں سدا آستان پر
نام آوری جہان میں ہے باعثِ کلنک — نازاں نہ جوں نگیں ہو تو نام و نشان پر

---

(۱) تھا دن مخ، (۲) حیراں سا کھڑا رہوں الخ دن مخ بجنسہ

دل کے بھی غم سے ٹکڑے ہوئے اپنے قال پر | جوں غنچہ تب زبان کھلی عرضِ حال پر
فارغ ہیں کشمکش سے جہاں کے شکستہ دل | پہنچے نہ ہاتھ شانہ کا چینی کے بال پر

غنیمت ہے عظیم اس جا جو نفریں سن نہ تو اُٹھے | پڑے تحسین جو سے بھاڑ میں اور آفریں ڈوبے

(۳) عاقل

عاقل شاہ عاقل تخلص جوانے بود سیاح در شاہجہاں آباد اکثر بہ بندہ خانہ برائے شنیدنِ اشعارِ فقیر می آمد و بیاد محظوظ می شد خود ہم چیزے موزوں می کرد ازوست[1]

دیکھتے ہیں جو کوئی شہر جہاں آباد کو | وے تو تب کہتے ہیں ویران رسم نو ایجاد کو
قید بھی یہاں کچھ نہیں اور چھوٹ بھی سکتے نہیں | واہ وا اس دام کو اور آفریں صیاد کو
دیکھیں سب کچھ اور نہ دیکھیں کیا نظر بندی ہے یہ | دیکھئے اس کام کو اور کام کے استاد کو
اپنے ہاتھوں آپ ہی کرتے ہیں سر تن سے جدا | ورنہ کیا طاقت ہے آوے اس جگہ جلاد کو
یاد ہے اس کی تو عاقل کوئی بھی غافل نہیں | پر بڑی یہ یاد ہے جو بھولے اپنی یاد کو

(۴) عیش

مرزا حسین بخشائے عیش تخلص شاگردِ میر سوز صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ جوانِ خندہ روئے خوش خلق و متواضع و خود میں دیدمش۔ ازوست۔

وہ اگر آوے پشت بام کہیں | میں بھی کر لوں اسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ دے ساقی | ایک باری تو بھر کے جام کہیں
یہ غزل عیش ہے تصدقِ سوز | مجھ سے ہوتی تھی انصرام کہیں

---

(۱) ایں غزل یادگار اوست۔ ان ح

(۵) عشقی

مراد آبادی فقیر اورا در آنولہ دیدہ بود شعرے از وبہ خاطر است۔

کوئی تو ہے گلچہرہ کوئی سرو رواں ہے ۔ دیکھا تو یہاں ایک سے ایک آفت جاں ہے

(۶) عظیم

جوانے بود سپاہی پیشہ یک غزل خود در آنولہ پیش فقیر خواندہ بود۔ سہ شعر از و انتخاب افتادانیست (۱)۔

کارواں اشک کا ہوتا ہے رواں آنکھوں سے ۔ تم کو بھی آہ و فغاں ہم یہ خبر کرتے ہیں
کوئی اگر تم میں سے چلتا ہے تو آجائے شتاب ۔ ورنہ اب یار تو کوئی دم میں سفر کرتے ہیں
کچھ نگہ میں نہیں آتا ہے بجز جلوۂ یار ۔ جبکہ ہم دل میں عظیم اپنے نظر کرتے ہیں

(۷) عشق

شاہ گھسیٹا ئی عشق کہ در عظیم آباد بسیار بہ عزت و حرمت بسر می برد از وست۔

روز و شب تجھ سے گو ملا کیجے ۔ چین اس پر نہ ہو تو کیا کیجے
جتنے جور و ستم ہوں تو کر دیکھ ۔ یہ نہ ہوگا کبھی گلا کیجے
دل نے مجھ کو بہت ستایا ہے ۔ کسی کافر سے آشنا کیجے

ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا ۔ نہ دیکھا سو دیکھا جو دیکھا نہ دیکھا
وہ آیا نظر بارہا پر کسی نے ۔ یہ حیرت ہے اس کا سراپا نہ دیکھا

---

(۱) از وست بجائے انیست (ن خ)

تری چینِ ابرو مرا غنچۂ دل — یہ عقدے ہیں وہ جن کو کھلتا نہ دیکھا
خدا کی خدائی ہے قائم پہ تجھ سا — نہ دیکھا نہ دیکھا، نہ دیکھا نہ دیکھا
میں رو رو کے اشکوں سے کی شیشہ بازی — یہ ہنس ہنس کے تو نے تماشا نہ دیکھا
خدا جانے کیا منہ بھر آئی ہے اس کو — لبِ زخمِ دل جو کبھی وا نہ دیکھا
سبھی دعوئے عشق رکھتے ہیں یارو — پہ کوئی عشق سا ہم نے رسوا نہ دیکھا

سو رات ہجر غم میں فلک تو ڈبو سکا — پر ایک دن وصال کا تجھ سے نہ ہو سکا
کس رو سے طعنہ زن ہے خراباتیوں کو شیخ — خرقہ کو اپنے وہ تو ریا سے نہ دھو سکا

دمبدم دل کو مر نہیں آتا — اس پہ بھی اس سے بر نہیں آتا
خانماں کر چکا ہوں میں برباد — اس پہ میرے وہ گھر نہیں آتا
تو جو اتنا ہمیں ستاتا ہے — کیا خدا کا بھی ڈر نہیں آتا
خاک جو شہر میں لگی اڑنے — عشق کیا چشم تر نہیں آتا

کہنے کو ادھر ادھر گئے ہم — تھے تیری طرف جدھر گئے ہم
تا جان نہ ہو عدول حکمی — تو نے کہا مر تو مر گئے ہم

ہم نے تو خاک بھی دیکھا نہ اثر رونے میں — عمر کیوں کھوتے ہوئے دیدۂ تر رونے میں
رات کب آئے تم اور کب گئے معلوم نہیں — جان اتنی نہ رہی ہم کو خبر رونے میں
جب تلک اشک تھمیں بیٹھ اگر آیا ہے — تیری صورت نہیں آتی ہے نظر رونے میں
تجھکو اے دیدۂ تر شغل ہے رونا لیکن — ڈوبا جاتا ہے یہاں دل کا نگر رونے میں

جب تلک اشک تھے آنکھوں سے بہا نے نکلو
اب نکلتے ہیں پڑے لخت جگر رونے میں
عالم عشق میں مجنوں بھی بڑا گاڑھا تھا
یار مجنوں سے بھی ہم گاڑھے ہیں رونے میں

کوئی بت کہتے ہیں اور کوئی خدا کہتے ہیں
ہم سے جو پوچھو تو دونوں سے جدا کہتے ہیں
دل کے دینے کے برابر کوئی تقصیر نہیں
جو مجھے کہتے ہیں سو یارو بجا کہتے ہیں

بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں
عشق رخصت دے تو شور حشر اب برپا کروں

جوں آفتاب تاباں گو نام کو نہاں ہوں
یہ پرتو ہے تیرا ٹک دیکھ میں کہاں ہوں
گو نام اور نشاں ہے ظاہر میں یار ومیرا
جو دیکھو فی الحقیقت ہوں ہم یا گماں ہوں
باتیں نہ سن تو میری جل جائے گا دل اے
میں برق آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

دل غم سے خوں ہو بہ گیا اور آنسو تھم چلے
آتا ہے جان ابھی کوئی دم میں ہم چلے

جاتے ہوئے دم کو کوئی روکے بھلا کب تک
آتا ہے تو آجا کہ نفس باقی ہے اب تک
پہنچی ہے یہاں ضعف سے ئہ عشق کی حالت
جو سانس یکا یک نہیں آسکتی ہے لب تک

دل سا جگر جو رکھے سو اس سے دو بدو ہو
منہ دیکھیو آئینہ کا جو اس کے روبرو ہو
حسرت کو دل میں مت رکھ شمشیر آزما لے
ہم مر گئے بلا سے دنیا ہو اور تو ہو
حالت کو دیکھ میری کہتے ہیں گبر و مومن
ہو مشکل اس کی آساں یا رب یا یک سو ہو

بری آنکھوں میں بستا اک جہاں تھا
ڈبویا آہ اشکوں نے جو یہاں تھا
خیال غیر واں آنے نہ پایا
نفس کوچہ میں دل کے پاسباں تھا

نہو مغرور اتنا بلبلو تم — ہمارا بھی کبھی یہاں آشیاں تھا
مگر نعرہ کیا تھا عشق تو نے — زباں پر برق کی جو الہ[1] یہاں تھا

کیا کیا جفائیں ظالم ہم نے تری سہیں ہیں — لیکن شکایتوں سے لب آشنا نہیں ہیں
کہہ بعد قتل مجھکو کس طرح چین آوے — جو حسرتیں تھیں دل میں سبھوں کی تو وہیں ہیں

اوروں کا جگر یا رجو تیروں سے ہے ہی — یہ عاشقِ جاں باختہ کس دن سے کے لئے ہے

مے دردِ دل ہے باقی نے آہ نے فغاں ہے — اے سوزِ عشق سچ کہہ تو ان دنوں کہاں ہے

دیکھئے[2] بن اس کے اک دم چین سے رہتا نہیں — اس دل کافر کے ہاتھوں سخت گھبرائے ہیں ہم

لے آسماں اپنا اور یہ زمیں دونو — عاشق تو چھوڑ بیٹھے دنیا و دیں دونو

رباعی

کعبہ میں بہت خاک اڑائی ہم نے — بت خانہ میں صورت بھی نہ پائی ہم نے
آخر کو کہا عشق نے ہم سے کچھ اور — دیکھا تو یونہیں عمر گنوائی ہم نے

دیگر

دنیا کے لئے نہ ترک تازی کیجے — ہر طرح سے عشق حیلہ سازی کیجے
ٹک دل میں سمجھ کے اپنے انصاف تو کر — کس زیست پہ اتنی شہ بازی کیجے

---

(۱) جو الا یہاں تھا (ن خ) (۲) دیکھیے (ن خ)

دیگر

مت پوچھ کہ تجھ بغیر کیونکر گذری | دل ہی جانے ہے آہ جونکر گذری
فریاد و فغان و آہ کرتے ہی رہے | اپنی تو تمام عمر یونکر گذری

حرف غین

(۱) غضنفر

غضنفر علی خاں غضنفر تخلص عرف میاں کہلو[۱] نبیرۂ پسری غلام حسین خاں کردرہ کہ در اصل ایشاں کھتری بودہ اند و از مال دنیا نیز بہرۂ وافی داشتند. جوانِ خلیق و خوش وضع است و بہ شاگردیٔ قلندر بخش جرأت اتبا ز تمام دارد۔ ازوست۔

تصور میں ہوا اس سے دوبدو ہم | کیا کرتے ہیں پہروں گفتگو ہم
گیا اب وہ گریباں ہی کہ جس کے | سدا رہتے تھے مشتاق رفو ہم
کھنچی دیکھی جو کل تصویر مجنوں | تو گویا بیٹھے تھے بس ہو بہو ہم
کفن دے ہم کو دو آنسو بہا نا | کہ بعد از مرگ یاد ہیں آبرو ہم
نہ آیا مرتے دم بھی وہ غضنفر | چلے دنیا سے کیا پر آرزو ہم

(۲) غیرت

شاگرد جرأت۔ ازوست۔

یا کسی ڈھب سے آپ آجاؤ جی | یا ہمیں کو کہیں بلاؤ جی
جان آنکھوں میں آرہی ہے جان | اب تو صورت ہمیں دکھاؤ جی

---

[۱] ن، کھیلو۔ (ر)

زندگی سے تنگ آیا ہوں　　بس اب آگے تو مت ستاؤ جی
وہ بگاڑے ہزار تم غیرت　　اب اُسی سے بنائے جاؤ جی

(۴) غلامی

تخلص شاہ غلام محمد از قدما است۔ با شاہ حاتم دوستی داشت و اکثر مثل ایشاں بر تکیہ شاہ تسلیم می نشست۔ شعرے از وست۔

کل جس کی نگہ تیر سی براں ہوئی دل پر　　پھر آج وہی دور سے قاتل نظر آیا

حرفُ الفا

(۱) فراق

تخلص ثناء اللہ خاں برادر زادہ ہدایت خاں ہدایت جوانِ حلیم و سلیم و خوش فکر و شیریں گفتار استفادہ شعر از خواجہ میر درد کردہ بلکہ ذات شریفش را ہمیشہ از کاملانِ ایں فن قیاس میکرد آخر آخر پیشِ حشمت پناہ فقیر تحصیلِ طب کردہ نام بہ طبابت برآوردہ چنانچہ حالا بحکیم ثناء اللہ خاں شہرت دارد۔ دیوانِ ریختہ اش شستہ و رُفتہ است۔ فقیر تا در شاہجہاں آباد بود رابطۂ دوستی روز بروز رو در ترقی داشت و اکثر بانیٔ صحبت مشاعرہ ہا او بود۔ حق تعالیٰ آں عزیز را ہر جا کہ باشد سلامت دارد(۱) از وست

خنجر لو ہاتھ میں نہ میاں تم کنار لو　　اس صید ناتواں کو نگاہوں ہی مار لو

یارانِ عدم سے کوئی کہہ دو کہ سدھاریں　　ہم پیچھے چلے آتے ہیں ہم کو نہ پکاریں

---

(۱) از ابکار افکار اوست (ن ح)

گل کا یہ منہ ہو کہ ہوا اس کف پا کے نزدیک
آئینہ ہو نہ سکے جس کی صفا کے نزدیک

کس زلف کا شیدا ہو مرا دل نہیں معلوم
کس چشم کا زخمی ہے یہ بسمل نہیں معلوم
ہر غنچہ میں بو ہے تری ہر گل میں ترا رنگ
جس پر بھی تری شکل و شمائل نہیں معلوم
کیا جانئے کدھر کشتی لگے لخت جگر کی
دریائے غم اشک اپنے کا ساحل نہیں معلوم
سمجھائے کسی کے بھی سمجھتے ہیں دوانے
کیوں پاؤں میں پڑتی ہے سلاسل نہیں معلوم
مجنوں سے کے سوا دیکھئے اب وحشت جنوں میں
ہو کون فراق اپنے مقابل نہیں معلوم

غیر کے دل میں نہ جا کیجے گا
میری آنکھوں میں رہا کیجے گا
کاسۂ چشم کو لے در پہ ترے
بے نوایانہ صدا کیجے گا
زائران حرم و دیر کبھو
میرے حق میں بھی دعا کیجے گا
دل سے اس اپنی سیہ بختی پر
خواہش زلف رسا کیجے گا

کروں کیا وصف میں صیاد تیری خوش نگاہی کا
ہر اک دام نگہ میں جال ہے کیا پشت ماہی کا
متاع دل فراق ارزاں ہے یوں بازار خوباں میں
کہ جیسے مال بکتا ہے کسی مفلس سپاہی کا

آنکھوں ہی نے اس شوخ سے پیماں راہ نکالی
ساتھ اپنے ڈبویا مجھے کیا چاہ نکالی
گو جان سے جائے تو فراق اس کے الم میں
پر دیکھیو تو نے جو کبھو آہ نکالی

(۲) فیض

میر فیض علی فیض تخلص پسر میر محمد تقی میر جوان صلاحیت شعار است بمقتضائے

موزونیٔ طبع کہ موروثی است، گاہ گاہے بر وضعِ خاندانِ خود لب بزمزمۂ ریختہ می کشاید و اندکی حصہ[1] از پدر ہم دارد۔ از وست۔

نہ مانی تونے میری اپنی ہی ضد بیوفا رکھی
کہیں اب کس سی ہم جا کر ہماری تجھ نے کیا رکھی
شبِ وصل آئی تھی یار و سلوس بدطلعی سحر کا تی
ہمارے اپنے اُس نے درمیاں تلوار لا رکھی
کدورت جب بتا انداز سے نکلا ہی کی تیری
ہماری خاک اُس کوچہ میں تو نے کب صبا رکھی
بنائے صانعِ قدرت نے کیا کیا پھول گل بوٹے
پر اس گلبدن میں کچھ ادا سب سے جدا رکھی

دور میں ساقی ترے آ نکلے ہیں مے نوش ہم
جام خالی دے ہے کیا آتے نہیں بیہوش ہم
سر فرو لاتے نہیں ژولیدہ مویاں عشق کے
سایۂ بالِ ہما رہا رکے ہیں پاپوش ہم
بے زبانی کی نہ پوچھو وجہ ہم سے کوفت میں
چوٹ کچھ ایسی لگی دل پر کہ ہیں خاموش ہم
شوق میں تیرے کنار و بوس کے اے بحرِ حسن
موج کے مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم
دل نہیں رہتا کہ چھپ کر دیکھ لیویں[2] ورنہ فیض
عمر گذری نا کسی سے اپنی ہیں روپوش ہم

گل کھا موئے جنھوں کے لئے جسم زار پر
دو پھول بھی نہ لائے کبھی وہ مزار پر
یاری کی مت امید رکھا کر رقیب سے
میں ایک ناتوان ہوں بھاری ہزار پر
کیا کیا طیور آ کے سرِ تیر پھر گئے
کچھ ان دنوں نہیں ہے ترا دل شکار پر
یہ فیض ساری صورتیں ہیں مٹنے والیاں
مت بھول آ یہاں کے تو نقش و نگار پر

(۳) فغاں

اشرف علی خاں فغاں عرف کوکہ خاں یعنی کوکۂ احمد شاہ بادشاہ از دورۂ ثانیین

(۱) حصہ از عجب پدر ہم دارد۔ (ن خ) (۲) ہو کھو ویں میں ورنہ فیض (ن خ)

است۔ شعر را بصفائی تمام می گوید و نسبت شاگردی بہ ندیم می رساند چنانچہ خود گفتہ ؎

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں — دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہوئے گا

و در ایامیکہ بہ سببِ تفرقہ شاہ از شاہجہاں آباد برآمدہ بہ طرف پورب گذر افگند و معرفتِ میر محمد نعیم خاں کہ ہم مکتب ایشاں بود بہ ملازمتِ نواب شجاع الدولہ بہادر رسیدہ یکے از مقربان گردید۔ در ہماں نزدے رونسے نواب وزیر دستش را در عالم اختلاط بہ فلس سوختند آب در دیدہ گردانید و ہیچ نگفت و آخر ہمیں حرکت آزردہ شدہ بہ طرفِ عظیم آباد رفت و در سرکار راجہ شتاب رائے بہ ندامت پیشگی پیش آمدہ اقتدارِ کلی بہم رسانیدہ بود چند سال است کہ ہماں جا زندگانی را جواب دادہ۔ ازوست ؎

مت قصد کر صبا تو دلِ داغدار کا — ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا
کرتا ہے وصل میں در و دیوار پر نظر — تجھکو مزا پڑا ہے فغاں انتظار کا

عالم کو جلاتی ہے تری گرمیٔ بازار — مرتے ہم اگر سایۂ دیوار نہ ہوتا

رفتہ رفتہ بہت خوش قد مرا آفت ہوگا — قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا
کیا سبب ہی کہ نہ آیا مرے نامہ کا جواب — خیر ہو یار کی قاصد تو سلامت ہوگا

ایسی نگاہ کی کہ مرا جی نکل گیا — قصہ مٹا، عذاب سے چھوٹے خلل گیا
آئی بہار پھر تو یہ سن لیجیو فغاں — زنجیر کو تڑا کے (۱) دوانا نکل گیا

آ ہمارے گھر میں تجھے عار ہو گیا — ایسا فغاں کے نام سے بیزار ہو گیا

(۱) توڑا کے۔ (ن خ)

آنکھوں نے بے سفینۂ الفت ڈبو دیا　　کچھ بس نہ چل سکا تو مری جان رو دیا
کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سُنا[1] نہیں　　خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا
اُس کے وصال و ہجر میں یونہی گذر گئی　　دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

دلبستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے　　گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا

تجھکو روزی ہو مری جان دعائیں لینا　　مجھکو ہر شب تری زلفوں کی بلائیں لینا

فغاں نکہ[2] تری کہنے کی احتیاج نہیں　　یہ عشق ایسا ہی ظالم ہے ہاں مرے صاحب

تڑپے ہو دست غیر کسی آرزو کے بیچ　　ناصح نہ دیر کیجیو ہرگز رفو کے بیچ
قاتل کا داد خواہ میں کیونکر ہوں روز حشر　　لوہو مرا بہا ہی[3] یا شست و شو کے بیچ

لکھا ہے نامہ بر در و دیوار یار پر　　گزرا جو کچھ الم دل امیدوار پر
ممکن نہیں کہ غیر نہ ہووے رکاب میں　　تجھکو خدا نہ لائے ہمارے مزار پر
کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاں　　یہاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار پر

کبھی نہ گل سے محبت نہ بو سے ہی اخلاص　　تجھے بھی دہر میں ظالم کسو سے ہی اخلاص

دیکھئے خاک میں مجنوں کی اثر ہے کہ نہیں　　دشت میں ناقۂ لیلی کا گذر ہے کہ نہیں

---

(۱) سے۔ (ن خ) (۲) نکہہ (ن خ) (۳) مرا (ن خ)

توشۂ راہ سبھی ہم سفراں رکھتے ہیں
تیرے دامن میں فغاں لخت جگر ہی کہ نہیں

عاجز ہوں ترے ہاتھ سے کیا کام کروں میں
کر چاک گریباں تجھے بدنام کروں میں

گر روزِ جزا داغِ شبِ ہجر دکھاؤں
تو صبحِ قیامت کے تئیں شام کروں میں

تا حشر نہ کم ہووے گی ظالم تپشِ دل
کافر ہوں اگر گور میں آرام کروں میں

جاتا ہے فغاں قافلۂ ہم نفساں کل
کچھ راہ کے چلنے کا سرانجام کروں میں

ہو کر ترے قفس سے میں آزاد کیا کروں
بے بال و پر ہوں لے کے صیاد کیا کروں

نے زندگی میں وصل میسر نہ بعدِ مرگ
عاجز ہوا ہوں لے کے دلِ ناشاد کیا کروں

مبتلائے عشق کو اے ہمدماں شادی کہاں
آ گئے اب تو گرفتاری میں آزادی کہاں

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

باد صبا تو عقدہ کشا اُس کی ہو جیو
مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہ رکھ
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے تو ڈر کہیں

رونا جہاں تلک تھا مری جان رو چکا
مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں

باور اگر نہیں تجھے آتا تو دیکھ لے
آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہیں

نہ دل چمن میں لگے ہے نہ کوہ و صحرا میں
کوئی مکان بھی میرے لئے ہے دنیا میں

کیا تجھ سے خوش رہے ہے دلِ ناشادِ زندگاں
اتنا بھی تو نہیں کہ کرے یادِ زندگاں

وا ماندگانِ راہِ عدم گوش کیجیو | بانگ جرس نہیں یہ ہی فریادِ رفتگاں

رکھتا ہے دوست چرخ مرے دودِ آہ کو | زلفِ سیہ سے ربط ہی بختِ سیاہ کو
مہرِ علی ہی دل میں نہ کر خوفِ روزِ حشر | تو لے چلا ہے ساتھ فغاں زادِ راہ کو

صیاد راہِ باغ فراموش ہو گئی | کنجِ قفس سے مت مجھے آزاد کیجیو

تقویت ہی داغ سے میرے دلِ بیمار کو | لے فلاطوں کیا مرض کہتے ہیں اس آزار کو
نقدِ دل لے کر فغاں کا چھوڑ دینا ہی عبث | گرم کرتی ہی خریداری ترے بازار کو

مجھ مبتلا کی چشم کہاں تک پُر آب ہو | لے دل خدا کرے ترا خانہ خراب ہو
جم جم پلائے دوست مجھے روز جامِ مے | تو مست رہ فغاں ترا دشمن خراب ہو

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گذر گئی | لے عندلیب تو نہ قفس بیچ مر گئی
شکوہ تو کیوں کرے ہی مرے اشکِ سرخ کا | تیری کب آستین مرے لوہو سے بھر گئی
تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں | انصاف تو نہ چھوڑ مروت اگر گئی
مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے | یوں بھی گذر گئی مری ووں بھی گذر گئی
آخر فغاں وہی ہی اسے کیوں بھلا دیا | وہ کیا ہوئے تپاک وہ الفت کدھر گئی

ڈرتا ہوں محبت میں مرا نام نہ ہووے | دنیا میں الٰہی کوئی بدنام نہ ہووے
شمشیر کوئی تیز سی لینا مرے قاتل | ایسی نہ لگانا کہ مرا کام نہ ہووے

آتا ہی مری خاک پہ ہمراہِ رقیباں — یعنی اُسے تربت میں بھی آرام نہ ہووے
جی دیتا ہے بوسے کی توقع پہ فغاں تو — ٹک دیکھیو سودا یہ ترا خام نہ ہووے

صنم نامہرباں ہی اس قدر وجہ غضب کیا ہی — مری تقصیر کچھ ثابت نہیں اے میری رب کیا ہی
قدم پر ہاتھ جب رکھتا ہوں یوں کہتا ہی جھنجلا کر — یہ گستاخی مجھے بھاتی نہیں اے بے ادب کیا ہی
صبا ہر ایک گل سے پوچھیو گلشن میں تو جا کر — گریباں چاک رہتا ہی فغاں اس کا سبب کیا ہی

دل زلف میں اُلجھے مجھے آرام یہی ہی — میں صیدِ بلاکش ہوں مرا دام یہی ہے
کر چاک گریباں تجھے ہر صبح دکھاؤں — میں عاشقِ صادق ہوں مرا کام یہی ہے
بھر لیجیو دامن میں فغاں لختِ جگر کو — ہم خانہ بدوشوں کا سرانجام یہی ہے

قاصد تو نا امید پھرا کوئے یار سے — خفت ہوئی مجھے دلِ امیدوار سے
کل دیکھتا ہوں کیا کہ سرِ راہ ایک شخص — کہنے لگا فغاں نہیں شاکی تو یار سے
میں نے دیا جواب کہ سنتا ہے اے عزیز — ہے دور مرتبہ مرے صبر و قرار سے

یہ فن کسے نہیں آتا کہ دل میں راہ کرے — فغاں میں اُس کے تصدق ہوں جو نباہ کرے

وہ چاہے یا نہ چاہے فغاں آپ چاہئے — اپنی طرف سے ہاں[1] مرے صاحب نباہئے
مر جائیے کسی کو نہ دنیا میں چاہئے — کیا کیا ستم سہے مری چھاتی سراہئے

---

(۱) ملے مرے صاحب. (ن خ)

ظالم تجھے قسم ہے جو اُس کو جلا نہ دے — یہ دل بھی دل نہ ہووے جو تجھکو دعا نہ دے
قاتل کے کیوں قدم سے تڑپ کر پڑا ہے دور — بسمل تو اپنے ہاتھ سے شرطِ وفا نہ دے
بے طرح جوشِ گل نے لگائی چمن میں آگ — ڈرتا ہوں آشیانہ کو کافر جلا نہ دے
تیرے ہی دل سے پوچھئے اس غم کو ہاں فغاں — الفت بُری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

اثر کرتی نہیں اُس بت کے دل میں آہ کیا کیجے — عجب حالت ہے میری اے مرے اللہ کیا کیجے

یار اگر جفا کرے چاہئے دل وفا کرے — یہ نہ کرے تو کیا کرے وہ نہ کرے تو کیا کرے

میں اپنے درد دل کہنے کے صدقے — ترے سُن سُن کے چپ رہنے کے صدقے

نہ کھولئے ترے بندِ قبا تو کیا کیجے — دلِ گرفتہ کو ظالم کبھی تو وا کیجے

نہ ہمیں گل سے غرض ہے نہ تمنائے چمن — کیا اسیرانِ قفس کے تئیں پروائے چمن

ترے فراق میں کیونکر یہ دردناک جئے — مرے تو مر نہیں سکتا جئے تو خاک جئے

(۴) فدوی

محمد محسن فدوی تخلص ولد میر غلام مصطفٰے خان قوم سید حسینی بہ لاہور تولد یافتہ و شانزدہ سالہ در سنِ آمدِ فرخ سیر از میلادِ خود بہ شاہجہاں آباد آمدہ۔ فدوی قدیم ہمیں است در شعر شاگردِ شاہ مبارک آبرو بودہ۔ طرز شعر بطور قدما اکثر منتظم با یہام است و از بسکہ

بزرگانش درویش بوده اند خودہم اوقات بہ درویشی گزرانیدہ وہرگز نوکری نہ کردہ۔ ستار را بخوبی می نوازد۔ تا فقیر در شاہجہاں آباد بود گاہ گاہے بر سرِ کوچہ و راہے ملاقات می شد۔ ازوست۔

یار جو ہم سے سدا چیں بجبیں رہتا ہے	نہیں معلوم بلا کونسی پیش آنی ہے

(۵) فدوی عظیم آبادی

از نامش اطلاع نہ دارم۔ ازوست

وہ کافر ہماری شب تار ہے	جسے دیکھنا صبح کا عار ہے

ہو ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم[1] سے نکلے	عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

قطعہ

شب ہجراں کی اور تو فدوی	ہم سے تقریر کر نہیں آتی
پر یہ وہ رات ہے کہ جس کی ہمیں	صبح ہوتی نظر نہیں آتی

(۶) فدوی لاہوری

شاگرد صابر علی شاہ صابر تخلص گویند بقال پسری بود تو مسلمان شدہ و بہ غلامی مرزائی نام برآوردہ و تربیت یافتہ۔ مرزا محمد رفیع در ہجو او کہ مذکور بقال و بوم آوردہ ایں کنایہ دلیلِ ساطع بر مقولہ مؤلف است۔ الحاصل چوں ازاں طرف آوردہ شدہ بہ ملک ہندوستان رسید دعوائے شاعری[2] در دماغش جا داشت و زیادہ از مرتبہ شاعری قدم در راہِ امرد پرستی می گزاشت چند جا خانہ جنگی ہم کردہ و بہ کودکان حسین

---

(۱) ن خ میں "محروم" ہے لیکن حاشیہ پر "مرحوم"۔ (۲) شاعری خیلے در دماغش۔ (ن خ)

تعشق رزیدہ۔ اکثر اعضایش دیدم کہ مجروح بودند۔ درایامیکہ از شاہجہاں آباد و دکھیتر[1] آمد دراں روزہا فقیر در آنولہ بود کہ شورش او بہ سمع رسیدہ آخر روزے برائے دیدنش رفتم او باش چندگرداو نشستہ دیدم صحبتِ شعر میان آمد بعد چند روزے شنیدم کہ بہ سرکارِ نواب محمد یار خاں کہ ذکرِ ایشاں گذشت نوکر شد ہرگاہ بعد دو سہ ماہ میاں محمد قائم وغیرہ و فقیر ہم بار ارباب مجلسِ ایشاں شدند بسبب برہم زدگیٔ مزاجِ نواب کہ بیانِ آں موجب تطویل است برخاستہ رفت و بعد شکستِ ضابطہ خان در سکرتال از مرہٹہ ہا باجل طبعی در قصبہ مراد آباد در گذشت۔ عمرش از پنجاہ متجاوز خواہد بود در گفتنِ قطعہ طویل در ہر غزل ید طولیٰ داشت و نازشِ شاعریِ او اکثر برہمیں بود۔ حسب الفرمایش نواب ضابطہ خاں کہ پیش ازیں چندے رفیقِ ایشاں نیز بودہ است مثنویٔ زلیخا را از زبانِ ہندی نظم میکرد چنانچہ او ناتمام ماندہ۔ کلامش بر زبانِ بازاریان بسیار دائر و سائر است۔ از کلام او چند اشعار کہ بہم رسید ایں است۔

ابرو کی تیرے تیغ سی سورج ڈرے ہوئے ‏ ‏ پھرتا ہے اپنے منہ پہ سپر کو دھرے ہوئے

قامت کو تیرے دیکھ مصور نے بافسوس ‏ ‏ کھینچی قلم آہ سے تصویر ہوا پر

ملتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے ‏ ‏ ہم داد خواہ ساتھ ہیں اُس کے جہاں چلے
کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیر آہ سے ‏ ‏ یہ[2] یہی تیر ہے کہ سدا بے کماں چلے
سر پر تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار ‏ ‏ ہر اک قدم پہ روتے ہوئے خونفشاں چلے
لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں ‏ ‏ بس آنکھ او جھل ہوتے ہی اے دوستاں چلے
یاروں نے اپنی راہ لی فدوی ہیں رہ رہے ‏ ‏ وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

---

(۱) کیتھر: (ن خ) (ن) یہ ہی ہے تیر ایک (ر)

سرو نہیں باغ میں، ہے آہ کسی کی — نرگس نہیں تکتا ہے چمن راہ کسی کی

دیکھ کر ناقۂ لیلیٰ کو پکارا مجنوں — مر گئے عشق جنوں دشت میں کرتے کرتے
ایک دن اس نے دکھائی تھی مجھے گردش چشم — وہ ادا یاد رہی یار کی مرتے مرتے
نہیں تاب خموشی ہے نہ یارائے سخن — بات بھی تجھ سے جو کہتے ہیں سو ڈرتے ڈرتے
کس کو جینے کی توقع ہے بقول فدوی — عمر آخر ہوئی پیمانہ ہی بھرتے بھرتے

آنسو نہیں یہ دیدۂ تر میں بھرے ہوئے — موتی ہیں آبدار صدف میں دھرے ہوئے
خالی کر ان کو دل کے نشانہ پہ ایک بار — ترکش ترے مژہ کے ہیں جاؤں بھرے ہوئے
فدوی ہمارے دیدۂ گریاں کے فیض سے — اشجار کوہ و دشت کے یکسر ہرے ہوئے

تماشا ہو اگر آئینہ بے زنگار ہو پیدا — تحیر کے مکاں سے عکس روئے یار ہو پیدا
کھلے بالوں میں یوں چمکے ہے تیرا عارض رخشاں — کہ جوں ابر سیہ میں برق سو سو بار ہو پیدا
جسے کچھ نکتۂ تحقیق سے پہنچے خبر فدوی — اسی کے دل میں عشق حیدر کرار ہو پیدا

سب اہل جہاں پھرتے ہیں غمناک زمیں پر — اوقات کوئی کاٹے گا کیا خاک زمیں پر

(۷) فدوی

مرزا عظیم بیگ سوداگر کہ او ہم فدوی تخلص میکرد۔ چند شعر از وبہم رسیدہ اینست۔

یار گوشہ میں ہے اور عیش سے مایوسی ہے — نقش پا تک بھی مرے در پئے جاسوسی ہے

مجھ پہ یہ ظلم یہ جفا باعث — کچھ تو میں بھی سنوں بھلا باعث
ایک تقصیر بھی تو ثابت ہو — بے جہت رہتے ہو خفا باعث

(۸) فدا(۱)

مرزا فدائی(ن) حسین خاں فدا تخلص ولد آقا مرزا نبیرۂ نواب حاتم خاں در اولاد سلطان قرانوالہ مشارٌ الیہ در علم رمل بے نظیر و در فنِ طبابت وغیرہ دستگاہ نیز دارد. جوان شائستہ، عمرش دریں زمانہ بست و دو سالہ باشد کہ از ابتدا اشعارِ خود را بہ پسرِ قمر الدین منت و والدِ او ہم می نمود و از چندے بہ سبب قرب جوار غزلہائے خود بہ فقیر

(۱) فدا کے حالات کے متعلق نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے لہذا اختلافی عبارتیں رامپور اور خدا بخش کے نسخوں کی بجنسہٖ ذیل میں نقل کر دی جاتی ہیں۔

(نسخہ رام پور) مرزا فدا حسین فدا تخلص قوم مغل اللہ وردی خانی ولد آقا مرزا کہ ایشاں در فنِ رمل نظیرِ خود ندارند. جوان شائستہ عمرش دریں زمانہ بست سالہ خواہد بود کہ از ابتدا اشعارِ خود را بہ پسر میر قمر الدین منت یعنی میر نظام الدین می نماید و از چندے بسبب قرب و جوار رجوعِ ایں امر بہ فقیر ہم دارد، و غزل درست بستہ بہ سر انجام می رساند۔

(نسخہ خدا بخش) مرزا فدا حسین خاں فدا تخلص نبیرۂ نواب حاتم خاں ابن نواب غضنفر خاں در اولاد سلطان قرا لوالہ شاہزادۂ دشت قپ چاق بود جوان شائستہ عمرش دریں زمانہ بست سالہ خواہد بود کہ از ابتدائے اشعار خود را بہ پسر میر قمر الدین یعنی میر نظام الدین می نماید و از چندے بہ سبب قرب و جوار رجوعِ ایں امر بہ فقیر ہم دارد و غزل درست بستہ بہ سر انجام می رساند. از دست۔

(ن) فدا حسین (ر)

می نماید چنانچہ در فن شعر ہم بدرستی سلیقہ دارد ۔ از وست ۔

تھا ہم آپ ہیں اس سے یہ دم رہو نہ رہو
تجھے فراق میں لے یار ہم رہے نہ رہے

چاہت سے بے خبر ہے ہماری تو یا حیف
ہم چاہیں اور ہمیں تو نہ چاہے ہزار حیف

جو ادھر کو گذر تیرا کبھی باد صبا ہو گا
تو کہیو جاں کنی میں تھا فدا اب مر چکا ہو گا

نہیں کھاتا وہ قسم غیر کے گھر جانے کی
سچ جو پوچھو تو یہی بات ہے مر جانے کی

کس طرح عمر بسر کیجئے دلدار بغیر
زندگانی نظر آتی ہے نہیں یار بغیر (۱)

تیرے بیمار کو کیا شربت عیسیٰ سے ہو (۲)
کچھ دوا اس کی نہیں شربت دیدار بغیر

کر علاج اے لب جاں بخش شتابی اپنا (۳)
ہم تو بیمار ہیں اس نرگس بیمار بغیر

ہوں فدا جب سے میں دیوانہ گیسوئے بتاں (۴)
چین آتا نہیں زنجیر کی جھنکار بغیر

لے تو ہی کچھ عوض نہیں تجھ سی یار دل
قربان تیری جان پہ ایسے ہزار دل

ناکام کیا رہیں گے کچھ کام کر رہیں گے
بدنام ہوں گے تو بھی اک نام کر رہیں گے

دل تو دیا ہے جان بھی دیں گے فدا ہم آخر
آغاز عشق کا کچھ انجام کر رہیں گے

طاقت تو اب کہاں ہے اک دم رہا ہے باقی
اس ناتواں میں تیرے لے دیکھ کیا ہے باقی

---

(۱) زندگی تو نظر آتی ہی نہیں یار بغیر (ن خ) (۲) اشعار از ۲ تا ۴ ن خ میں نہیں ہیں۔

بیمارِ غم کا تیرے سب کر چکے ہیں چارا　　دیدار یار تیرا اب دیکھنا ہے باقی
گو چھوڑ کر فدا کو پہلے ہی تم سدھارے　　اس کے بھی ہم ہوں کا اک قافلا ہی باقی

قسم تو کھائی ہی بولنے کی مجھکو دیے جواب اپنا　　کیا ہی کیا جرم ہم نے ایسا ہوا ہی جس پر عتاب اپنا

نہیں[1] ہی باقی کوئی تمنا ہمیں تو ہر طور یاس ہیگی　　نہ اپنے جینے کا ہی بھروسا نہ اسکے ملنے کی آس ہیگی

غیر کی تم نے کی خوشی اور ہمیں خفا کیا　　خوب کیا بھلا کیا خیر بہت بجا کیا

کچھ اپنے تو نزدیک خطا ہم نہیں کرتے (۲) آپہی ہو خفا تم کو خفا ہم نہیں کرتے
میں بھی جو کسی بات میں بولا کہ کرد یوں (۳) تو کہنے لگے تیرا کہا ہم نہیں کرتے
میں نے جو کہا عفو کر واب مری تقصیر (۴) یوں سر کو ہلا ہنس کے کہا ہم نہیں کرتے
مختار رہا را ہی وہی ہم تو ہیں بے بس (۵) واللہ جو کرتے ہیں فدا ہم نہیں کرتے

تیروں کا ان بتوں کی دل آماجگاہ ہے　　یہاں آہ آہ کرتے ہیں واں واہ واہ ہی
وہاں ہمکنار غیر سے وہ رشکِ ماہ ہے　　یہاں کنجِ غم میں شکوۂ بخت سیاہ ہی
ظالم یہ جرم دل ہی کہ عاشق ترا ہوا　　قتلِ فدا عبث ہے کہ یہ بے گناہ ہی

دل تو اب آکے لگا تجھ سے ستمگار کے ساتھ (۶) دل لگے تو ہی بتا کون سے دلدار کے ساتھ
دشتِ مشاطہ نہ یوں کھینچ تو بیدردی سے (۷) جاں ہے وابستہ مری طرۂ طرار کے ساتھ

---

(۱) یہ شعر اصل کتاب میں نہیں ہی۔ (۲) ن خ میں اشعار ۲ تا ۷ بھی شامل ہیں۔

مبتلا عشق کا اِک شخص فداؔ نام جو تھا (۱) مرگیا سر کو ٹپک کر کسی دیوار کے ساتھ

ہوش و حواس گم ہیں بخود ہیں بےخبر ہیں (۲) کیا جانے کون ہیں ہم کس جا ہیں اور کدھر ہیں
دولت سے عشق کی ہم سلطانِ بحر و بر ہیں (۳) سینہ ہوا ہے بےنم آنکھیں تمام تر ہیں
اے آہ نیزہ بازی سینہ میں بچ کے کیجو (۴) لبریز آبلوں سے اپنے دل و جگر ہیں

شفا پاوے ابھی بیمار تیرا جو دیکھے اک نظر دیدار تیرا

یہ مرض قابلِ شفا ہی نہیں (۵) درد میرے کی کچھ دوا ہی نہیں
مجھکو اب تجھ سے کچھ گلا ہی نہیں (۶) تو تو وہ آشنا رہا ہی نہیں
ساتھ غیروں کے ہے نظربازی (۷) کبھی ادھر کو دیکھتا ہی نہیں
تاب و طاقت نے بھی جواب دیا (۸) کیا رہا اب تو کچھ رہا ہی نہیں
سیکڑوں کشتۂ تغافل ہیں (۹) کہتے ہو میں نے کچھ کیا ہی نہیں
کیا کوئی سر جھکا کے ہووے ذلیل (۱۰) ہاتھ تیرا کبھی اُٹھا ہی نہیں
خونِ دل اب تو بیٹھے پیتے ہیں (۱۱) زندگانی کا کچھ مزا ہی نہیں
اور ہی اُس کی ہو گئی ہیئت (۱۲) کل جو دیکھا تو وہ فداؔ ہی نہیں

جویائے وصالِ یار ہیں ہم (۱۳) رسوا و ذلیل و خوار ہیں ہم
تیری جولانگاہ میں ٹپک ہیں (۱۴) ہر ایک کے جی پہ بار ہیں ہم
دل کو نہ قرار ہے نہ ہے صبر (۱۵) بےصبر ہیں بےقرار ہیں ہم

---

(۱) اشعار ۱ تا ۱۵ ان نسخ میں ندارد

کہو اُس بیوفا سے یہ تو تم سے دوستاں ہوگا ۔ کہ اے نامہرباں پھر بھی کسو پر مہرباں ہوگا
رہائی[1] دام سے صیاد کے دشوار ہے ہم کو ۔ چمن میں دیکھئے پھر بھی ہمارا آشیاں ہوگا
چلوں کیا بہر طوف کعبہ باندہ احرام میں زاہد ۔ کہ کافر دل مرا وہاں بھی پرستار بتاں ہوگا

کیا کروں جاؤں کہاں کہہ اے بت خود کام میں ۔ عشق میں تیرے ہوا ہوں جا بجا بدنام میں
نا کوئی قاصد نہ مرغ نامہ[2] بر نا ہے صبا ۔ کس طرح سے یار کو بھیجوں فدا پیغام میں

موئے افسوس ہم درد نہاں کس سے عیاں کرتے ۔ یہ حسرت رہ گئی کچھ درد دل اُس سے بیاں کرتے
اگر قید قفس سے چھوٹتے جیتے تو ہم کیا ۔ چمن میں پھر گلوں کے پاس اپنا آشیاں کرتے
اگر جیتے جنوں میں اب کے ہم تو اشک خونیں سے ۔ ہر اک جنگل فدا ار و رو کے مثل گلستاں کرتے

دوستاں[3] دور کرو درد نہانی کو مرے ۔ مجھ تلک لاؤ کسی طرح سے جانی کو مرے
روز خواہش میں ترے وصل کی میں مرتا ہوں ۔ نامہ بر کہیو یہ پیغام زبانی کو مرے
سالہا جس کے لئے گریۂ یعقوب کیا ۔ کوئی لاتا نہیں اُس یوسف ثانی کو مرے
باغ میں گل کی ادا دیکھ جو میں مر ہی گیا ۔ بلبلیں آئیں فدا مرثیہ خوانی کو مرے

جب تلک تو ہی مرے درد کا چارا نکرے ۔ زندگانی ہی کو دل اپنا گوارا نکرے
بیوفا یار کو کس طرح سے میں سمجھاؤں ۔ تا مرے رو برو غیروں سے اشارا نکرے

---

(۱) ن خ میں یہ شعر ندارد اس کی جگہ یہ شعر ہے ؎

بہار آئی ہے اب کے خوب سا دیوانپن کر لیں ۔ کہ یہ شور جنوں اور موسم گل پھر کہاں ہوگا

(۲) مرغ نامہ بر ہے نے صبا ۔ (ن خ) (۳) یہاں سے فدا کے باقی تمام اشعار ن خ میں نہیں ہیں

کون پہنچائے مرا نامہ و پیغام اُسے
جس کے کوچہ میں کبوتر بھی گذارا نہ کرے

میں تو اُس سے نہ ملوں ہائے کروں اسکو کیا
اُس کی الفت جو مرے دل سے کنارا نہ کرے

اُس جفاکار کی جس وقت مجھے یاد آئی
آہ لب پر وہیں کرتے ہوئے فریاد آئی

تیرا سایہ طرفِ آبِ رواں دیکھا تھا
ہر شناور کو نظر شکلِ پریزاد آئی

باغ میں چاک گریباں ہر اک گل نے کیا
جبکہ بلبل بہ گرفتاریٔ صیاد آئی

قتل پر میرے تو انگشت بدنداں جو ہو
آج کیا جی میں ترے لے مرے جلاد آئی

شب جو اک میرے تڑپ اس کا میں لے آیا تھا
اک پری خواب میں لے خنجرِ فولاد آئی

اک بگولا سا گلستاں کی طرف اُٹھتا تھا
کل صبا خاک مری کر کے جو برباد آئی

آگے اُس بت کے فدا طاقتِ گفتار ہے کب
بات کہنی مجھے اُس وقت خداداد آئی

موئے مژگانِ بتاں خنجرِ فولاد ہیں سب
خوبرو جتنے ہیں حق میں مرے جلاد ہیں سب

اب پسینے کی جگہ خوں ہے بدن سے جاری
بال گویا کہ مرے نشترِ فصاد ہیں سب

شاعری چھٹ ہی گئی میں نے کئے علم حصول
لیکن اُن کے بھی جو ہیں قاعدے وہ یاد ہیں سب

لکھنؤ ہی ہے برا شہر جہاں مجھ سا شخص
یوں ہے برباد بلا سے اگر آباد ہیں سب

میں نہ دیکھوں گا فدا شکل پریرویوں کی
طائرِ دل کے لئے میرے یہ صیاد ہیں سب

قفس میں جیسے ہو مرغِ قفس تہ و بالا
کرے ہے دل کو یہ بانگِ جرس تہ و بالا

کیے ہے چین کشاکش میں بحرِ ہستی کی
حباب وار ہیں سب ہم نفس تہ و بالا

سحر کو فکرِ معاش اور شب کو عشقِ بتاں
ہمیشہ دل کو رکھے ہے ہوس تہ و بالا

ہماری آنکھوں نے اب کے جو خشک سالی کی
تو لوگ کیسے ہوئے اس برس تہ و بالا

جو مسجدیں بھی بناؤ تو نیک نیت سے کرے نہ زلزلہ جن کے کلس تہ و بالا
فدا یہ آہ تھی کیسی ابھی جو کی تو نے جگر کی ہو گئی ہر ایک نس تہ و بالا

شق جو قبریں ہیں انھیں سمجھو نہ گل کا اضطراب مر مٹے پر بھی نہیں مٹتا ہی دل کا اضطراب
رہ گیا آتش پہ جم کر کس طرح سے یہ سپند کھو دیا کس نے ترے عارض کے تل کا اضطراب

حرف قاف

(۱) قدرت[1]

مولوی قدرت اللہ قدرت تخلص در عربی و طبابت مہارتِ تام دارد، بندہ اورا تا در شاہجہاں آباد بود اکثر میدید۔ بمیان ثناء اللہ خاں فراق ماسوائے شاگردی و استادی دوستی تمام داشت۔ از وست۔

زلفوں میں اگر دل یہ گرفتار نہ ہوتا یوں روز مرا آہ شب تار نہ ہوتا
ہم دام میں پھنستے ترے صیاد تب آکر رہنا جو قفس میں ہمیں دشوار نہ ہوتا

(۲) قدرت

مولوی قدرت اللہ قدرت تخلص مولف تذکرۂ ہندی گویان کہ بالفعل در رامپور استقامت وارد، فقیر اورا در ایامیکہ بہ رفاقتِ نواب محمد یار خاں عز و امتیاز داشت پیش محمد قائم روزے دیدہ بود از وست۔

لاکھوں جلا دے مردہ صد سالہ آن میں فیضِ دمِ مسیح ہے اُس کی زبان میں

---

(۱) قدرت کی جگہ ن ح میں قاسم ہے۔

نکلی تھی رات دل سے مرے بیدریغ آہ | ہنگامہ ایک پڑ گیا ہفت آسمان میں
انصاف بھی ضرور ہے یہ ظلم تا کجا | لاکھوں کے گھر تو جاتے رہے امتحان میں

(۳) قیس

مرزا احمد علی بیگ عرف مدارا بیگ قیس تخلص ولد مرزا مراد علی بیگ ابن داؤد بیگ کہ سوداگر متمول بود، نبیرہ مرزا عاقل بیگ کلیدار روضۂ امام موسیٰ رضاؑ۔ وطن بزرگانش مشہد مقدس و خودش بہ لکھنؤ فیض آباد تولد و نشو و نما یافتہ۔ بمقتضائے موزونی طبع ہرچہ کہ موزوں کردہ از نظر جعفر علی حسرت گذرانیدہ۔ از وست۔

میں کہوں کچھ اور تیری گفتگو کچھ اور ہے | ہو گیا کچھ اور ہیں یا آج تو کچھ اور ہے
ایک دن اس دل کے ہاتھوں آ بنے گی جان پہ | واں ارادہ اور کچھ یہاں آرزو کچھ اور ہے
دل تو ہم سے لے چکا ہے وہ کہے گا ہم نشیں | اب تلاش دل نہیں ہے جستجو کچھ اور ہے
شاید اس گل سے کیا ہے تو نے شب بوس و کنار | آج تو اے قیس تیرا رنگ رو کچھ اور ہے

بات گئی ہاتھ پھر آتی نہیں | یار گیا جان تو جاتی نہیں
باغ میں کس گل کی ہے آمد کہ جو | نکہت گل پھولی سماتی نہیں
جب سے ہوا غیر کا وہاں بندوبست | خیر و خبر دل کی کچھ آتی نہیں
جب سے لگی اس بت کافر سے آنکھ | موت تو کیا نیند بھی آتی نہیں
داغ یہ تو داغ جو کھاتا ہے قیس | کیا تری چھاتی کی تو چھاتی نہیں

وصیت ہے مرا احوال گر نوع دگر ہووے | تو مجھکو دفن واں کیجو جہاں اس کا گذر ہووے

چاہت کی لذتوں سے جو لوگ بےخبر ہیں — صد حیف اُن کا جینا وہ کون سے بشر ہیں

دلِ مضطرب کا دیکھا عجب اضطراب اُٹھا — ہوا اور مضطر اُس نے جو ذرا نقاب اُٹھا

ہو آنا تیرے کوچہ میں اپنا شعار رہے — ملنا نہ ملنا آگے ترا اختیار رہے

سنگِ جفا سے شیشۂ دل توڑ تاڑ کر — بس اُٹھ چلے نہ کھیل کو پیارے بگاڑ کر

تن پر مرے زخموں سے جا کہ نہیں خالی ہے — اور رہا ہے ستم اُس نے پھر تیغ سنبھالی ہے

وہاں وہی نازکی اک آن چلی جاتی ہے — شدتِ شوق سے یہاں جان چلی جاتی ہے
کونسا رشکِ چمن باغ سے کرتا ہے سفر — جو صبا بے سر و سامان چلی جاتی ہے
کوئی جھڑکی ہمیں دے ہے کوئی دے ہے دشنام — عشق میں اپنی بھی گذران چلی جاتی ہے

رہی تن من کی سدھ ہم کو نہ جن کی یادگاری میں — بھلائیں وہ ہمیں پتھر پڑیں پھر ایسی یاری میں

شبِ فراق میں برہم جو مجھ سے یار رہا — تو میں فراق نصیب اپنے من کو مار رہا

(۴) قدرت

شاہ قدرت اللہ قدرت تخلص کہ بطرفِ عظیم آباد قیام دارد شخصِ کہنہ مشق و با قوت وقدرت است۔ اما فقیر او را ندیدہ۔ یک غزلش کہ بر السنۂ صغیر و کبیر جاریست و شہرت تمام

یافتہ (۱) با چند شعر دیگر بقلم آوردہ۔ از دست۔

کس کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے — جو شرر دل سے اٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یہاں سے کر گئے — اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
حسن کو اپنے ہواداروں سے کاوش ہے مدام — ہر طپش یہاں شمع کی برقِ دلِ فانوس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہے ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجے زندگی — اس طرف آوازِ طبل اور دھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام ہوتا ہے گلوں کا دور — شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف — جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنت دنیا سے آج — کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے
ایک ہی پردے کے یہ سب سمجھے تو ہیں الاپ — گر صدائے بانگ ہے ور نغمۂ ناقوس ہے
کل تو قدرت پائے خم (۲) رکھتی تھی تسبیحِ ریا — آج رہنِ جامِ مے یہ خرقۂ سالوس ہے

آہستہ رو رفیقوں نے منزل کو طے کیا — رفتارِ تیز نے مرے (۳) ناقہ کو پے کیا

حسرت اے صبحِ طرب ہم سے وطن چھوڑا ہے — مژدہ اے شامِ غریبی کہ وطن چھوٹے ہے
اب تلک تیرے شہیدوں کے بنِ ہر مو سے — لاکھ فوارۂ خوں زیرِ کفن چھوٹے ہے

ہم پر ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا — یار گھر جانے لگا اے وائے گھر جانے لگا

---

(۱) سہ شعر دیگر۔ (ن خ) (۲) رکھتے تھے (ن خ) (۳) تری (ن خ)

سینہ اُس کا ہی دل اُس کا ہی جگر اُس کا ہی　　　تیر بیداد جدھر رو کرے گھر اُس کا ہے

تپک دی مری آہ پہلے قدم میں　　　میں قوت تری لے اثر آزمائی

(۵) قایم

قیام الدین علی(۱) قایم تخلص اگرچہ وطنش قصبۂ چاندپور است اما بہ سبب توسل نوکری بادشاہی اکثر در شاہجہاں آبادی بود و در آں روزہا در توپخانہ ہم اسامی داشت بمقتضائے موزونی طبع و استعدادِ درست انچہ کہ موزوں می کرد از نظر مرزا رفیع می گزرانید و بخواجہ میر درد نیز اعتقاد داشتہ(۲)۔ فقیر او را در ایام خورد سالی(۳) بہ لباسِ درویشی در سرکار نواب محمد یار خاں کہ در آں روزہا تازہ وارد بود دیدہ۔ در پختگی کلام و چستی مصراعِ غزل و روئیۂ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافقِ رواجِ زمانہ دوش بدوشِ استادان میر و در بعض مقام غلبہ(۴) می جوید۔ در آں ایام باعثِ قصیدہ خواندن و نوکر شدنِ مؤلف در سرکارِ نوابِ موصوف ایں بزرگ شدہ بود، با فقیر در عرصۂ قلیل بہ سبب سلیم مزاجی و نسبتِ تامِ شاعری رابطۂ شدید بہم رسانیدہ۔ کاغذہائے مسودۂ اشعارِ نواب را کہ برائے اصلاح پیشِ او می آمد از کم دماغی بدست مشورۂ فقیر می داد چنانچہ سہ ماہ ہمیں طور یکجا گزرانیدہ ام و شام و چاشت بیک سفرہ کردہ، واللہ کہ یادِ آں صحبتِ گذشتہ داغِ ناکامی بر دلِ دردمند می گذارد۔ الحاصل بعد برہم خوردنِ آبادی کہیر(۵) و صورت گرفتنِ کارِ فیض اللہ خاں اموِر والہ بہ سرکار نواب احمد یار خاں پسرِ نواب موصوف دخیل شدہ چیزے موافقِ زمانہ تقرر داشت۔ اما اوقاتش در آں بہ فراغت نمی گذشت لہذا برائے رہا کردنِ دیہاتِ قدیم ملک و یومیہ وغیرہ قصبہ مذکور بطور لکھنؤ گذر افگندہ و از راجہ تکیت رائے بہادر توقعات

---

(۱) قیام الدین علی عرف محمد قایم قایم تخلص (ن خ) (۲) مومی (ن خ) ایضاً (۳) رجحاں میجوید (ن خ) (۴) کٹیہر (ن خ)

و پروانہ جات بنام عاملِ آنجا درست کنانیدہ بردہ بود کہ بعد فائز شدن بر مطلب اصلش در رام پور رسیدہ خبر وفاتش شہرہ بشہر انتشار یافت۔ از دست۔

پڑھ کے قاصد خط مرا اُس بدزبان نے کیا کہا — کیا کہا پھر کہہ بتِ نامہربان نے کیا کہا
غیر سے ملنا تمھارا سن کے گو ہم چپ رہے — پر سنا ہو گا کہ تم کو اک جہان نے کیا کہا
قائم اُس کوچہ سے شب نکلیں نہ آنا تھا تمھیں — کیا کہوں تجھکو کہ اُس کو پاسبان نے کیا کہا

جلوہ چاہے ہے اُسے اُس بتِ ہرجائی کا — نہ پریشان نظری جرم ہے بینائی کا
چھوڑ تنہا مجھے یارب انھیں کیونکر گذرے — غم جنھیں آٹھ پہر تھا مری تنہائی کا
عار ہے ننگ کو مجھ نام سے سبحان اللہ — کام پہنچا ہے کہاں تک مری رسوائی کا
صحنِ صحرا کو سدا اشک سے رکھنا چھڑکاؤ — بس دِوانا ہوں میں قائم تری مرزائی کا

یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام کسی کا — پر دیکھیو لینا نہ کبھو نام کسی کا
اب تک بھی میں جیتا ہوں جو آنا ہو تجھے آ — پھر فائدہ جب ہو ہی چکا کام کسی کا

نہ وعدہ اُس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں — پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا
قائم جو کچھ کہ ہوگی سمجھ لیجو بعد مرگ — اب جیتے جی تو دیدہ اُڑا اُس دیار کا

جو کوہکن تجھے قوت ہی آزمانا تھا — عوض پہاڑ کے شیریں سے دل اٹھانا تھا
معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا وہ کیا — پیامبر کے نہیں ساتھ آپ جانا تھا
کہو کہ گورِ غریباں میں رکھیں قائم کو — کہ اُس کا جیتے بھی اکثر وہیں ٹھکانا تھا

عیش و طرب کہاں ہی غمِ دل کدھر گیا　　صدقہ میں اس گذشت کے کیا کیا گذر گیا
کیا کہئے ناتوانی غم کی خرابیاں　　گر شب میں دل کو جمع کیا جی بکھر گیا

اک ڈھب پہ کبھو وہ بتِ خودکام نہ پایا　　دیکھا میں جو کچھ صبح اُسے شام نہ پایا
فہرست میں خوبانِ وفادار کی پیارے　　دیکھی تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا
اک شب وہ کہیں گود میں سویا تھا سو قائم　　پھر بالشِ مخمل سے میں آرام نہ پایا

ہو گرایسے ہی مری شکل سی بیزار بہت　　تم سلامت رہو بندہ کے خریدار بہت
ہمدگر جب خفگی آئی تو جھگڑا کیا ہے　　تم کو خواہندہ بہت ہم کو طرحدار بہت
سچ کہو قتل پہ کس کے یہ کمر باندھی ہی　　ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت
قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری　　مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات　　ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات
خوب نکلے ہم اس کے کوچہ سے　　ورنہ آئے تھے ایک عذاب میں رات
یک خالی سی کچھ لگے ہے بغل　　دل گرا شاید اضطراب میں رات

چاہے ہیں یہ ہم بھی کہ رہے پاک محبت　　پر جس میں یہ دوری ہو وہ کیا خاک محبت

گو کرے ہم کو کسی طرح تو در سے باہر　　جیتے جی جائیں کوئی ہم ترے گھر سے باہر
تم کو کیا قدر ہے اے دیدۂ مُے رونے کی　　ایک بوند آئی ہے سو خونِ جگر سے باہر
تھی تو اک بات یہ کیا کہئے کہ یہاں تو پیارے　　بنگلی ہی پڑتی ہے تلوار کمر سے باہر

دیکھے وہتے مجھے ہر وقت نکل جاتے تھے
دل میں اب آئے ہو، جاؤگے کدھر سے باہر
ایک سودا کی تو قایم نہ کہوں ہیں ورنہ
ہے ترا طورِ سخن حدِ بشر سے باہر

پی کے مے غیر کے ہے شب باش
واہ وا رحمت، آفریں، شاباش
سینہ کاوی ہی کام ہے کچھ اور
کوہکن بود مردِ سنگ تراش
ہے نکلنا تری گلی سے محال
بس کہ ہر سو پڑی ہے لاش پہ لاش
خوبرو ہیں سنو طلب قایم
دائے بر عاشقی کہ ہو قلاش

رکھتا ہے جو تو صفائے عارض
موتی نے کہاں یہ پائے عارض
اک صافیِ تن ہے گل میں بھی لیک
ایسا وہ کہاں سے لائے عارض
اس سینہ سے منہ رگڑ نہ لے داغ
اس کی تھی کبھو یہ جائے عارض
بیجا نہیں مہر و ماہ دیکھے
تیرا ہو جہاں بہائے عارض
کس سے کہوں اس کے منہ کا نقشہ
لے وائے جبین وہائے عارض
کیا دور جو حشر ہووے قایم
مکھ ماٹ جو وہ دکھائے عارض

آج آپ مرے حال پہ کرتے ہیں تاسف
اشفاق و عنایات کرم مہر تلطف
لے گر یہیں قافلہ دل نام ہے اک یار
یہ خستہ بھی نبھ جائے جو یک دم ہو توقف
خاموشی بھی کچھ طرفہ لطیفہ ہے کہ قایم
کرنا پڑے جس میں نہ تصنع نہ تکلف

اے محنت آزمائے عاشق
جب خوش ہو کہ مر ہی جائے عاشق
سودیکھی جفا پہ منہ نہ موڑا
رحمت ہے تجھے وفائے عاشق

شرمندہ نہ ہو نکل جگر سے — اے نالۂ نارسائے عاشق
ہجراں میں بھی مرگیا نہ قایم — اس منہ سے تو اور کہائے عاشق

دل دیکے دیا میں تجھکو جان تک — کوئی اور جگر کرے کہاں تک
آمادۂ سوختن ہوں یک بار — اے برق مرے بھی آشیاں تک
اں نالہ کہ ہے یہ وقتِ امداد — پہنچی تو ہے آہ آسماں تک
آہستہ ہوائے نسیم یک دم — ہمراہ ہیں ہم بھی گلستاں تک
قایم جو ہے شمعِ بزمِ معنی — میں رات گیا تھا اس جواں تک
پایا تو میں ڈھیر آنسوؤں کا — دیکھا تو گداز استخواں تک

کل لے آشوبِ نالہ آج نہیں — آج ہنگامہ پر مزاج نہیں
غیر اس کے کہ خوبرد ہو اور — غمِ دل کا کوئی علاج نہیں

لے چکو دل جو نگہ کو تو یہ دشوار نہیں — لیک تم دیکھتے پھرتے ہو خریدار نہیں
تنگ تو ہم کو تو اے جیب کری ہی لیکن — اٹھ گیا ہاتھ کر اپنا تو پھر اک تار نہیں
مے کی توبہ کی تو مدت ہوئی قایم لیکن — بے طلب اب بھی جو ملجائے تو انکار نہیں

تا کجا مستی میں ناخوش دلِ احباب کریں — یک دو جام اور بھی ساقی کہ بس خجاب کریں
ہر طرف ظرفِ وضو بھرتے ہیں زاہد ہوئی صبح — ساقی اٹھ ہم بھی صراحی میں مئے ناب کریں

یہاں سے اٹھ غیر کے گھر شب تو گیا کہتے ہیں — ہاے رے اے ننگِ مروت اسے کیا کہتے ہیں

کیا ہو گیا کہ نالہ اثر سے قریں نہیں　　کیا آفت آئی آج کہ آہ آتشیں نہیں
کیوں ہم کو جرم نیم نگہ سے کرو ہو قتل　　اک خلق دیکھتی ہے تمھیں کچھ ہمیں نہیں
قائم جو اعتبار سے رتبہ کے دیکھئے　　کم آسماں سے شعر کی تیرے زمیں نہیں

جوں شمع دم صبح میں یہاں سے سفری ہوں　　ٹک منتظر جنبش باد سحری ہوں

کب اُن آنکھوں کی ہمچشمی کریں تصویر کی آنکھیں　　وہ مانی نے لکھیں اور حق نے یہ تحریر کی آنکھیں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں　　یہاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات　　ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں　　کبھی ہم اعتبار کرتے ہیں
سی تو لیتے ہو جیب ناصح کو　　اب کے ہم تار تار کرتے ہیں
چلیے قائم کہ زندگاں اپنا　　دیر سے انتظار کرتے ہیں

آئے خزاں چمن کی طرف گر میں رو کروں　　غنچہ کرے گلوں کو صبا گر میں بو کروں
کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور　　باور نہیں تو لا میں تجھے روبرو کروں
قائم یہ جی میں ہے کہ تقید سے شیخ کے　　اب کے جو میں نماز کروں بے وضو کروں

لائق وفا کے خلق و سزائے جفا ہوں میں　　جتنے ہیں یہاں سو نیک ہیں جو کچھ برا ہوں میں
آگے مرے نہ غیر سے گو تو نے بات کی　　سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

جور سپہر و دوری یاران و روئے غیر — جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

یونہیں رنجش ہوا اور گلا یونہیں — ہو جے ہر بات پر خفا یونہیں
کچھ نہ ہم کو ہی بھا گیا ہے یہ طور — واقعی ہے کہ ہے مزا یونہیں
یہ کہاں اور وہ گل کدھر قایم — اک ہوا باندھے ہے صبا یونہیں

جب نہ تب مجھ سے جو تم دل کی طلب کرتے ہو — دل یونہیں مفت دیا جائے غضب کرتے ہو
ایک مدت سے میاں وہ تو موا پھرتا تھا — آج تم مرنے کا عاشق کے عجب کرتے ہو
قایم اک بات میں جیتا ہے تمہاری لیکن — پرسشِ حال تم اس خستہ کی کب کرتے ہو

قبولِ عذر تو واں ہے جہاں ملال بھی ہو — بجانِ پاکِ صفا یہاں کچھ خیال بھی ہو
قصورِ خدمتِ احباب اس قدر قایم — کچھ آدمی کو ہے لازم کہ انفعال بھی ہو

گردش نیا نہ روز نہیں یہ سپہر کو — صدقہ کرے ہے تجھ پہ ترے ماہ و مہر کو

شمع ساں جلنے کو صانع نے بنایا مجھکو — جس کے میں ہاتھ پڑا اُس نے جلایا مجھکو
تھا بدو نیکِ جہاں سے میں عدم میں آزاد — آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھکو
کچھ تو تھی بات خلل کی کہ شب اُس نے محرم — غیر کے آتے ہی مجلس سے اٹھایا مجھکو
میں تو اس بات پہ مرتا ہوں کہ اُس نے قایم — کس طرح پردہ سے کل بول سنایا مجھکو

کیجے گا صلح پھر دلِ بے مدعا کے ساتھ — ان بن ہے کچھ قبول کو اپنی دعا کے ساتھ

خوناب دل سے ہاتھ ملا ہو تو جانئے
نیچے کیے ہیں آپ نے اکثر حنا کے ساتھ

اُس حسن نیرنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ
ہلکی سی ایک شوخی کی تہہ ہو حیا کے ساتھ

موتی صدف سے نکلے ہے قائم کب اس طرح
ڈھلتی ہے بات منہ سے ترے جس صفا کے ساتھ

نہ ہم فلک کے کبھو ریو و رنگ سے چھوٹے
پڑے بھنور میں جو کام نہنگ سے چھوٹے

شتاب ہم کو رہا کر کہ فصل گل صیاد
خزاں ہے اُس میں جو ہم ٹک زنگ سے چھوٹے

تھے نام و ننگ جہاں میں ہزار بے ننگی
بھلا ہوا کہ ہم اس نام و ننگ سے چھوٹے

نہ اُس کی زلف سے چھٹنے کا قصد کر قائم
کوئی سنا ہے کہ قید فرنگ سے چھوٹے

خوگر درد ہوں میں کرتے ہیں درماں میرے
آہ کیوں درپئے جاں ہیں یہ عزیزاں میرے

ہر گلی کوچہ ہے بستی کا پراچہ کی دکان
دھجیاں ہو کے اڑے بسکہ گریباں میرے

جب میں دیکھا ہے تو اس دل کو غمیں دیکھا ہے
یہ نیا چاؤ محبت کا یہیں دیکھا ہے

حسرت دل کو مری سمجھے ہے وہ خستہ جسے
یار نے آکے دم باز پسیں دیکھا ہے

ہنوز شوق دل بے قرار باقی ہے
بجھی ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے

گیا تھا آج میں قائم کے دیکھنے کے لئے
کوئی دم اور نفس کی شمار باقی ہے

یارب کوئی اُس چشم کا بیمار نہ ہووے
دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے

صورت میں تری گر نظر آوے ملک الموت
جی دینا کسو طرح سے دشوار نہ ہووے

کیا کیا عدم میں ہم پہ ظلم و ستم نہ ہوں گے چرچے یہی رہیں گے اور ہائے ہم نہ ہوں گے

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

کس دل پہ داغِ غم نے یہ میرے بہار کی اللہ رے دھوم اب کے برس لالہ زار کی
شاید وہ بھول کر کبھی یہاں بھی رکھے قدم یکساں کرو زمین ہمارے مزار کی

وہ بھی کیا دن تھے کہ جی کو لاگ اُس کے سات تھی میں تھا اور کوچہ تھا اُس کا اور اندھیری رات تھی

دامانِ گل تلک ہی کہاں دسترس مجھے تکلیف سیرِ باغ نہ کر اے ہوس مجھے
بھٹکا ہیں وہ نہیں کہ ملوں قافلے سے پھر کیوں بے دماغ کرتی ہی بانگِ جرس مجھے
قائم میں عندلیبِ خوش آہنگ تھا پہ حیف زاغ و زغن کے ساتھ کیا ہم قفس مجھے

دل ڈھونڈتا سینہ میں مرے بو العجبی ہے اک ڈھیر ہے یہاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

شکوہ نہ غیر سے نہ یار کی بیزاری سے جو ہوا ہم پہ سو اس کی گرفتاری سے

(۶) قسمت

نواب شمس الدولہ قسمت تخلص پسر کلاں نواب بارگاہ قلی خاں کہ سیادت و شجاعت و عمدۂ خاندانی ایشاں از قدیم شہرت دارد. جوان صاحب نفس است۔ در ایامیکہ ایشاں معہ والد بزرگوار خود بحضور مرزا جہاندار شاہ مختاری کلی داشتند مقرب ملازمت ایشاں

خاکسارِ بے مقدار بجنابِ مرشدزادۂ آفاق زبانِ سحربیان ایشاں شدہ بود و وعدہ بروزِ عید داشتند چوں بسبب کثرتِ ازدحامِ صغیر و کبیر موقعِ خواندنِ قصیدہ ندید ندبرائے پاسِ خاطرِ من کہ قطعۂ مختصرِ تہنیتِ عید نیز در آستین داشتم آنرا گرفتہ وصفِ امرا وغیرہ ہم شگفتہ بدست شاہزادہ دادند و مرا روبرو کردند غرضکہ محسنِ فقیر اند. و اصلاحِ شعر از میانِ جعفر علی حسرت می گرفتند و در حینِ حیاتِ او ہم بافقیر از تہِ دل اعتقادے و رجوعے داشتند حالا کہ حسرت نماندہ بالکل خیالِ مشورہ بہ مؤلف دارند و در گفتنِ سلام و مرثیہ بیشتر از شعر ہمت می گمارند و از عہدۂ آں نسبتِ دیگر مرثیہ گویانِ حال بخوبی می برآیند۔ ایں کلامِ ایشاں است۔

گر وہ بتِ کافر شبِ مہ بام پر آوے
ایک ماہ دو ہم ماہ فلک کو نظر آوے

مژگاں ترے دل میں مرے سیری کی گئی ہیں
ناسفتہ نہ دیکھا کوئی لختِ جگر آوے

مقدور ہے کس کا جو ترے حکم کو ٹالے
رستم جو نہ آوے تو وہیں اس کا سر آوے

تو برسرِ بازارِ جہاں جلوہ نما ہو
خورشیدِ فلک بیچنے اپنی سپر آوے

جوں ماہِ منور ہو شبِ تار ہماری
قسمت وہ اگر چاند کی صورت نظر آوے

دیکھا ہیں جنسِ دل کے طلبگار تم نہیں
پھرتے ہو بوالہوس سے خریدار تم نہیں

کہتا ہے اُن کو دیکھ کے چیں برجبیں رقیب
کیا ماجرا ہے مجھ سے تو بیزار تم نہیں

آنکھیں نکالتے ہو عبث مجھ غریب پر
کہتا ہے کون یہ کہ طرحدار تم نہیں

کہتے ہیں یوں چمن میں پھر آئی بہارِ گل
شکرِ خدا کیا تھا بہت انتظارِ گل

اے نالہ اُس کے دل میں اک دم اثر تو کر جا
اُس شوخِ بے خبر کو بارے خبر تو کر جا

مژگانِ تر ہیں تیرے ابرِ بہار قسمت
دامانِ کوہ و صحرا اکبار تر تو کر جا

الٰہی یا تو میرے دامن دلدار ہاتھ آوے
نہیں تو ہاتھ کے اس کی جو تیغ تلوار ہاتھ آوے
اُدھر سے میں کھڑا ہوں کھینچ لینے کی تمنا پر
اودھر سے کاش کے تیرا ہی تا دیوار ہاتھ آوے
اگر تسبیح ہاتھ آ ئی نہیں ہو تیرے لئے قسمت
تو دانے توڑ ڈال اُسکے کہ پھر زنّار ہاتھ آوے

امیدوار بوسۂ لب ہے کھڑا کوئی
دیتا ہے تجھ کو دیر سے پیارے دعا کوئی
میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ پھر کیا کرے اگر
مرجائے دیکھ کر ترا رنگِ حنا کوئی
تو ہے وہ اے صنم کہ تری چھب کو دیکھ کر
کہتا ہے واچھڑے کوئی، نام خدا کوئی
قاصد اگر گذر ہو ترا کوئے یار میں
کہیو کہ آرزو میں تری مر گیا کوئی
قسمت جو سیکھتا ہے فرنگی زبان کو
شاید نظر پڑا ہے فرنگی بچا کوئی

پھر مجھکو کیا جو غیر کے تم جاکے گھر رہے
میرے تو ساتھ وعدے ہی شام و سحر رہے
آئی نہیں کسی کی جواب تک صدائے پا
واماندگانِ قافلہ یارب کدھر رہے

آتا نہیں شب کو خواب تجھ بن
بیداری ہے عذاب تجھ بن
اے ماہِ سپہرِ خوبروئی
سرگشتہ ہے آفتاب تجھ بن
سینہ سے نکل پڑے گا گویا
ہے دل کو یہ اضطراب تجھ بن
قسمت کی بھی تجھکو کچھ خبر ہے
دیکھا میں اُسے خراب تجھ بن

جو دل لیکر ہمارا دشمنِ جاں یار جانی ہے
تو اس سے موت ہی بہتر ہے پھر کیا زندگانی ہے
مرے اس خستہ دل کو پاس اپنے یار رہنے دے
کوئی پوچھے تو کہنا میرے عاشق کی نشانی ہے
شبِ ہجراں ہے اور میں ہوں یہ آنکھیں اور آنسو ہیں
اذیت ہے مصیبت ہے نہایت ناتوانی ہے

نہیں کوئی زیست کی صورت بقولِ مصحفی قمت ۔۔۔ نہ قاصد ہے نہ نامہ ہے نہ پیغامِ زبانی ہے

(۷) قبول

کہ از احوالش خبر ندارم ۔ ازوست ۔

دل یوں خیالِ زلف میں پھرتا ہے نعرہ زن ۔۔۔ تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

حرفِ کاف

(۱) کمال[۱]

شاہ کمال الدین حسین کمال تخلص، وطنِ بزرگانش کڑہ مانک پور و از چندے والدِ قبلہ گاہِ ایشاں در صوبۂ بہار نیز توطن کرفتند و اینہا ہمہ در زمانہ خویش منصبدارِ پادشاہی بودہ

---

(۱) کمال کے حالات نسخہ رامپور میں زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔ وہ تمام عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:-

کمال تخلص معروف بہ شاہ کمال چشتیہ ولد قادر نواز خاں وطنِ بزرگانش شاہجہان آباد و در زمانہ خویش منصبدار بادشاہی بودہ اند۔ از چندے والدِ ایشاں در موضع محی الدین پور کہ متصلِ صوبہ بہار است کہ بطریق ایمہ و خارج جمع بنام ایشاں مقرر است توطن گزیدہ۔ چنانچہ تولدِ شاہ مذکور در ہماں موضع واقع شدہ لیکن نشو و نما در عظیم آباد یافتہ۔ بعد انتقالِ والدِ ماجدِ خود در سنِ شانزدہ سالگی ترکِ لباس اختیار کردہ و بیعت در قصبہ سلون در حضورِ پیر شاہ کریم عطا صاحب کہ فرزند جانشین حضرت پیر شاہ اشرف قدس اللہ سرہ اند نمودہ، درویشانہ قدم در وادیٔ حیات گزاشتہ در ہماں عالم بہ لکھنؤ وارد شدہ ازاں ایام در ہمیں شہر اقامت ورزیدہ۔ او قاتش ہمیشہ

اند۔ شاہ مذکور در آغازِ شباب بہ خاندانِ اویسیہ[1] بیعت کردہ ظاہرِ حالِ خود را بہ لباسِ درویشی آراستہ وسیرِ بیگانہ کردہ بلکھنؤ وارد شدہ۔ حالا بہ مکانِ راجہ ہولاس رائے سکونت وارد و معونتش نیز از ہمانجا میرسد۔ شوقِ شعرِ ہندی از مدتِ مدید در دلش جا گرفتہ بود ازیں جہت دواوینِ اساتذۂ سلف وحال را جمع نمود و قریب سی دیوان بہم رسانیدہ بفیضِ صحبتِ بزرگانش وسیرِ کلامِ ایشاں کلامِ خود را نیز بہ پایۂ اعتبار کشیدہ۔ پیشتر شاگردیش بیک جا تعین نداشت از چندے بحلقۂ تلامذۂ قلندر بخش جرأت داخل شدہ از کلامِ طبع زادِ اوست

شبِ وصال میں جب روزِ غم کی بات چلی — خروشِ مرغِ سحر نے کہا کہ رات چلی

کچھ اور لے نہ چلے ہم تو اس جہاں سے کمال — ہمارے ساتھ فقط اک خدا کی ذات چلی

میں بندہ کیوں نہ ہوں اس کی ادا کا — عیاں اُس بت میں ہے جلوہ خدا کا

تو خواہی یا نخواہی گالیاں دے — ہمارا کام ہے دینا دعا کا

بہ توکل گذشتہ از ہفت سال راجہ ہولاس رائے بہادر بہ مکان خویش جا دادہ خدمتش را موجبِ سعادت می داند و بسیار بخوبی پیش می آید و چوں بمقتضائے موزونی طبع شوقِ شعر از طفولیت دامنگیر بود ازیں جہت دواوینِ اساتذۂ سلف وحال را زیادہ از سی جمع نمودہ ببرکتِ سیرِ کلامِ ایشاں وفیضِ صحبتِ کاملاں ایں خود را نیز بپایۂ اعتبار کشیدہ، پیشتر شعر خود از نظر محمد قائم می گذرانید حالا از چندے رجوعِ ایں امر بہ قلندر بخش جرأت دارد۔ ماسوا ایں در اخلاقِ درویشانہ با صاحبانِ منی فراخش ؟ بیک و تیرہ مرنج و مرنجان اکثر در مشاعرۂ فقیر حاضر شدہ با کلامِ ایں خاکسار از تہ دل دل دوستی دارد، چنانچہ ہر سہ دیوان را بدستِ خود نقل گرفتہ و تذکرہ را کہ تیار شدہ بحریر یاراں تمام بردہ غرض کہ ذاتش چو نامِ خود کمال مجسم است، عرش از سی سال متجاوز خواہد بود۔ (نسخۂ رامپور)

(۱) خاندان ویسیہ بغیر الف۔ (ن ح)

ہے بس ڈھنپنے کو تن یہاں چادرِ خاک — میں کیا خواہاں کسی سے ہوں ردا کا
ہیں اُس دیوار کے سایہ میں جو شخص — کریں کیا لے کے وہ سایہ ہما کا
کمالؔ اس کا جھکے سر کس کے آگے — ہے جو بندہ علیِ مرتضےٰ کا

جوں قدم یار نے گھر سے میرے در پر رکھا — سر رکھا زانو پہ میں ہاتھ جگر پر رکھا
ہم کو صیاد نے رکھا جو قفس میں تو آہ — دستِ شفقت کبھی ظالم نے نہ سر پر رکھا
سنگِ رہ اُس کی گلی کا جو کوئی ہاتھ آیا — مثلِ گل میں نے اٹھا کر اُسے سر پر رکھا
بیٹھے بیٹھے تجھے کون آگیا یاد آج کمالؔ — تو نے رومال جو لے دیدۂ تر پر رکھا

چشمِ خوں بستہ سے پھر اشک نمودار ہوا — طفلِ خوابیدہ بہت دیر میں بیدار ہوا

جلوہ ترا تو ہم کو ہر ایک سو نظر پڑا — دیکھا میں جس طرف کے تئیں تو نظر پڑا
پیارے صفائے حسن تری میں کہوں سو کیا — ہر آئینہ سے صاف ترا رو نظر پڑا
قد کا ترے نہ آنکھوں میں میرے بسے خیال — اکثر ہے یہ کہ سرو لبِ جو نظر پڑا
دیکھی کمالؔ غور سے اُس کی کمر جو میں — کچھ اور تو نہ تھا مگر اک مو نظر پڑا

مرے سینہ سے آنکھوں تک دلِ بیمار زد پہنچا — جو آتا ہے تو یہاں اپنے تئیں جلدی سے تو پہنچا
ابھی بازار سے مہ سرد تیرے حسن کا ہوگا — اگر گرمی سے بیتابی پہ وہ خورشید رو پہنچا
مبادا کم نہ ہووے بزم مے خواروں کی کیفیت — شتابی اور یہاں پیرِ مغاں بھر کر سبو پہنچا
چلا حسرت بھرا میں کشتنی ہستی سے ہے ظالم — دمِ بسمل نہ میرا اُس کے دامن تک لہو پہنچا

کیوں تو پھرتا ہے دلا گرد اُس کے سودائی ہوا — لطف کیا ملنے کا ہے اُس سے جو ہرجائی ہوا
جز شکستِ شیشۂ دل کچھ نہ دیکھا اس کا کام — مرتفع جس دن یہاں یہ چرخ مینائی ہوا
قیس کو الفت میں میری نت برابر تو سمجھ — عشق کو کیا خاک سمجھے گا جو صحرائی ہوا

یہ زخمِ دل ہے اے جراح اُس ابرُوئے پرخم کا — کرے گا اس کو کیا چنگا تیرا پھاہا یہ مرہم کا
یہ ہے الماس کی کوئی گریباں یا کہ اے ہمدرد — پس از خورشیدِ انور پھیر تارا صبح کا چمکا
کروں کیا اے کمالؔ آنسو تھمے آنکھوں سے جو مجھے — نہیں کچھ سوجھتا درماں مجھے اس چشمِ پرنم کا

دل کے ہر داغ کا ہے رنگ کچھ اے یار نیا — سیر کر تو بھی کہ پھولا ہے یہ گلزار نیا
جنسِ دل جس کی مانگی ہے قیمت اُس سے — واہ پیدا یہ ہوا از در خریدار نیا
کس طرح کہئے نہ پھر بوقلموں جلوہ اُسے — رنگ ہر لحظہ دکھاتا ہے وہ دلدار نیا
کہنہ مشاق طبیبوں نے کہا دیکھ مجھے — طرفہ آزار ہے یہ اس کو ہے بیمار نیا
جوں جوں کرتے ہیں دوا اور مرض بڑھتا ہے — یا الٰہی اسے کیسا ہے یہ آزار نیا
ایک نقشہ پہ زمانہ رہے پھر کیونکہ کمالؔ — رنگ اُس چہرۂ عالم کا ہے ہر بار نیا

گھر اپنے بلا لڑ کے اُسی آن نکالا — جھگڑا تو مزے کا یہ مری جان نکالا
اُس صانعِ قدرت کے ہوں قربان ہر اک — اللہ یہ انسان سے انسان نکالا
میں کود کے دیوار گیا یار کے گھر اندر — بیچارہ گیا مفت میں دربان نکالا

اپنی نظر کے آگے سے عالم گذر گیا — یہ قافلہ شتاب نہ جانے کدھر گیا

کیوں ہمیں تو دیکھ کر زردہ جانا ہوگیا　　کیا ہوا گر ہم فقیروں کا بھی آنا ہوگیا
مبتلا کس شہرۂ آفاق پر ہیں ہم کمالؔ　　شہرۂ آفاق جو اپنا فسانا ہوگیا

رہ جا چمن میں تو کوئی دم اور عندلیب　　تا ایک دو نالہ کرلیں بہم اور عندلیب
اس گل بغیر ایک تو سونا لگے ہے باغ　　کرتی ہے بول بول ستم اور عندلیب

خط جو اُس حیلہ سے عاشق کا اُسے پہنچا پھر　　پھر کبھو اُن نے نہ رستہ سے اٹھایا کاغذ
تیرہ بختی میں ہی جینے کی ضعیفوں کے بہار　　ہوئی گلزار جہاں شب کو جلایا کاغذ

ٹکڑے کرے جگر کے میرے ٹوٹ ٹوٹ کر　　رویا زبسکہ غم میں تیرے پھوٹ پھوٹ کر
ایک ہم رہے اسیرِ قفس اور ہم صفیر　　پہنچے چمن میں قید سے سب چھوٹ چھوٹ کر

ہم گدا دیکھتے ہیں اُس بتِ گمراہ کی راہ　　یعنی آ نکلے تو کچھ مانگ لیں اللہ کی راہ

ہاتھ میں اُس بت کی جو نازک کلائی آگئی　　گویا قبضہ میں مرے ساری خدائی آگئی
وہ بتِ مغرور کل ہم سے ہوا جو ہیں دوچار　　سامنے ہو کر مجسم کبریائی آگئی
لیچلا صحرا میں کیوں مجکو دلِ وحشی تو کھینچ　　بیٹھے بیٹھے جی میں یہ کیا تیرے بھائی آگئی
اکڑو بالا بے طرح سے کر چکے تھے تم کو زہد　　شیخ صاحب آپ کے آڑے کمائی آگئی
بعدِ مدت روزِ وصل اُس کا میسر جو ہوا　　ڈھل گیا دن ناگہاں شامِ جدائی آگئی
حرفِ مطلب جوں کمالؔ اس سے کیا میں ذیل　　سنتے ہی بس اُس کے چہرہ پر رکھائی آگئی

نظر پڑتے ہی اُس پر یوں کوئی دلگیر کانپے ہے — کہ جیسے دیکھ کر صیاد کو نخچیر کانپے ہے
نظر اُس شوخ کی پڑتے ہی بس دل تھر تھرا اُٹھا — کلیجے پر کوئی جیسے کہ کھا کر تیر کانپے ہے
چلا وحشت سے ہوں میں لے کماں ابرو کے کوچے میں — کہ جوں جوں پاؤں رکھتا ہوں اُدھر زنجیر کانپے ہے

کیا غضب ہے دم ہے آنکھوں میں لبوں پر جان ہے — دم کی فرصت اب نہیں اور دل میں سو ارمان ہے

کھولے آنکھیں وقتِ آخر بھی ترا بیمار ہے — مرتے مرتے بھی اسے کیا حسرتِ دیدار ہے
اب جو اُٹھ آئے گلی سے یار کی تو کیا کہیں — سامنے آنکھوں ہی کے ہر رخنۂ دیوار ہے
خوابِ غفلت میں ہے کیا بیدار ہو ہشیار ہو — قافلہ راہِ عدم کا چلنے کو تیار ہے
سانس لے سکتے نہیں ہیں کیا کہیں ہم اے کمال — اب تو دردِ دل سے ہم کو زندگی دشوار ہے

اُٹھنا ہے اُس کے کوچے سے بارِ گراں مجھے — تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو دوستاں مجھے
تجھ بن نظر اٹھا کے میں دیکھوں ہوں جس طرف — اوجڑ نظر پڑے ہے یہ سارا جہاں مجھے
اُٹھتا ہے دل سے نالہ بھی لے آہ کا عصا — غم نے کیا ہے اس قدر اب ناتواں مجھے
آزادی قیدِ زلف سے آتی نہیں نظر — بختِ سیہ نے لا کے پھنسایا کہاں مجھے
از بس کمال اُنس ہے جی کو قفس کے ساتھ — نے فکرِ باغ ہے نہ غمِ آشیاں مجھے

نہ سمجھو آپ سے تشریف یار لاتا ہے — ہمارا جذبۂ دل یہ اُبھار لاتا ہے
گلوں کو جھانکوں ہوں کیا کیا چمن میں جھپٹا — قفس اٹھا کے یہ فصلِ بہار لاتا ہے
نہ آتے ہم بخدا تیرے در پہ لے کافر — پہ کیا کریں یہ دلِ بے قرار لاتا ہے
بلائیں لینے لگا میں تو پیچھے ہٹ کے کہا — سرک بھی یہاں سے کہاں کا پیار لاتا ہے

ہزار آئیں بہاریں پہ نخلِ تن اپنا / کبھی شگفتہ ہوا ہے نہ بار لاتا ہے
نثار ہونے کی تیری گلی کے خواہش ہے / یہ گردباد جو اتنا غبار لاتا ہے
پس از فنا تو ذرا آ کہ یہ دلِ مضطر / قیامت ایک تہِ سنگِ مزار لاتا ہے
دلا نہ اُس سے الجھ تو کہ راہ چلنے میں / دکھا وہ زلف کئی مجھ سے مار لاتا ہے
چمن میں دیکھا جو اُس گل کو آنکھ اٹھا کے کمال / تو آنکھوں میں وہ گڑونے کو خار لاتا ہے

کچھ ان دنوں دلِ پُر داغ اس بہار پہ ہے / کہ نہ سماں یہ گلوں پر نہ لالہ زار پہ ہے
چمن میں کانٹے پہ گُل کو پڑے ہیں جو کوئی / یہ عندلیب کا دل ہے جو نوکِ خار پہ ہے
گیا میں جی سے اٹھا کر جو دردِ تنہائی / تو بیکسی مرے اب نوحہ گر مزار پہ ہے
یہ تن سے نکلے ہے جی اور نہ یار آتا ہے / عجب طرح کا عذاب اپنے جسمِ زار پہ ہے
نہیں ہے پوست تو سبزہ ہی کر دیا معبود / نشہ کمال فقیروں کا اب اُتار پہ ہے

آہ مسیحا جسے دیکھ کنارا کرے / اُس کے مرض کا بھلا کیا کوئی چارا کرے
تیغ سے اپنا گلا کاٹیں نہ پھر کیونکہ ہم / غیر کو ابرو سے کچھ جب وہ اشارا کرے
سیرِ چمن میں نہ آئے جس کو نظر اپنا گل / آہ گلوں کا وہ کیا خاک نظارا کرے
فرقۂ عشاق میں ہے وہی صاحبِ کمال / ذلت و خواری کے تئیں جو کہ گوارا کرے

نہیں خورشیدِ فلک ہم جو چمکتے جاویں / سایہ ساں جائیں جدھر سر کو پٹکتے جاویں
بادکش آہ ہے اور دل میں بھری آتشِ غم / شعلہ پر شعلہ نہ پھر کیونکے بھڑکتے جاویں
زلفِ مشکیں ہیں جو ہو شکلِ صبا اپنا گذار / ہم بھی پھر جاویں جدھر کو تو مہکتے جاویں
ہم جدھر جاویں تو یہ دیدۂ پر اشک اپنے / جامِ لبریز کی مانند چھلکتے جاویں

یہ بھی کوئی بیٹھنے کا بزم میں اسلوب ہے واہ　　جوں جوں ہم آگے بڑھیں آپ سرکتے جاویں
خاکِ رہ جن کی ہوا ہوں ہیں غضب یہ کہ وہ　　اُس طرف گذریں تو دامن کو جھٹکتے جاویں

میاں او جانے والے آنکھ اٹھا کر ٹک ادھر دیکھو　　کوئی مضطر پکارے ہے ذرا منہ پھیر کر دیکھو
ابھی میں کیا کہوں ناچار ہوں کہتے ہو کیوں مجھ سے　　نہ یوں حیران ہو کر مجکو تم دو دو پہر دیکھو
یقیں تم کو اگر آتا نہیں ہے میری حالت کا　　تو آئینہ کو اپنے سامنے ٹک تم بھی دھر دیکھو
کمالِ خستہ کو یارو یہاں قسمت سے آئی ہے　　نہیں تو مجکو دیکھو اور یہ میرا سفر دیکھو

(۲) کبیر

حکیم کبیر سنبھلی شیخ انصاری بودہ و کبیر تخلص مے گذاشت. فقیر ایشاں را در سرکار بخشی نواب محمد یار خاں مرحوم کہ ذکرِ ایشاں گذشت دیدہ بود بسیار بخوبی پیش آمدہ بود بہ سبب تمادیِ ایام یک شعر از ایشاں بخاطر است۔

ایک ہی یار سے جی ناک میں آیا ہے کبیر　　زیست معلوم اگر ایسے ہی دو چار ملے

(۳) کلیم

محمد حسین کلیم تخلص والد میاں حاجی تجلی صاحبِ تصانیف بسیار است چنانچہ ترجمہ فصوص الحکم در مجلس ہندی بہ سلک نظم کشیدہ. خامۂ خیالِ او بر صفحۂ روزگار یادگار است۔ محمد قائم تعریفش در تذکرۂ خویش بہ مبالغہ نوشتہ۔ از دست۔

ہو چکی حشر گئی جنت و دوزخ کو خلق　　رہ گیا میں ترے کوچہ میں گرفتار ہنوز

آتی ہے دل پہ قلقلِ مینا سے اب شکست　　وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

شور کرتی رہی بانگ درا کیا کیا کچھ
قافلے کتنے گئے کوئی نہ سمجھا کیا ہے

حرف گاف

(۱) گوہری

گوہری بدائونی دو شعرش کہ زبانی عالم شاہ پیرزادہ در عالم طفولیت شنیدہ بودم بیاد است ازوست[1] -

آفت آوے گی تو ان زنبور خانوں کو نہ چھیڑ
رو برو پلکوں کے مت جا بس کے بانوں کو نہ چھیڑ

ہم نہ کہتے تھے کہ ان بانکے پٹھانوں کو نہ چھیڑ
آخرش مارا پڑا ہاتھوں سے اُن کے گوہری

(۲) گرم

مرزا حیدر علی گرم تخلص ولد نیاز علی بیگ ساکن شاہجہاں آباد جوانِ صلاحیت شعار است بمقتضائے موزونی طبع چیزے کہ موزوں می کند آں را بہ نظرِ اصلاحِ فقیر می گذراند باوصفِ نومشقی از ذکاوتِ طبعش معلوم می شود کہ بشرطِ مزاولت بجائے خواہد رسید چراکہ رسوخ واعتقادش از تہ دل بایں خاکسار نسبتِ دیگر شاگردان اولین روز بہ روز رو در ترقی دارد بقولے کہ پیرِ من خس است واعتقادِ من بس است - ازوست -

لب خشک ہو رہے ہیں کانٹے زباں پر ہیں
نالہ کی گرمیوں سے بھنتے دل وجگر ہیں

جو زندگی سے اپنی بیزار اس قدر ہیں
تیغِ نگاہ کس کی دیکھی ہے ہم نے یارب

اے ہمنشیں ہمیں بھی حیراں ہوں وہ کدھر ہیں
یارانِ رفتگاں کا مت پوچھ مجھ سے قصہ

یہ کس کی جستجو میں آوارہ در بدر ہیں
خورشید و ماہ کو میں پھرتے ہی دیکھتا ہوں

---

(۱) ازوست ندارد - (ن خ) (۲) وجواں (ن خ) ، (ن) حیراں -

سینہ کے داغ سوں آنکھوں کے اشک خونی — اس نخل عاشقی کے یہ گل ہیں وہ ثمر ہیں
کس شعلہ رو کے غم میں روتا ہے اس قدر تو — جو گرم اشک تیرے سوزندہ (۱) اس قدر ہیں

شب رخصت ہے رہو تم مرے گھر آج کی رات — جاں بلب چھوڑ کے جاتے ہو کدھر آج کی رات
کر دیا در کو اجابت کے خدایا کیا بند — نہیں کرتی جو دعا میری اثر آج کی رات
آگے آنکھوں کے اندھیرا سا سر شام سے ہے — دیکھئے ہوتی ہے کس طرح سحر آج کی رات

حسرت سے دیکھتا ہوں میں جب یار کی طرف — لگتا ہے تب وہ دیکھنے دو چار کی طرف
تڑپے ہے تیرے کوچہ میں اک جاں بلب میاں — ٹک جھانکیو تو رخنۂ دیوار کی طرف
دونوں سے پھر گیا ہوں میں گرم ان دنوں — ہرگز نہیں ہوں کافر و دیندار کی طرف

تصویر کا عالم ہے ترے روئے حسیں پر — تجھ سا تو پری چہرہ نہیں روئے زمیں پر
اخلاص اُسے غیر سے ہے واسطے جس کے — کھدوائی ہے میں سورۂ اخلاص نگیں پر
ہم جن کی محبت میں لہو پیتے ہیں اپنا — وہ باندھے ہوئے پھرتے ہیں تلوار ہمیں پر
رہتا تو ہوں گلشن میں پہ رہتی ہے نت آفت — فریاد سے بلبل کی مری جان حزیں پر
نالہ نے مرے گرم شب آتش جو لگائی — اک شور فرشتوں میں پڑا عرش بریں پر

یوں آپ جو کچھ جی میں ہو فرمائیے صاحب — گالی نہ مجھے غیر سے دلوائیے صاحب
ہر چند گنہ گار ہے کشتہ کا ٹک اپنے — لاشہ تو بھلا آن کے اٹھوائیے صاحب
تا دیر میں اُس بزم میں بیٹھوں تو کہے یوں — اب رات بہت آئی ہے گھر جائیے صاحب

---

(۱) "سوزندہ" جو شرر ہیں" (ن ح)

میں گرم گیا ملنے کو اُن کے تو انھوں نے　　فی الفور ظرافت سے کہا آئیے صاحب

رات وہ درباں کے ڈر سے مجھ تک آ کر پھر گئے　　اپنے پاؤں کی صدا مجھ کو سنا کر پھر گئے
گرم کل آئے جو وہ سننے مرا احوالِ دل　　سوچ کر کچھ جی میں اپنے مسکرا کر پھر گئے

سیلِ گریہ میں نہ ہم تا بہ کمر ڈوب گئے　　اس قدر روئے کہ ہمسایوں کے گھر ڈوب گئے
تجھکو دریا میں جو اک شوخ نہاتے دیکھا　　شرم کے مارے وہیں شمس و قمر ڈوب گئے
گرم کیا خاک چلیں سیر کو ہم دریا کی　　تیرے رونے سے تو سب راہگذر ڈوب گئے

ملبل کے سر سے جاتی ہے کوئی ہائے گل　　ہوتی ہے وہ قفس میں بھی پھر پھر فدائے گل
لوہو میں بھرے ہے ہیں تیرے ہاتھ سچ بتا　　تربت پہ کس شہید کی تو نے چڑھائے گل
گلچیں جو اس کو توڑ کے ڈالی سمیت چلا　　سر دھن کے عندلیب پکاری کہ ہائے گل
گل خوردہ دست سے مرے نفرت رہی جنھیں　　بدھی کے اس نے کیونکے گلے سے لگائے گل
جس رُخ کے آگے مہرِ درخشاں بھی گرد ہو　　عارض کو لگ سکے ہے کب اس کے صفائے گل
ہم بھی تڑپ تڑپ کے وہیں آہ رہ گئے　　صیاد نے قفس میں جو ہم کو دکھائے گل
گلدستہ لا دیا جو کل اس کو رقیب نے　　ہم نے بھی گرم رشک سے ہاتھوں بچھائے گل

حرف لام

---

(۱) لطیف

میر شمس الدین لطیف تخلص متوطنِ سورت سادات عالی تبار اند. بحکم موزونی طبع

از چند سال شوقِ گفتن شعرِ ہندی بہم رسانیدہ۔ عمرش تا الی الیوم سی و دو سالہ خواہد بود از وست۔

مژدۂ وصل اگر کوئی سناتا ہے مجھے ۔۔۔ میں یہ سمجھوں ہوں کہ جی وان ولاتا ہے مجھے

ایسی الفت کو لگے آگ پڑے چولھے میں ۔۔۔ جو ہے دلسوز مرا وو ہی جلاتا ہے مجھے

گھر میں جا بیٹھ رہا اس سے خفا ہو تو لطیف ۔۔۔ کیا ہی غصہ تری اس بات پہ آتا ہے مجھے

(۲) لطف

مرزا علی لطف تخلص جوانِ خوش فکر دیدمش طبیعتش نسبتِ دیگر شعرائے اینجا متانتی دارد۔ مثنوی آبدار بہ سلکِ نظم کشیدۂ اوجحت بر قولِ مولف است وازیں جہت خود را بہ شاگردی مرزا متہم می کند۔ واللہ اعلم بالصواب۔ از وست۔

ہے زلف یا قہر کی شب کچھ نہیں معلوم ۔۔۔ کھڑا ہے آہی کہ غضب کچھ نہیں معلوم

خاموشی ہماری کے تئیں سحر ہی سمجھو ۔۔۔ گو ہم کو لگا لینے کا ڈھب کچھ نہیں معلوم

کھل گئی یہ اب کہ وصل اُس کا خیالِ خام ہے ۔۔۔ آج امیدوں کا دل ہی دل میں قتلِ عام ہے

کوئی زخم اور بھی کہ اے قاتل ۔۔۔ کب کے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں

رباعی

جو کوئی کہ آفتِ نہانی مانگے ۔۔۔ اور ملکِ عدم کی کچھ نشانی مانگے

دکھلائے اُسے تو اپنی یہ تیغِ نگاہ ۔۔۔ جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے

حرف المیم

(۱) مجذوب

مرزا غلام حیدر مجذوب تخلص پسر خواندۂ مرزا محمد رفیع، شخصِ خوش خلق و باحیا است فقیر او را در لکھنؤ دیدہ بسیار بہ تپاک پیش آمدہ۔ من کلامہ۔

وعدہ کی وفا اُس سے بہت دور پڑی ہے ۔۔۔ فہرستِ شب و روز سے باہر وہ گھڑی ہے
خاموش جو رہتا ہوں مجھے گنگ نہ سمجھو ۔۔۔ اِک عرضِ تمنا ہے کہ آ منہ پہ اڑی ہے
غفلت میں بسر کرنہ شبِ وصل کو مجذوب ۔۔۔ ایام جدائی کی گھڑی سر پہ کھڑی ہے

چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لئے ۔۔۔ میں بھی تو یار کم نہیں دو چار کے لئے
ہے دردِ سر ہی بلبلِ آزاد کی صفیر ۔۔۔ موزوں ہے نالہ مرغِ گرفتار کے لئے
طوبیٰ کے نیچے بیٹھ کے روؤں گا زار زار ۔۔۔ جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لئے
مجذوب بہر سبحہ ہے منت بھی شیخ سے ۔۔۔ پھر برہمن سے عجز ہے زنار کے لئے

رکھئے لگائے اُس کو گر بس چلے ہمیشہ ۔۔۔ دینے پہ دل کے کیجے آرے بلے ہمیشہ
آتے ملے دلے ہو گھر سے کسی کے اس دم ۔۔۔ پھیرا کئے چھری ہو میرے گلے ہمیشہ
مجذوب ان دنوں میں پھر روگ کچھ بسایا ۔۔۔ رہتے تھے پیشتر تو اچھے بھلے ہمیشہ

چشم دوری میں تری یار پہ گریاں تھی رات ۔۔۔ تھی شبِ ہجر مرے سر پہ کہ طوفاں تھی رات
نازِ اختر کو مرے تھا فلکِ ہفتم پر ۔۔۔ زلفِ سرکش جو تری تابعِ فرماں تھی رات

کسی دشمن پہ خدا ون وہ نہ ڈالے جوں گل　　سر پہ مجذوب کے اے گبرو مسلمان تھی رات

برباد نہ جائے گا یہ خسرو　　ٹک سوچ کہ خون کوہکن ہے

اے میر صحبت مجذوب کو اوروں سا　　ہے وہ خلف سودا اور اہل ہنر بھی ہر

(۲) مظہر

مرزا جان جاں[1] مظہر تخلص کہ یکے از مشایخ کبار گذشتہ۔ احوال و اشعار ایشاں مفصل در تذکرۂ فارسی نوشتہ ام۔ در ابتدائے شوقِ شعر کہ ہنوز از میر و مرزا وغیرہ کسے در عرصہ نیامدہ بود در دورِ ایہام گویان اول کسے کہ شعرِ ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ او ست چوں در آں روزہا بہ میر عبدالحی تاباں دوستی بسیار[2] داشت۔ چند غزلیاتِ متعددہ از خامۂ فکرش بر صفحۂ کاغذ ریختہ بودند کہ مشارٌ الیہ مانع آمدہ۔ آخر ایشاں قرار شعر گفتنِ خود بزبانِ فارسی دادند و بعد ازیں بہ ریختہ زبان نیالودند مگر ہماں قدر کہ باصلاحِ دو سہ شاگرد بکار آید چنانچہ بتربیت انعام اللہ خاں نسبت بہ محمد فقیہ دردمند کہ ساقی نامۂ ایشاں شہرت دارد بیشتر متوجہ بودند۔ در تمام دیوانش فصاحت و بلاغتِ زبانِ استاد جلوۂ ظہور می دہد فی الحقیقت نقاشِ اولِ زبانِ ریختہ بایں و تیرہ باعتقادِ فقیر مرزا است۔ بعدہ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ۔ از وست

اُس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ　　اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
برگِ حنا اوپر لکھو احوالِ دل مرا　　شاید کہ جا لگے وہ کسو میرزا کے ہاتھ
مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر　　سورج کے ہاتھ چوڑی ونکھا صبا کے ہاتھ

---

(۱) جاناں۔ (ان خ) (۲) بہ شدت (ان خ)

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے — کہاں اس کو دماغ اور دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بے کس افسوس — کیا ہوا اُس کے تئیں اتنا تو بیمار نہ تھا

مت اختلاط کرلے نو بہار اب ہم سے (۱) — چمن کے ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں
یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے (۲) — قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

(۳) میر

میر محمد تقی میر تخلص کہ مفصل احوالِ ایشاں نیز در تذکرۂ فارسی سمت تحریر یافتہ۔ شخص صاحب کمال است اکثرے در فنِ ریختہ اورا در پلۂ مرزا رفیع سودا گرفتہ اندو اکثر در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو و قصیدہ بر وفضیلت می دہند غرض ہر چہ ہست استادئی ریختہ بر و مسلم است۔ اگر چہ دیوانِ فارسی ہم دارد اما در فارسی گویان شمردہ نمی شود۔ ہمہ ریختہ گویانِ ہند سند از کلامش می آرند و او را دریں فن مستثنیٰ میدانند و الحق کہ چنیں است۔ از چند سال کہ از شاہجہاں آباد بہ پورب رسیدہ در سرکارِ نواب آصف الدولہ بہادر اعتبار و امتیازِ تمام دارد۔ چہار دیوانِ ریختہ از خامۂ فکرش ریختہ و مثنویہائے متعددہ و شکارنامہ ہائے بے نظیر نگاشتۂ کلکِ ندرت طرازِ او بر صفحۂ زمانہ یادگار است۔ بر فقیر بسیار مہربانی می فرماید عمرش تخمیناً قریب ہشتاد است(۳)۔ ازوست۔

تیرے کوچہ میں یہ جتنے کہ بسم زار بیٹھے ہیں — میاں گم کردۂ دل ہیں جو یوں لاچار بیٹھے ہیں

(۱) یہ آخری دو شعر نسخۂ رامپور میں زائد ہیں۔ (۲) رسیدہ باشد۔ (ن خ)

مدت سے لگ رہی ہیں آنکھیں درِ حرم سے — پردہ اٹھا تو لڑیاں نظریں ہماری ہم سے

تازہ چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہو — ٹہنی جو زرد بھی ہو سو شاخِ زعفراں ہو

عشق کو بیچ میں یارب تو نہ لایا ہوتا — یا اس آدے میں مرا دل نہ بنایا ہوتا
کم اٹھانا تھا نقاب آہ کہ طاقت رہتی — کاش یکبار ہمیں منہ نہ دکھایا ہوتا
در کے آگے سے ترے نعش گئی عاشق کی — اپنے دروازہ تلک تو بھی تو آیا ہوتا

جدا جو پہلو سے وہ دلبرِ یگانہ ہوا — طپش کی یہاں تئیں دل نے کہ درد شانہ ہوا
کھلا نشہ میں جو پگڑی کا پیچ اُس کی میر — سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا

باغ میں جس شب گئے ہم ظلم کے مارے ہوئے — جان کو اپنی گلِ مہتاب انگارے ہوئے
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے
آستیں رکھتے ہی رکھتے دیدۂ خونبار پر — حلقِ بسمل کی طرح لوہو کے فوارے ہوئے
استخواں ہی رہ گئے تھے یہاں دمِ خونریز میر — دانتے پڑ پڑ گیے اُس شوخ کے آرے ہوئے

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ زبس تیرا میر — اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ — وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ
آگے تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
بس ہوا ناز ہو چکا اغماض — ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ

ہے رہی بیگانگی کبھی اُس سے ۔۔۔ نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ
میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں ۔۔۔ اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

دل عجب جنسِ گراں قدر ہے بازار نہیں ۔۔۔ شے بہا سہل جو دیتے ہیں خریدار نہیں
کچھ تمھیں ملنے سے رُکتے ہو ہمارے ورنہ ۔۔۔ دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں ۔۔۔ وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں ۔۔۔ طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
ایک نے صورت نہ پکڑی پیشِ یار ۔۔۔ دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں
آ چمن میں یہ بھی ہے کوئی روش ۔۔۔ نازتا کے چند بے پروائیاں
شوقِ قامت میں ترے اے نونہال ۔۔۔ گُل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں
پاس مجھکو بھی نہیں ہے اب سکے میرؔ ۔۔۔ دور تک پہنچیں مری رسوائیاں

اعجاز منہ تکے ہے ترے لب کے کام کا ۔۔۔ کیا ذکر یہاں مسیح علیہ السلام کا
رقعہ نہیں جو آوے ہے سو تیر میں بندھا ۔۔۔ کیا دیجے جواب اجل کے پیام کا
صاحب ہو مار ڈالو مجھے تم وگرنہ کچھ ۔۔۔ جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا

سر پہ عاشق کے نہ یہ روزِ سیہ لایا کرو ۔۔۔ جی الجھتا ہے بہت مت بال سلجھایا کرو
تابِ مہ کی تاب کب ہے نازکی سے یار کو ۔۔۔ چاندنی میں آفتابی کا مگر سایا کرو
کب میسر اُس کے منہ کا دیکھنا آتا ہے میرؔ ۔۔۔ پھول گل سے اپنے دل کو تم بھی بہلایا کرو

کہتا ہے کون میرؔ کہ بے اختیار رو ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

بھرے رہتے ہوں سارے پھول ہی جس کا گریباں میں وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں
جہاں سے دیکھئے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں
ہوئے ابر میں کیا میرؔ ہنستا باغ میں وہ تھا گری پڑتی تھی بجلی آج کچھ صحنِ گلستاں میں

رو چکا خونِ جگر سب اب جگر میں خوں کہاں غم سے پانی ہو کے کب کا بہہ گیا میں ہوں کہاں
عاشق و معشوق یہاں آخر فسانہ ہو گئے جائے گریہ ہے جہاں لیلیٰ کہاں مجنوں کہاں

حال کہنے کی کسے تاب ہے آزار کے بیچ حال رہتا ہی نہیں عشق کے بیمار کے بیچ
آرزو مند ہے خورشید میسر ہے کہاں کہ ذرا ٹھہرے ترے سایۂ دیوار کے بیچ
کیا کہیں ہم کہ گلے ڈالے پھرے مستی میں دانۂ سبحہ پرو رشتۂ زنار کے بیچ

زلفوں کو میں چھوا سو غصہ ہوئے کھڑے ہو یہ بات ایسی کیا ہے جس پر الجھ پڑے ہو
ہوتے ہیں خاکِ رہ بھی لیکن نہ میرؔ ایسے رستہ میں آدھے دھڑ تک مٹی میں تم گڑے ہو

جائیں تو جاویں کہاں جو گھر رہیں کیا گھر رہیں یار بن لگتا نہیں جی کاش کے ہم مر رہیں
زندگی دوبھر ہوئی ہے میری آخر تا کجا دل جگر جلتے رہیں آنکھیں ہماری تر رہیں
وہ نہیں جو تیغ سے اُس کے گلا کٹوائیے تنگ آئے ہیں بہت اب آپ جوہر کر رہیں

جس کا خوباں خیال لیتے ہیں دل کلیجا نکال لیتے ہیں

پڑتی ہے آنکھ ہر دم جا کر صفائے تن پر — سو جی کئے تصدق اس شوخ کے بدن پر
نام خدا نکالے کیا پانوں رفتہ رفتہ — تلواریں چلتیاں ہیں اس کے تو اب چلن پر
درکار عاشقوں کو کیا ہے جواب نامہ — اک نام یار بس ہے لکھا میرے کفن پر
کس طرح میر جیو کا ہم توبہ کرنا مانیں — کل تک بھی داغ مے تھی سب اُن کے پیرہن پر

ہمارے آگے ترا اگر کسی نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یا پہلی وہ نگاہیں جن سے کہ چاہ نکلے — یا اب کی یہ ادائیں جو دل سے آہ نکلے

کبھی میر اس طرف آ کر جو چھاتی کوٹ جاتا ہے — خدا شاہد ہے اپنا تو کلیجہ ٹوٹ جاتا ہے

آتے ہی آتے تیرے یہ ناکام ہو چکا — وہاں کام ہی رہا تجھے یہاں کام ہو چکا

جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہوگا — تہ خاک بھی خاک آرام ہوگا

جفا و جور سہے کج ادائیاں دیکھیں — بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
تری گلی سے سدا اے کشندۂ عالم — ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں
بنی نہ اپنی تو اس جنگجو سے اک دم میر — لڑائی جب سے میں آنکھیں لڑائیاں دیکھیں

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا — آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا
دیکھنے آئے دم نزع لئے منہ پہ نقاب — آخری وقت مے منہ کا چھپانا کیا تھا

جب نہ تب مرنے کو تیار رہے عشق میں ہم — جی کے تئیں اپنے کبھو یوں بھی نہ جانا کیا تھا

آزار دیکھے کیا کیا اُن پلکوں سے اٹک کر — جی سے گئے یہ کانٹے دل میں کھٹک کھٹک کر

تلوار غرق خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں — دیکھیں تو تیری کب تک یہ بدشرابیاں ہیں
جا ہے جو آج ہوں میں ہفت آسماں کے اوپر — دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں
دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں — اب ہم نے بھی کسی سے آنکھیں لڑائیاں ہیں
ہم وے ہیں خوں گرفتہ ظالم جنھوں نے تیرے — ابرو کی جنبش اوپر تلواریں کھائیاں ہیں
کعبہ میں میر ہم پہ ہے سرگراں یہ زاہد — اور بت کدہ میں ہم نے دھولیں لگائیاں ہیں

غیروں سے وہ اشارے ہم سے چھپا چھپا کر — پھر دیکھتے ہوا ادھر آنکھیں ملا ملا کر
ہم گام سدِ رہ تھی بت خانہ کی محبت — کعبہ تلک تو پہنچے لیکن خدا خدا کر

مانندِ شمع آتشِ غم سے پگھل گیا — بزمِ جہاں میں رہتے ہی رہتے میں گل گیا
گرمیِ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی — میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر — تیوری چڑھائی تو نے کہ یہاں دم نکل گیا

یہاں اپنی آنکھیں پھر گئیں پر وہ نہ آ پھرا — دیکھا نہ بدگمان ہمارا بھلا پھرا
طالع پھرے سپہر پھرا قلب پھر گئے — چندے وہ رشکِ ماہ جو ہم سے جدا پھرا
خانہ خراب میر بھی کتنا غیور تھا — مرتے موا پہ اُس کے کبھو گھر نہ جا پھرا

پھرتے تک تک شہر میں اب سوئے صحرا رو کیا — کام اپنا اس جنوں میں ہم نے بھی یکسو کیا

نکہتِ خوش اس کے پنڈے کی سی آتی ہے تجھے — اس سبب گل کو چمن میں ڈُریں نے بو کیا

جانا اس آرام گہ سے ہے بعینہ بس یہی — جیسے سوتے سوتے ادھر سے ادھر پہلو کیا

ہاتھ پر رکھ ہاتھ اب وہ دو قدم چلتا نہیں — جس نے بالشِ خواب کا برسوں مرا بازو کیا

پھول نرگس کا لئے بھونچک کھڑا تھا رہ گیا — کس کی چشمِ پرفسوں نے میر کو جادو کیا

کیا چال نکالی ہے کہ جو دیکھے سو مر جائے — بھونچک کوئی رہ جائے کوئی جی سے گذر جائے

بے طاقتیِ دل سے مری جان ہے لب پر — تم ٹھہرو کوئی دم تو مرا جی بھی ٹھہر جائے

تا چند یہ خمیازہ کشی تنگ ہوں یارب — آغوش مری ایک شب اُس شوخ سے بھر جائے

جنوں نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو — نکالا جائے مو سر سے ٹک خارِ مغیلاں کو

بے رنگ بے ثباتی یہ گلستاں بنایا — بلبل نے کیا سمجھ کر یہاں آشیاں بنایا

اوڑتی ہی خاک یارب شام و سحر جہاں میں — کس کے غبارِ دل سے یہ خاکداں بنایا

سرگشتہ ایسی کس کی ہاتھ آگئی تھی مٹی — جو چرخ زن قضا نے یہ آسماں بنایا

نقشِ قدم سے اُس کے گلشن کی طرح ڈالی — گردِ رہ اس کی لے کر سروِ رواں بنایا

اس صحن پر یہ وسعت اللہ رے تیری صنعت — معمار نے قضا کے دل کیا مکاں بنایا

وہ تو مٹا گیا تھا تربت بھی میر[۱] جیو کی — دو چار اینٹیں لے کر میں پھر نشاں بنایا

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجلا کے نہ ہم — اپنے دامن میں اگر آج گریباں ہوتا

---

(۱) جی۔ (ن خ)

تابوت پر بھی میرے نہ آیا وہ بے نقاب   میں اُٹھ گیا ولے نہ اُٹھا بیچ سے حجاب

آہ رو کوں جانے والے کس طرح گھر کے ترے   کاش مجھکو گاڑ دیویں بیچ میں در کے ترے

بہار آئی ہر غنچہ گل کے نکلے ہیں گلابی کر   نہال سبز جھومیں ہیں گلستاں میں شرابی کر
مبادا کارواں جاتا رہے تو صبح سوتا ہو   بہت ڈرتا ہوں میں سلے میر تیری دیر خوابی سر

ہر بات پر خشونت طرز جفا تو دیکھو   ہر لمحہ بے ادائی اُس کی ادا تو دیکھو
گل برگ سے ہیں نازک خوبی پا تو دیکھو   کیا ہے جھمک کفک کی رنگ حنا تو دیکھو
سایہ میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت   اُس فتنۂ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو

کاش کے دل دو تو ہوتے عشق میں   ایک رہتا ایک کھوتے عشق میں

باغ گو سبز ہوا پر سر گلزار کہاں   دل کہاں، وقت کہاں، عمر کہاں، یار کہاں
دل کی خواہش ہو کسو کو تو کمی دل کی نہیں   اب بھی یہ جنس بہت ہے پہ خریدار کہاں

ملک جہاں ہر وفا کی جنس تھی میرے کنے   لیکن اس کو پھیر ہی لایا جہاں میں سے گیا
ریختہ کا ہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میر   جو زمیں نکلی اُسے تا آسماں میں لے گیا

میرا ہی مقلدِ عمل تھا   مجنوں کے دماغ میں خلل تھا
تھا نزع میں دستِ میر دل پر   شاید غم کا یہی محل تھا

نسیمِ مصر کب آئی سوادِ شہرِ کنعاں کو — کہ پھر جھولی نہ یہاں سے لے گئی گلہائے حرماں کو

کوئی کانٹا سرِ رہ کا ہماری خاک پر بس ہے — گلِ گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

صدائے آہ جیسے تیر جی کے پار ہوتی ہے — کسو بیدرد نے کھینچا کسو نے دل سے پیکاں کو

کریں باب ملک فرش رہ اس ساعت کو محشر میں — ہو ڈوبا کفن لادیں شہیدِ نازِ خوباں کو

کیا سیر اس خرابہ کا بہت اب چل کے سو رہیے — کسو دیوار کے سایہ میں منہ پر لے کے داماں کو

تری ہی جستجو میں گم ہوا ہے کہہ کہاں کھویا — جگر خوں گشتہ دل آزردہ میر اس خانہ ویراں کو

قد کھینچے ہے جس وقت تو ہے طرفہ بلا تو — کہتا ہے ترا سایہ پری سے کہ ہے کیا تو

رباعی

کیا جانے لبا ہے آج کس کے جاکر — آتی نہیں نیند مجھکو تنہا پاکر

ہے جی میں نہ اٹھیے تا بہ صبحِ محشر — اس رات کو سوئیے کچھ ایسا کھاکر

دیگر

کیا میر ہوئی تھی جان تجھکو بھاری — جو اس بتِ سنگدل سے کی ہے یاری(۱)

بیمار بھلا کوئی بھی ہووے اس کا — پرہیز کرے جس سے خدائی ساری

دیگر

وہ عہد گئے کہ جور اس کے سہیے — وہ بات نہیں رہی جو چپکے رہیے

جب جی ہی چلا تو میر پھر صرفہ کیا — بےصرفہ جو کچھ کہ منہ پر آوے کہیے

دیگر

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے — خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے

اب آخرِ عمر میرے کی خاطر — سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے

---

(۱) تھی – دل نسخ

(۴) محبت

نواب محبت خاں محبت تخلص خلفِ حافظ رحمت خاں قوم بڑیچ[1] جوانے است بہ زیور فضل و کمال و حلم و حیا آراستہ و در علم آداب و طریقِ سلوک و تہذیبِ اخلاق بہ اعالی و ادانی ظاہر و باطنش بیکتائی پیراستہ از بسکہ از ابتدائے موزونیٔ طبع خیالِ شعر و روش جاگرفتہ بود فکرِ فارسی و ہندی ہر دو میکند۔ بندہ او را در لکھنؤ دیدہ بسیار بخوبی پیش می آید۔ حق تعالیٰ سلامت دارد۔ من کلامہ۔

نظر کے پڑتے ہی تجھ پر مرا گِلا نہ رہا
کہ دیکھتے ہی تجھے دل میں مدعا نہ رہا

مجھ سے خفا ہے وہ بتِ خود کام اب تلک
جھڑکی وہی ہے اور وہی دشنام اب تلک

درد کس کا مرے پہلو میں خلش کرتا ہے
یا الٰہی مجھے کیوں رات دن آرام نہیں
عاشقی کا تو تری نام ہر اک لیتا ہے
پر محبت سا کوئی عشق میں بدنام نہیں

آرام ایک دن کسی پہلو نہیں مجھے
یارب یہ کس کے درد سے میں بیقرار ہوں

الفت میں جس کو اشک بہانے کی خو نہ ہو
اُس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

ہم سے وحشت اسے کیا کہتے ہیں
اتنی وحشت اسے کیا کہتے ہیں
اس قدر یار سے گرمی کرنی
کیوں محبت اسے کیا کہتے ہیں

---

(۱) بریچ (بجنسہ) (ن خ)

فتنہ گر تونے جو تک ہم سے چھپائیں آنکھیں ایسے ہم رشتے کہ آشوب کرائیں آنکھیں
ہوگئی سب پہ مری اور تری چوری ظاہر تونے محفل میں جو شب مجھ سے چرائیں آنکھیں

یہ نقشا تو کھینچیں بھلا آن کر دریغ آج بہزا دو مانی نہیں

شب میں دیکھا کہ لٹکتا ہی خم زلف میں دل یا رو اس خواب پریشاں کی تو تعبیر کرو

دیرے مجھ کو نہ کچھ کام نہ کعبہ سے غرض کیوں گلا کرتے ہولے گبر و مسلماں میرا

الحذر گریہ سے اے شوخ محبت خاں کے وہ جو رو یا تو بہی جا نو کہ طوفاں اُٹھا

گالی کا انتظا تو حد سے گذر چکا منہ کو کہاں تلک ترے دیکھا کرے کوئی

مجھکو کہتا ہے کہ کرتا ہے تو بدنام صریح لکھ کے بھیجے ہے جو یوں نامہ و پیغام صریح

دیکھ کر آنکھوں کو اس کی سرنگوں کیوں رہ گئے چشم کو کرتے نہیں اے نرگس شہلا بلند

جس کو تری آنکھوں سے سرو کار رہیگا بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

تجھ کو چھوڑا اے بت مغرور نہیں جانے کا جاؤں تو پر مجھے مقدور نہیں جانے کا
زخم دل کو مرے یوں دیکھ کے بولا جراح ہائے افسوس یہ ناسور نہیں جانے کا

اُس کے کوچہ کی طرف باچشمِ تر جو جائے گا ــــ پہلے اپنی جان سے وہ ہاتھ کو دھو جائے گا
بے کسوں کی خاک پر جوشش سے آیا ابرِ بہار ــــ اے فلک آنسو دے وہ بھی آن کر جائے گا

آخر تجھے قفس کی طرف لے چلے نصیب ــــ مرغِ چمن ٹک اور تو گلزار دیکھ جا

(۵) محنت

مرزا حسین علی محنت تخلص مولدش مغل پورہ بعمر پنج سالگی بطرف پورب رسیدہ جوانِ سلیم الطبع وکم گو است بمقتضائے موزونی طبع فکرِ شعر و ریختہ بخوبی می کند و شعرِ خود را از نظرِ قلندر بخش جرأت می گذرانید۔ از وست

ہو رقیبوں سے ملاقات اُس بتِ گمراہ کی ــــ اور ترستے ہم رہیں قدرت ہے یہ اللہ کی

کان میں غیر کے جو تو نے کہا سمجھا میں ــــ لے نہ گھبرا تری محفل سے اٹھا جاتا ہیں

کیا ہے یہ تیرا مجھ کو رُلا کے ہنسنا ــــ پھر نسپہ اے ستمگر یوں کھل کھلا کے ہنسنا
در سے اٹھایا مجھ کو اور میں ہنسا تو بولا ــــ ہے سخت بے حیائی ٹھوکر اٹھا کے ہنسنا
کیا وصل میں مزے تھے اس شوخ کے کہ مجھ کو ــــ کچھ آ کے چھیڑ جانا پھر بھاگ جا کے ہنسنا
بدحال دیکھ مجھ کو غیروں سے یوں کہے ہے ــــ ٹک واسطے خدا کے اس کو بلا کے ہنسنا

آمدِ فصلِ گل کی نسیمِ سحر سُنا ــــ مر جاؤں گا قفس میں مت ایسی خبر سنا

الفت ہوئی ہے اُس بتِ مغرور سے مجھے ــــ پھیرے ہے منہ جو دیکھتے ہی دور سے مجھے

ناصح یہ نصیحت نہ سنا میں نہیں سنتا | بک بک کے مرا مغز نہ کھا میں نہیں سنتا
احوال مرا دھیان سے سنتا تھا و لیکن | کچھ بات جو سمجھا تو کہا میں نہیں سنتا
اس بت نے جو غیروں پہ کیا لطف تو یارو | مجھ سے نہ کہو بہر خدا میں نہیں سنتا
کچھ ذکر میں ذکر اپنا میں لایا تو وہ بولا | بس بات کو اتنا نہ بڑھا میں نہیں سنتا
شکوہ سے ہی کرتا ہے جو کوئی اُس سے مرا ذکر | تو کہتا ہے ہر اک کا گلا میں نہیں سنتا
محنت کو ہے یہ ضعف کہ کچھ اپنی حقیقت | کہتا ہے وہ مجھ سے تو ذرا میں نہیں سنتا

رحم آئے نہ کچھ اس بتِ خونخوار کے دل میں | جب تک کہ اُٹھے درد نہ دو چار کے دل میں
وہ جنسِ نہ یوں ہوں میں کہ لیتے ہوئے جس کو | سو سوچ گزرتے ہیں خریدار کے دل میں

کل شبِ وصل کی کیا جلد کٹیں تھیں گھڑیاں | آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے

(۶) مائل

مرزا محمد یار بیگ مائل تخلص جوانِ خوش اخلاق شاگرد جرأت۔ از وست۔

یہ کہاں مقدور جو اس کو بلا کر دیکھئے | دل میں ہے قاتل کو اپنے آپ جا کر دیکھئے

مائل تجھے اضطرار کیوں ہے | اتنا بھی تو بے قرار کیوں ہے
رونے کا خیال ہم کو دن رات | اے دیدۂ اشکبار کیوں ہے

آنکھوں کے سامنے نہ ہو وہ گلعذار حیف | اور اس بغیر میں رہوں جیتا ہزار حیف

(ن) بڑھا

کیوں مجھ سے خفا ہیں تے ہوئے جان کہو تو — کیا میری ہی تقصیر میں قربان کہو تو

پیتا ہوں جامِ مے کے عوض کاسہ نبگ کا — مائل ہوا ہوں جب سے میں اک سبزہ رنگ کا

رو رو کے میں نے زانوئے حسرت پہ سر رکھا — جب یہ سُنا کسی نے کوئی اپنا کر رکھا
کیا آمدِ بہار سے خوش ہوں کہ ہم کو آہ — گردوں نے فصلِ گل میں بھی زنداں ورکھا

اختر سے تھے گر موتی اُس کان کے بالے کے — اک چاند بھی جھمکے تھا جھرمٹ میں دو شالے کے
فانوس میں کب دیکھا یوں شمع کے شعلہ کو — جھمکے ہے بدن اُس کا جوں کرتے میں والے کے
جوں کان میں تیرے ہے یہ موتیوں کا بالا — کب گرد ستارے ہیں یوں چاند کے ہالے کے
وہ زلف جو ڈس جاوے تو خاک جیئے کوئی — بچتے ہیں کہیں مائل کاٹے ہوئے کالے کے

کل جو نہیں اٹھا مجھ سے وہ باتوں میں بگڑ کر — میں بیٹھ گیا وو ہیں کلیجہ کو پکڑ کر
کیا جانئے ہے راہ کدھر ملکِ عدم کی — یارب نہ رہے قافلہ سے کوئی بچھڑ کر

(۷) مشتاق

عنایت اللہ مشتاق تخلص پیرزادہ سرہندی است۔ چنداں بہرہ از علم ندارد۔ اکثر در مشاعرہ ہائے شاہجہان آباد بہ بندہ خانہ حاضر می شد۔ روزے بر سرِ راہِ دولت خانہ با من دو چار شدہ بود تازہ باین طرف رسیدہ اما با زندیدش کہ چہ شد و کجا رفت یکی[1] از و بہم رسیدہ این است۔

---

(۱) دو شعر از و بہم رسیدہ و آں اینست۔ (ن خ)

اے باغباں نہ جائیو بلبل کے متصل | بیٹھی ہے کس خوشی سے وہ ٹک گل کے متصل
مشتاق وہ جو شانِ محمد ہے اور علی | ٹھیرے ہے کون اس کے تحمل کے متصل

(۸) مجنون

درویش برہنہ، شاگردِ میر محمد تقی صاحب از اولادِ رائے پیم ناتھ منشی نبیرۂ رائے بشن ناتھ کہ بہ حشمت و اقبالِ خاندانِ ایشاں شہرتِ تام دارد۔ مشاقِ قدیم است۔ دیوانش[۱] آب زدہ از نظرِ فقیر گذشتہ۔ از دست۔

چڑھا کر ساغرِ لبریز جس دم تو نکلتا ہے | ترا انداز ہنسنے کا گلوں کے منھ ملتا ہے

سر کٹا دیں گے ہم اپنا تیری ہی شمشیر سے | لڑ گئی تدبیر اپنی گر کبھی تقدیر سے

بیٹھا تھا دیکھ مجھکو بہانے سے اٹھ گیا | حسنِ سلوک آہ زمانہ سے اٹھ گیا

تری ہی بے وفائی سے لے زندگانی | چھپانا پڑا منہ ہمیں تو کفن میں

پیا نہیں قدح سے کو میں کبھو تجھ بن | رہا مدام مرے جام میں لہو تجھ بن
اسیرِ زلف ترا ہوں تجھی سے کہتا ہوں | سنے گا حال مرا کون مو بہ مو تجھ بن
نہ پوچھ حال تو مجنوں کا اے بتِ کافر | خراب و خوار وہ پھرتا ہے کو بکو تجھ بن

جس سے دل چاہے ملو تم نہ کسی سے پوچھو | مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے ہی جی سے پوچھو

(ن) بھیم۔ (۱) نسخہ ر میں دیوانش سے قبل یہ الفاظ ہیں "بہ شرف اسلام مشرف شدہ"

سجدوں نے میرے قدرت اپنی دکھائی اتبو | پوجے ہی تجھکو لے بت ساری خدائی اتبو
کیا پوچھتا ہے مجنوں غیروں سے آشتی سے | رہتی ہی اُس سے مجھ سے ہردم لڑائی اتبو

سر پٹکنے سے بھی کچھ حاصل نہیں مجنوں بس اُٹھ | یار کب نکلے ہی باہر گھر سے گو بیٹھے ہیں ہم

(۹) مشتاق

عبداللہ خاں ولد ابوالحسن خاں ابن سیف اللہ خاں المتخلص بہ مشتاق، قوم افغان یوسف زئی۔ مولد بزرگانش کاشان بود بقولش جد و پدرش ہر دو شاعر بودند سیفی[1] تخلص جد و حسن تخلص والدش میکرد۔ و از بسکہ بہ فضل و کمال در آں زمانہ موصوف بودہ اند، برخلاف زعم خود اشتہار بہ شیخی نیز[2] داشتند۔ جد مرحومش استاد بہادر شاہ بود و پدرش بہ سبب کثرت زر و مال کہ در خانہ داشت ترک روزگار کردہ بخانہ نشینی گذرانیدہ الحاصل خان مذکور از حضور معلیٰ حضرت ظل سبحانی مشتاق علی خاں خطاب یافتہ۔ بہ منصب پانصدی ذات و جاگیر ممتاز است و بہ استادی مرزا فرخندہ بخت بہادر مامور۔ در علم جفر و رمل و ہندسی رغبتی تمام دارد و نیز در نوشتن خط نستعلیق و ثلث و شفیعا یگانۂ روزگار و جوان خوش خلق و خوش اختلاط و عاشق پیشہ در ابتدا ئے فکر سخن در الہ آباد شعر خود را بہ شاہ محمد علیم حیرت الہ آبادی نمودہ، در شاہجہاں آباد از میر محمد تقی میر استفادہ نمودہ۔ از وست۔

شہید عشق تمہارے کی نعش اُٹھتی ہے | بنے تو تم بھی چلو ٹک نماز کرنے کو

رنگ کیوں سبز ہے مشتاق ترے چہرے کا | کس نے دکھیا ہی تجھے زہر بھری آنکھوں سے

---

(۱) سیفی۔ (۲) شیخی نیز داشتند۔ (ن خ)

کی اک نگاہ پاس جو مژگانِ یار پر — سو برچھیاں چلیں دلِ امیدوار پر
جی بند ہو نکل بھی گیا تو کھلی رہی — اے چشم آفریں ہے ترے انتظار پر
مشتاق تیرا کشتۂ تیغِ فراق ہے — تقریبِ فاتحہ سے چل اس کے مزار پر

تو جئے مجنوں مرجائے لیلیٰ — لے ولے ویلا صد ولے دیلا

خرد کو روؤں یا اس دل زمینِ ناز پرور کو — کیا اک ترک نے غارت مرے لشکر کے لشکر کو
پسِ مردن یہ سنتے ہیں کہ تھے دستِ طلب باہر — کفن میں آہ کس خواہش نے گھیرا تھا سکندر کو
کمدر ناقۂ لیلیٰ چلا آتا ہے صحرا سے — صبا کس نے ستایا آج قیسِ خاک بر سر کو
مسی آلودہ دندانِ تبسم میں تماشا کر — نہ دیکھا ہو جو تو نے گر شبِ یلدا میں اختر کو

آہ لاحق عشق کی جب سے یہ بیماری ہوئی — بار ہا نبضیں چھٹیں اکثر غشی طاری ہوئی
بیقراری بے کلی در پے طپش رہنے لگی — آہ دل دیتے ہی عاید یہ گنہگاری ہوئی
دل سنبھل چل وعدۂ بوسہ شبِ دیگر پہ رکھ — یار جو نکلا پاسبانوں میں خبرداری ہوئی
کیوں نہ بھٹکے تو پھرے اے خواہشِ دل دربدر — بے نیازوں سے تری کب ناز برداری ہوئی
کھینچ تیغہ دشمنِ جاں امتحاں کرتا ہے کیا — کر چکے ہم عاشقی جب زندگی بیاری ہوئی
کیا کہوں کیا ظلم غفلت سے ہوا مشتاق رات — جا چکا پہلو سے جب دل تب خبرداری ہوئی

ہر قدم پر اس کے کوچہ میں غش آیا مجھے — ناتوانی ہائے یہاں تک تجھ نے بٹھایا مجھے

مٹے ہر دم بدم یہاں وصل کی تدبیر کا نقشہ — دکھائی دے ہے کچھ بے ڈھب ہی تقدیر کا نقشہ

(۱۰) منشی

میر محمد حسین منشی تخلص، سید صحیح النسب از سادات رضویہ ابن میر ابوالحسن عرف میر کلن خوشنویس. بزرگانش اہل ولایت بودہ اند از دو سہ پشت در شاہجہان آباد توطن اختیار کردہ. مشارٌ الیہ خطِ نستعلیق بسیار درست می نویسد و در فنِ انشا پردازی ہم مہارتِ تام دارد. اکثر کتبِ نظم و نثر فارسی از نظرش گذشتہ و قلیل و کثیر در عربی ہم مُلِد چوں از رہبریِ بختِ سعید خدمتِ منشی گری مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ بہادر باو متعلق است ہمیشہ بخطوط نویسیِ حضور والا مصروف می باشد- از آنجا کہ بسبب درستیِ سلیقۂ نظم و نثر و آگاہیِ فصاحتِ زبانِ اردوئے معلیٰ صرافِ سخن ہم او را می تواں گفت لہذا ہر غزلے کہ از حضور ارشاد می شود مشاطگیِ تحریر و تقریر و ترتیبش بدستِ اختیارِ اوست معہٰذا بموجبِ ارشادِ حضور و جبلتِ موزونیِ طبع گاہ گاہے فکرِ شعرِ ہندی ہم میکند عمرش تخمیناً بست و ہفت سالہ خواہد بود- از وست.

مالوف طبع اُس کی ہے جور و ستم کے ساتھ
پھر ہم کو ربط کیوں نہ ہو اندوہ و غم کے ساتھ

صبحِ شبِ وصال ذرا ٹھیر کر نکل
ورنہ یہ جی ہوا ہے برابر تیرے دم کے ساتھ

منشی رقم کروں میں جیسا بیاں سوزِ دل
نکلے ہے دودِ آہ سرِ قلم کے ساتھ

کی جس سے محبت میں لُٹے یار نہ پایا
اس جنس کا کوئی بھی خریدار نہ پایا

تقصیر بھلا کیا ہوئی بتلاؤ جو ہم نے
دروازہ تلک آپ کے کل بار نہ پایا

نہ پوچھو اُس پری کے حسن کا عالم کہ آفت ہے
بلا شوخی غضب رفتار قامت اک قیامت ہے

دیا آئینہ میرے ہاتھ جو آج اس پریرو نے
تو کیا معنی کہ یعنی صاف اب رفعِ کدورت ہے

جو پوچھا اُس سے لوگوں نے کہ منشی کون ہے بولے　　مجھے کچھ تو نہیں اُس سے دو دو کی صاحب سلامت ہے

نہ رکھئے دیر سے مطلب نہ اب طوفِ حرم کیجے　　تنگ آیا ہے جی ہستی سے ٹک سیرِ عدم کیجے
اگر خط بھیجئے اس کو تو پھر حضرت سلیماں کا　　یہ مصرع کر کے تضمیں ایک شعر اب یوں رقم کیجے
سوا احوالِ دل اپنے کے منشی سے اگر تم کو　　لکھا ہو حرف شکوہ کا تو ہاتھ اس کے قلم کیجے

گھر سے جو نکلے ہو جی آج تم اس تراش سے　　آپ کو کچھ خبر بھی ہے دل کی مری خراش سے
کوچۂ یار کا پتا جب نہ ملا تو مر گئے　　خوب ہوا کہ چھٹ گئے روز کی ہم تلاش سے
منشیِ خستہ دل کو اب عشق میں اُس پری کے ہے　　فکر نہ کچھ معاد کا کچھ نہ خبر معاش سے

مقتول (۱۱)

مرزا ابراہیم بیگ مقتول ولد مرزا محمود علی۔ مولدِ بزرگانش صفاہان وایشان از قدیم مرزایانِ دفتر بودہ اند وخودش در شاہجہان آباد نشو ونما یافتہ سلیقۂ نوشتنِ انشاء نثر بسیار بہ درستی دارد۔ ودر فہمیدِ بد ونیکِ شعر اور احرف بر دیگر صرافانِ معانی است۔ کم کم خود ہم بتقضائے موزونیِ طبع خیالِ شعرِ ہندی می کند و انچہ گفتہ بفقیر نمودہ ماسوائے شاگردی دوستی بسیار باین خاکسار دارد۔ عرش از سی تجاوز خواہد بود از اشعار اوست۔

مطلب رہا نہ کچھ ہمیں دیر و حرم کے ساتھ　　اٹکا ہے دل اک ایسے ہی کافر صنم کے ساتھ

کل گھر سے جو وے سادی پوشاک پہن نکلے　　سو طرح کے اس میں بھی بے ساختہ پن نکلے

---

(۱) محمد علی (ر)

دیکھا ہو جس نے اُس بتِ کافر کے گات کو — آئے نہ فرشِ گل پہ اُسے خواب رات کو
رنگِ شفق کی خاک میں مل جائے سب بہار — جس دم وہ کھولے اپنے حنا بستہ ہات کو
یا تو ہم اُس سے آٹھ پہر ہم کلام تھے — یا اب غضب ہی یہ کہ ترستے ہیں بات کو
مقتول مصحفی سے ہوا ہے مجھے یہ فیض — حق دیرگاہ جگ میں رکھے اُس کی ذات کو

بتاں جب کہ زلفِ دوتا باندھتے ہیں — گرہ میں دلِ مبتلا باندھتے ہیں
نہیں بنتی بلبل سے اپنی چمن میں — ہم اب آشیانہ جدا باندھتے ہیں
میں یہاں خون قاموں ہاتھوں سو اُس کے — جو پاؤں میں اُس کے حنا باندھتے ہیں
جفا کھینچیں گے پرنہ ہاریں گے جی کو — یہ ہم تم سے شرطِ وفا باندھتے ہیں
گرہ دیجے سر پر جو بالوں کا جوڑا — یہ نازک بدن خوش ادا باندھتے ہیں
ہر اک تار میں اُس کے دلہائے عشاق — بہم جمع کر کے بلا باندھتے ہیں
میاں حالِ مقتول دیکھا نہیں کیا — کمر آپ کس پر بھلا باندھتے ہیں

(۱۲) مضطر[1]

لالہ کنور سین مضطر تخلص پسر دیوان دیبی پرشاد قوم کایستھ سک سینہ، بزرگ اش

---

(۱) مضطر کے حالات کے متعلق رامپور کے نسخے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسکی نقل ذیل میں دیجاتی ہے۔
مضطر۔ کرپا دیال عرف لالہ کنور سین مضطر تخلص خلفِ دیوان دیبی پرشاد قوم کایتھ سکسینہ و لالہ درگا پرشاد مضطر کہ ذکر ایشاں گزشت برادرِ عم زادۂ ایشاں اند۔ جوانِ خوش خلق و بسیار حلیم و سلیم و باحیا و متواضع و خادمِ درویشاں است۔ بسبب موزونیِ طبع از عالم کتب چیزے در زبانِ ہندی و فارسی موزوں می کرد و از چندے بسبب دوستی کہ از میاں عیسیٰ تنہا می داشت بحلقۂ شاگردانِ مولف درآمدہ۔ در طبعش روانی کمال است و خیالش بسیار رسا ست، و اساس

ہمہ عمدہ معاش و باجاہ و ثروت بودہ اند، از شاہجہاں آباد اند خودش در لکھنؤ تولد و زیست یافتہ و بہ سنِ تمیز رسیدہ بہ سبب موزونیٔ طبع کہ اکثر کودکان رامی باشد. از عالمِ ملتب نشینی چیزے در زبانِ ہندی و فارسی موزوں می کرد و از حیا بکس نمی نمود بلکہ از بزرگانِ خود خفیہ می داشت. از چندے معرفت محمد عیسیٰ تنہا کہ ذکرِ ایشاں گزشت بہ حلقۂ شاگردیٔ مؤلف در آمدہ۔ در طبیعتش روانی بسیار معلوم می شود اما از بے اطلاعیٔ طرزِ شعر و محاورۂ زبان ناچار است. اگر چندے مشقِ سخن بہ سلیقۂ شاعری خواہد کرد البتہ بجائے خواہد رسید۔ از وست۔

دیکھ کر باغ میں قد سے ترے رعنائی کو | کام فرمانے لگا سرو بھی مرزائی کو
دشمن اپنا ہمیں تم سمجھو ہوا اور غیر کو دوست | ہم نے بس دیکھ لیا آپ کی دانائی کو
اُس کے خالِ تہہ ابرو یہ مجھے آتے ہے رشک | لیکے بیٹھا ہے وہ کیا گوشۂ تنہائی کو
رشک ہے رنگِ حنا پر کہ یہ کس پردہ میں | بوسہ دیتی ہے ترے ہاتھوں کی زیبائی کو
جب سے اس شوخ کا عاشق میں ہوا ہوں مضطر | ہر کوئی دیکھ ہنسے ہے مری رسوائی کو

جو سن کے خفا ہو نام میرا | کس طرح وہ لے سلام میرا
ٹکڑا یہ چار دہ سا دکھلا | کام اُس نے کیا تمام میرا

(۱۴۳) مضطر[۱]

لالہ درگا پرشاد مضطرب تخلص پسرِ دیوان بھوانی پرشاد قوم کایستھ سکسینہ جوانِ صالح

ہمراہِ پدرِ خود بفوجداریٔ محالاتِ چاند پور وغیرہ علاقہ چکلہ بریلی از حضور سرفراز شدہ عمرش بست سالہ خواہد بود۔ از وست۔

(۱) رام پور کے نسخے میں کسی قدر اختلاف ہے۔ اس کی نقل لکھی جاتی ہے۔

دخوش روئی وخوش خوئی است بمقتضائے موزونی طبع گاہ گاہے چیزے موزوں میکند واز آشنایانِ محمد عیسیٰ است ۔ ازوست ۔

بہت بے اختیاری کر چکے ہم — نہایت آہ وزاری کر چکے ہم
کہا میں کچھ تو کیجے میری خاطر — کہا خاطر تمہاری کر چکے ہم
ترے وعدوں پہ ہر اب دم شماری — بس اب اختر شماری کر چکے ہم
اگر یاری یہی ہوتی ہو صاحب — تو بس آگے کو یاری کر چکے ہم
نہ آیا مضطرب وہ رشکِ گلہائے — لہو آنکھوں سے جاری کر چکے ہم

(۱۴) مرہون

مرزا علی رضا مرہون تخلص کہ پیشتر مضمون[1] تخلص میکرد جوانِ صلاحیت شعار است بزرگانش مشہدی بودہ اند وخودش در شاہجہاں آباد نشوونما یافتہ ۔ قبلِ فکرِ شعر بطور سادہ یاد داشت از روئے کہ بحلقۂ شاگردیٔ پسرِ میر قمر الدین منت کہ نظام الدین نام دارد درآمدہ طرزِ متانت گوئی خاندانِ ایشاں اختیا کردہ بافقیر ہم بسیار رجوبی پیش می آید ۔ ازوست ۔

(نوٹ صفحہ ۲۲۴) لالہ درگا پرشاد مضطرب خلفِ دیوان بھوانی پرشاد قوم کالستھ سکسینہ جوانِ صالح خوش خلق است ۔ بزرگانش از ہمیشہ بعہدہ معاش با جاہ وثروت بودہ اند چنانچہ در ۱۲۰۰ھ ہجری کہ راجہ جھگو اندراس صوبہ دار کٹھر بود والد دعویٔ شان دیوانِ کل بودند ، با وصفِ قابلیت وشعورِ سلیقۂ شعر فہمی کہ بسیار درست دارد گاہ گاہے بسببِ موزونیٔ طبع فکرِ شعری کند ۔ اصلش از شاہجہان آباد خودش نشوونما بہ لکھنؤ یافتہ ۔ عمرش تخمیناً بست ودو سالہ خواہد بود از آشنایانِ محمد عیسیٰ تنہا است کہ ذکرِ ایشاں گزشت ۔ (نسخہ رامپور)

(۱) مفتون (نسخہ ر)

کیا سودا اپنے بر میں اب دل کی جستجو کا | یہاں آتش وروں سے وہ جل چکا کبھو کا
ہر آرزوئے دل کو حرماں نے خوں کیا ہے | گردن پہ یاس کے ہے خون اپنی آرزو کا

جز یک نگاہِ خشم کبھی اُس کی خو نہیں | قسمت تو دیکھ یہ بھی کبھو ہے کبھو نہیں

جہاں رکھتا ہو حکم نیشتر ہر خار صحرا کا | وہاں کیا کیا مزے دے آبلہ میری تہِ پا کا
عرق اس لطف سے ہے زیرِ زلف اُس روئے زیبا پر | شبِ مہتاب میں ہو جلوہ جوں عقدِ ثریا کا
سراپا ہو گیا آئینہ ساں جوں محو حیرانی | دلِ مرہونِ ہوا ہے محو کس کے روئے زیبا کا

پڑا ہے شور دل میں جب سے اُس کانِ ملاحت کا | یہاں ہر زخم ہے مہمان نمکدانِ قیامت کا
برہنہ پائی لے چل مجھکو اُس دشتِ مغیلاں میں | جہاں ہر خار کو دعوی ہے نشتر کی نیابت کا
نہیں ہے ملتفت مدت سے یہاں وہ دشنۂ مژگاں | لبِ ہر زخمِ دل سے خون نکلے ہے شکایت کا
یہاں گو حوصلہ طاقت کا برگِ کاہ سے کم ہے | ولے روکش سدا رہتا ہوں میں صد کوہ محنت کا
شہیدِ لطفِ قاتل ہوں کہ بعد از قتل کل اُس نے | کیا محرم لبِ افسوس و انگشتِ ندامت کا

(۱۵) ماہر

میاں فخرالدین ماہر تخلص خلفِ اشرف علی خاں کہ عمدۂ خاندانی ایشاں شہرت تام دارد شخصِ مُسن و جہاندیدہ است مدتے بخدمتِ مرزا رفیع سودا اوقاتِ عزیزِ خود را بکتابتِ دیوانش صرف ساختہ۔ چوں فیضِ صحبتِ بزرگاں ضائع نمی رود خود ہم چیزے موزوں کردہ و آنرا از نظرِ مرزا گذراندہ۔ ازیں جہت اکثر اوقاتِ خود را از مصاحبانِ و مشیرانِ مرزا می شمارد و فخر یہ می گوید کہ مونسِ ہر وقتِ ایشاں بودہ ام و طرفہ تر ایں کہ

باوصفِ آگاہیٔ فن اگر کلامش نگاہ کنی خالی از سخافت نیست، درینجا این مثل بسیار بموقع بیاد آمدہ که دوران باخبر درحضور و نزدیکانِ بے بصر دور۔ از اشعار اوست۔

جو اس کے در پہ بیٹھے ہیں سمجھتے ہیں وہ در کس کا ہوئے جو اس کے آوارہ وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا

ملی فرصت نہ اتنی بھی کہ اٹھ کر مانگتے پانی ہوا تیرِ نگہ یوں آہ دل میں کارگر کس کا

ہوا اُڑ سکے جانے کا اُس کے گھر کس کا فرشتہ پر نہ جہاں مارے وہاں گذر کس کا

(۱۶) موزوں

میر فرزند علی موزوں تخلص متوطنِ سامانہ شخص کثیر الکلام است۔ دعوائے شاعری خیلے در دماغش پیچیدہ، بگمانِ باطل خود را از ہمہ بہتر می داند و فکرِ شعر در زبانِ ہندی و فارسی ہر دو میکند امایلِ طبعش در فارسی از کمالِ تشیع گفتنِ مثنویاتِ مدحیۂ امیر علیہ السلام و نظم کردن معجزاتِ آنجناب مثلِ میر شمس الدین فقیر بیشتر است بلکہ خود را بہ شاگردیِ میر موصوف نیز متہم می سازد امافرقِ شب و روز است۔ از وست۔

یارہی جیت چڑھا ہوا بیٹھے ہیں ہم اُداس سے ذکر کر اُس کا ہمنشیں اُٹھ نہ ہمارے پاس سے

نرگس کا پھول بھیجئے نامہ میں یار کو معلوم تا کرے وہ مرے انتظار کو

(۱۷) محزوں

عالم شاہ پیرزادہ محزوں تخلص، ساکنِ قصبۂ امروہہ در ایامیکہ فقیر مکتب نشیں بود او در آں ضلع شہرت بہ شاعری داشت و در ماہِ محرم مرثیہ و سلام نیز می گفت و می خواند دو سہ شعر از دو بخاطر است۔

بے محابا چاک کرتا ہے گریباں کے تئیں کس کے آنے سے چمن میں گل کو سودا ہو گیا

اسیر مرتے ہیں حسرت میں قتل کی سچ کہہ — خدا کے واسطے کس دن عتاب ہووے گا

اہلِ دنیا تو نہیں دیتے ہیں محزون غم کی داد — کوہکن کو خوابِ شیریں سے جگاؤں تو سہی

(۱۸) محشر

محشر بداؤنی کہ ہیچ از احوالش خبر ندارم۔ یک غزلش بر بیاضِ کہنہ کہ از مدتے پیشِ فقیر است مسطور بود۔ چوں اندکے در سلیقۂ سخن درست می نماید حوالۂ کاغذ کردہ شد۔ از وست

ثمنیے ہو نالہ سے گر یک نفس زباں میری — بہے ہے پھوٹ کے یہ چشمِ خونفشاں میری

جدھر کو سنے اُڑے دل کی تپش کروں پرواز — نہیں ہے برقِ صفت ہاتھ میں عناں میری

ہر ایک وقت کا یہ روٹھنا ترا نا حق — بلا ہے جان پہ لے شوخِ بدگماں میری

ملی تھی چندے محبت کے ہاتھ سے فرصت — نظر پہ پھر چڑھا ہے اک جواں میری

کہوں ہوں بات میں ہر چند خیر خواہی کی — غرورِ حسن میں سنتا ہے تو کہاں میری

ثنا میں زلف کی از بس کیا گیا محشر — قلم کی طرح سیہ ہو گئی زباں میری

(۱۹) مست

جوانِ نو خواستہ بود شاگردِ میر امانی اسد۔ در مشاعرہ ہائے دہلی اکثر بمکانِ فقیر ہمراہ ایشاں می آمد۔ مولف دراں روز با غزلے کہ طرح کردہ بود مصرعش را در مقطع تضمین گردہ است۔

مشاعرہ میں (۱) چلو مست مصحفی جو کہے — کبھی ملا تو کرے بار سے ہر باں ہم سے (۲)

---

(۱) ہتھا ہے جان پہ (مجیبہ)

(۲) کردہ آوردہ دراں انیست۔ (ن خ) (ن) چل ملے۔

(۲۰) مقصود

سقا شاعر بازاریست با وصفِ بے علمی جز اینکه طبیعتش موزوں و روان است ہیچ صنفے نہ دارد و گاہی در مجلس شعرا قدم نے گذارد۔ اطفالِ اجلاف بہ حلقۂ شاگردیش درآمدہ کلامِ واہیش را در ہنگامہ ہا و میلہ ہا می خوانند خصوصاً در ایام ہولی۔ دو شعرش بر مثالے کہ جنتِ لعل از سنگریزہ ہا برآید بہ نظر ایں مبصر رسیدہ و آں اینست۔

عشق کیا جانے کدھر تھا مجھے معلوم نہ تھا — عشق کا دل ہی میں گھر تھا مجھے معلوم نہ تھا

بوسہ لینے سے خفا ہوتے ہو کیوں مشفقِ من — بوسہ وہ چیز ہے دونوں کو مزا دیتا ہے

(۲۱) مائل

میاں محمدی مائل کہ متصل جامع فتحپوری قیام دارد و از شعرائے متوسطِ شاہجہان آباد است اگرچہ فقیر را بایں بزرگ اتفاقِ ملاقات نیفتادہ اما یک دو شعرش زبانی عاقل شاہ روزے کہ برائے شنیدنِ اشعارِ[1] ایں ہیچمدان می آمد بہ سمع می رسید۔ سلیقۂ سخن سنجیش بسیار بردرستی معلوم می شود۔ از وست

اتنا میں مر کے دل سے ترے دور ہو گیا — اک دن بھی آ کے تو نہ سر گور ہو گیا

بتوں سے مل کے گنوایا ہے[2] دین و دل مائل — یہ کافر آہ خدا کا بھی ڈر نہیں کرتا

(۲۲) مہلت

مرزا علی مہلت شاگردِ جرأت چند سال گذشتہ اند کہ او را پیش ازیں[3] بہ علی تقی محشر مناظرہ

(۱) مز خرفات دن نخ (۲) گنوایا ہے دن نخ (۳) ازیں تعلقہ نہ علی تقی محشر رنجشے (ان نخ)

درمیان آمده بود آخر ہر دو بریں قرار داد ندکہ از گومتی عبور کردہ آن روئے آب بہ تیغ جنگ کنند آخر ہمیں کردند کہ مشارٌ الیہ چوں زخمی شدہ بخانہ رسید وارثانش ہر چند پرسیدند از ضاربِ خود نشان نہ داد و در عرصۂ قلیل از ہماں زخمِ جانستان زندگانی را جواب داد۔ از وست۔

گر یادِ گلرخاں کی تہہ خاک کیجئے ۔۔۔ تو قبر میں بھی تن پہ کفن چاک کیجئے
مرنے کے بعد بھی نہ گئی دل کی وہ طپش ۔۔۔ آرام زیرِ خاک بھی اب خاک کیجئے

(۲۴) منت

میر قمرالدین منت متوطنِ سونی پت کہ شاعرِ مسلم الثبوتِ فارسی است۔ در ابتدا چندے استفادۂ ریختہ از محمد قایم نمودہ، چنانچہ مشارٌ الیہ او را در تذکرۂ خود ہمیں جہت بشاگردی یاد کردہ۔ ہر گاہ بعد پیدا کردن قوتِ علمی و تحصیلِ عربی و فارسی نام بہ فارسی گوئی برآورد در آں زمان خود را شاگردِ میر شمس الدین فقیر میگوید و چندے پیشِ نقوت حسین خان ہم آمد و شدے داشت۔ غرضکہ مفصل احوالش در تذکرۂ فارسی نوشتہ ام زیادہ بریں نوشتن موجب دردِ سرِ سامع خواہد بود۔ تصانیفِ بسیار از و بر صفحۂ روزگار یادگار است۔ گاہ گاہے برائے تعلیمِ شاگردانِ ہندی گو لب بزمزمۂ ریختہ می کشود۔ الاتفاقاً خر او بریں بود۔ فقیر بعد تاریخِ رحلتش کہ از دو سال جہان فانی را پدرود کردہ، دو سہ شعر تاریخش برائے من می نویسد۔

تاریخ لمولف

منت کہ یگانہ بہ فنونِ کمالِ شعر ۔۔۔ از ہمسراں نہ کردہ کسے ہمسری او
دیوانِ زندگیش چو شیرازہ وا گذاشت ۔۔۔ در شہر فاش شد خبرِ ابتری او
چوگان و گو نماند و تنگا و ریا نشست ۔۔۔ خالی باند عرصۂ جو لانگری او
ساقیِ روزگار درین مجلسِ خراب ۔۔۔ حنظل فشرد در قدحِ آخری او
واحسرتا کہ سالِ وفاتش نوشتہ شد ۔۔۔ منت کجا و زمزمۂ شاعری او
۱۲۰۶ھ

من کلامہ

مدعی اُس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے
پھر تمنا کو یہاں مژدۂ مایوسی ہے

میری ہی طرح جگر خوں ہی تراٗ مدت سی
اے حناکس کی تجھے خواہشِ پابوسی ہے

آہ اسے کثرتِ داغِ غمِ خوباں کہ مدام
صفحۂ سینہ مرا از جلوۂ طاؤسی ہے

تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھکو منت
ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تواک خوسی ہے

ہم سے وہ جوشش وہ الفت دور کی
آپ کو سوجھی نہایت دور کی

(۲۴۲) محب

شیخ ولی اللہ محب تخلص تبیع و ہم صحبت مرزا رفیع اصلش از شاہجہان آباد است شعر را بہ متانت و پختگی تمام می گفت۔ سوائے دیوانِ ریختہ یک مثنوی ہم بزبانِ فارسی بہ سلکِ نظم کشیدہ۔ از چند سال بصیغہ شاعری درحضورِ مرشد زادۂ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر امتیاز تمام داشت۔ دو سال است کہ بہ مرضِ مزمن ناسور پا وداعِ جہانِ فانی کردہ۔ مرقدش در پیر جلیل است۔ از وست۔

جس طرف تشنۂ دیدار ترے جا نکلے
اُدھر آنکھوں سے بہاتے ہوئے دریا نکلے

یار آیا نہ کہا ضعف سے میں اتنا بھی
خیریت صاحبِ من آج کدھر آ نکلے

قافلہ پہلی ہی منزل سے دیا ہم نے چھوڑ
سفرِ ملکِ عدم کو تنِ تنہا نکلے

جی جو بے چین ہی کوچہ ہی ترا دیکھ آئے
کیا کریں ایک گھڑی دل وہیں بہلا نکلے

ہم چمن میں گئے تھے سیر کو گل دیکھتے ہی
یاد آیا جو وہ گل باغ سے گل کھا نکلے

رکھتی ہے عین وصل سے باہم قرین مجھے
عینک تصور اُس کے کی ہی دوربیں مجھے

گلزارِ حسن پھولتی ہے اس میں چار فصل — آئینہ کی خوش آئی سراسر زمیں مجھے
جائے تشہد اپنی یہ خواہش ہے اے محب — بھولے نہ ذکرِ دوست دمِ واپسیں مجھے

خانۂ دل کہ نہ ہو عشق کا آئین جس میں — ہے وہ قرآں کہ نہیں سورۂ یٰسین جس میں

باغ میں جب وہ گلِ تازہ بہار آتا ہے — بوئے گل پھر تو ہوا پر ہی دھری رہتی ہے

غلط ہم کو کہتا ہے تو بے مروت — تو ہی بے مروت ہے او بے مروت
نہ دیویں جگہ جی میں منہ پھیرتے ہی — اک آئینہ ہے اور تو بے مروت
نہ دو بوسہ اور مفت لو دل ہمارا — پھر اس میں ہمیں کو کہو بے مروت

چشمِ پر آب میں ہے جلوہ قدِ دلجو کا — دید کرتا ہوں عجب سرو بہ کنارِ جو کا
شبِ فرقت میں جو اٹھتی ہیں جگر سے آہیں — اک جہان مجھکو نظر آئے ہے عالم ہو کا
ہاتھ تب عشق کے میں سنگِ گراں پر ڈالا — زور فرہاد کے جب تول لیا بازو کا
باندھنوں پر یہ نیا باندھنوں باندھا ہے محب — شوخ نے چیرہ جو سر پہ ہے سجا سالو کا

اُس بت نے گلابی جو اٹھا منہ سے لگائی — شیشہ میں عجب آن سے جھلکی تھی خدائی
عالم میں نشہ کے شبِ مہتاب میں تیرے — خورشید سے مکھڑے نے ظلمات دکھائی
مارا ہے اسے ڈھوڑ(۱) ترے تیرِ نگہ نے — جس ساتھ میاں تو نے ذرا آنکھ لڑائی
گو غیر کے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے — چھپتی نہیں وہ بات جو مول سو بنائی

(۱) ڈھوڑ ۔ (ن نور محمد)

واللہ ہمیں عشق کی بھولی ہوئی سب چال   کافر تری رفتار نے پھر[1] یاد دلائی
ہر دم تو بھرا شیشہ چھلکتا ہے نشہ میں   ڈرتا ہوں کہ تیری نہ موڑک جائے کلائی
آئینہ نمد پوش ہوا عشق میں تیرے   چارا بروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی
ہم جو تجھے کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا   ہے روزِ قیامت تری اک شب کی جدائی
عاشق کو محب سلطنتِ ہر دو جہاں ہے   گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی

باندھ جوڑا کیا چمک کر اس نے سج بدلی محب   برقِ زیر ابر ہے گویا کناری کا مباف[2]

دل تو پہلے لے چکے اب کیا ہے مطلب آپ کا   بے تکلف وہ بھی کہدیجے کہ ہے سب آپ کا
روز مرہ عاشقوں سے ہے جواب صاف کا   مٹ گیا ان نو خطوں کے دل سے حرف انصاف کا
یہ رگ جاں ہے کسی مقتول عاشق کا میاں   یا کہ جوڑے پر نمایاں رشتہ ہے موباف کا

کی چشم کی سیاہی سپید انتظار نے   تس پر بھی آہ خط نہ لکھا مجھکو یار نے
دھونی لگا رکھی ہے ترے در پہ آہ کی   اے شعلہ خو مرے دلِ امیدوار نے

جو خواہش دل تھی سو وہ ہیہات نہ نکلی   گالی کے سوا منہ سے ترے بات نہ نکلی
دلی کے ہیں کوچوں میں محب سحر کے پھلنے   کس روز نئی ایک طلسمات نہ نکلی

اُسے ذبح کرنے دیجو تو نہ منہ سے آہ کیجو   جو یہ رسم عاشقی ہے تو محب نباہ کیجو
یہ امیدوار کب تک جئے اتنی آرزو میں   کبھی مڑکے اس طرف بھی تو ذرا نگاہ کیجو

---

(۱) "سب" بجائے پھر (ن خ) (۲) موباف (ن خ)

دنیا میں کیا کسی سے سروکار ہے ہمیں — تجھ بن تو اپنی زیست بھی دشوار ہے ہمیں
تو ہی نہیں تو جان تری جان کی قسم — یہ زیست کس کے واسطے درکار ہے ہمیں

(۲۵) منتظر

میاں نورالاسلام منتظر تخلص ولد شاہ فیض علی عرف پیر غلام برادرِ بزرگ شاہ بدر علی ابن شاہ محمد جلیل[ابن] کہ او برادرِ خوردِ شاہ عاقل سبزپوش خدایاد و خود فراموش بود جوانِ صلاحیت شعار و دواستہ مزاج و شوریدہ سر است تحصیلِ عربی تا صرف و نحو دارد و اکثر کتبِ درسی نظم و نثرِ فارسی ہم بخوبی خواندہ از دہ دوازدہ سالگی طبعِ موزوں داشت. چوں شورِ حسن تواماں است در ہماں ایامِ شباب جائے تعلقِ خاطر بہم رسانیدہ تا دوازدہ سال دیگر[۱] خود را بہ تقاضائے دلفریبیِ محبوب مصروفِ فکرِ شعر داشتہ اوقاتِ شباں روزی را شغلِ مجنوں صرف می کرد. از ہشت سال برائے مشورۂ کلامِ خویش پیشِ فقیر آمد و شد دارد. ہرگز دریں عرصہ باوجود کم ملاقاتی و فصلِ سال و ماہ شغلِ دیگراں رجوع بطرفِ دیگر نہ کردہ. اگرچہ بعض اشخاص[۲] ذہانتِ طبعش را دیدہ بسیار خواستند کہ او را بطریقِ حلقۂ بیعتِ خویش کشند ہرگز التفات[۳] نہ کردہ تا آنکہ بہ برکتِ راسخ الاعتقادیِ خویش بمقامِ والائے شاعری رسیدہ. حالا برائے کلہ شکنی آنہا برابرِ من موجود است و کلامش از غایتِ لطف و صفا ہیچ از کلامِ مولف در پایہ کمی نیست. غرضکہ از شاگردانِ رشید ایں خاکسار بیقدار است. عمرش تا امروز بست و پنج سالہ باشد[۴]. از وست[۵]:

ہردم خیالِ یار جو پیشِ نظر رہا — ہجراں میں بھی وصال ہمیں بیشتر رہا
گر یونہی منتظر سے خفا نت رہو گے تم — سن لوگے ایک دن کہ وہ کچھ کھا کے مر رہا

---

(۱) ذکر خود (ن خ) (۲) اشخاص معنوی (ن خ) (۳) التفات گفتہ ایشاں نہ کرد (ن خ) ابن محمد جلیل (ن ق مجد)
(۴) «خواہد بود» بجائے «باشد» (ن خ) (۵) انتخاب دیوان اوست (ن خ)

طرفِ چمن نہ جا نہ سوئے لالہ زار دیکھ
تو آپ باغِ حسن ہے اپنی بہار دیکھ

ہے روزِ حشر دیکھنے کا شوق گر تجھے
اے منتظر تو اپنی شبِ انتظار دیکھ

چاہت مرے دل کی آزمادیکھ
ظالم کہیں تو بھی دل لگا دیکھ

آئے ہیں تیری گلی میں اک زمانہ چھوڑ کر
جاویں اب پیارے کہاں ہم یہ ٹھکانا چھوڑ کر

کیا کریں ناچار پھر آئے تری محفل میں یار
جی ہی سے ہم تو گئے تھے یہاں کا آنا چھوڑ کر

آرزو میں سجدہ کے سر دے دے ار منتظر
سر پہ کیا آفت یہ لی وہ آستانا چھوڑ کر

خلق دیکھے ہے مہِ عید تمام آج کی رات
تو بھی اے ماہ جھلک جالب بام آج کی رات

کل شبِ وصل کو پھر دیکھئے یارب کیا ہو
ہو گئی باتوں ہی باتوں میں تمام آج کی رات

اک ذرا بے ادبی ہوتی ہے تقصیر معاف
پائینتی گر رہے کہئے تو غلام آج کی رات

منتظر ہے یہ شبِ ہجر کہ اک روزِ سیاہ
نہ تو شیشہ ہے نہ ساقی ہے نہ جام آج کی رات

چمن تو پھول گل و لالہ زار پر اپنے
کروں ہیں ناز دل داغدار پر اپنے

دنوں کو روتے ہی روتے تمام عمر کٹی
کریں نہ خندہ ہم اس روزگار پر اپنے

ہمارے جی میں تو تھا زہر کھا کے سو رہیے
ولے یہ ڈر ہے نہ تہمت ہو یار پر اپنے

صدمہ جو شبِ ہجر کا یاد آئے ہے مجھکو
اک دو ہیں پھر ریسی کچھ آجائے ہے مجھکو

پیدا ہوئی اب سے کے نئی طرح کی وحشت
نہ شہر نہ صحرا نہ چمن بھائے ہے مجھکو

دن ، مر

تم پیار کرو گر نہ صنم اور کسی کو — سوگند لو پھر چاہیں جو ہم اور کسی کو
اغیار تو جھوٹے ہیں میں کب تم کو کہا کچھ — پوچھو تو بھلا دیکے قسم اور کسی کو
میں نے جو کہا گھر سے چلے کوئی دم آپ — تو ہنس کے کہا دیجے یہ دم اور کسی کو

گئے چوری سے جو تم غیر کے گھر آخرِ شب — دلِ آگہ نے ہمیں دی یہ خبر آخرِ شب
کل شبِ وصل جو تھی کیسی مچائی تھی دھوم — بولتا آج نہیں مرغِ سحر آخرِ شب
ق
رات بھر تو رہی اُس ماہ کے آنے کی امید — پر ہوا خوب مرا حال تبر آخرِ شب
یاد کر تکیۂ زانو کو میں اُس کے ہر دم — ٹے ٹے مارا کیا بالیں سے سر آخرِ شب
منتظر کیوں نہ جگر سینہ میں فریاد کرے — لے گیا لوٹ کوئی دل کا نگر آخرِ شب

کچھ پردہ فاش نالہ نے کچھ آہ نے کیا — رسوائے خلق ہم کو تری چاہ نے کیا

چاہت کی بات مجھ سے نہ دم دے کے پوچھیے — اپنے ہی جی سے آپ قسم دے کے پوچھیے

لب پہ مرے اُس لب کی تقریر ہے اور میں ہوں — آنکھوں کے تلے اُس کی تصویر ہے اور میں ہوں

کیا جو تم نے مجھے آج پیار تھوڑا سا — نکل گیا مرے جی کا بخار تھوڑا سا

سرو زمیں میں گڑ گئے غنچوں نے سر جھکا دیا — خندۂ گل کو دیکھ جو یار نے مسکرا دیا

یوں لے گئی دل زلفِ سیہ فام لگا کر — جوں صید کو کھینچے ہے کوئی دام لگا کر

کیوں گردشِ دوراں کا نہ کیجے گلہ ہر روز — پڑتا ہے نیا پاؤں میں اک آبلہ ہر روز
ہرگز نہ ہوا طے یہ بیابانِ محبت — درپیش رہا مجھکو نیا مرحلہ ہر روز
ہر جی میں کروں میں بھی سفر ملکِ عدم کو — یاروں کا ادھر جائے ہے اک قافلہ ہر روز
وحشت نے یہ گھیرا ہے کہ دیوانہ کے تیرے — پڑتا ہے نیا پاؤں میں اک سلسلہ ہر روز
اے منتظر اس رشک نے مارا کہ رکھے ہے — اک یار نیا وہ صنمِ دہ دلہ ہر روز

جہاں سے ہم دلِ پُر اضطراب لیکے چلے — عدم کو ساتھ ہی اپنے عذاب لیکے چلے
کبھی نہ لے گئے ہم دل کو اُس تک اچھی طرح — جو لے چلے تو بحالِ خراب لے کے چلے
یہ سرنوشت میں تھا جاتے راہ میں مارا — وہاں سے خط کا جو قاصد جواب لیکے چلے
موا جو منتظر اُن کا وہ اُس کی تربت پر — گل اور شمع برائے ثواب لیکے چلے

کبھی گر بعد ماہ و سال شکل اے ماہ دکھلائی — تو پھر برسوں ہی مشتاقوں کو تو نے راہ دکھلائی
بروز وصل شادی مرگ ہو جانا ہی بہتر تھا — فلک نے یہ شبِ ہجراں ہمیں کیوں آہ دکھلائی

یک بسرِ مو نہ یہ حالِ دلِ ابتر سمجھے — زلف سے تیری جدا اوبت کافر سمجھے
مجھ سے کہتا تھا وہ اک روز سمجھ لونگا میں — حالتِ نزع میں ہوں ہیں ابھی آکر سمجھے
دولتِ حسن ہے جس پاس یہ ہے اس سے سوال — کچھ نہ لے اور نہ دے پر ہمیں نوکر سمجھے

کیا ہجر میں بسر یونہیں اوقات ہوئے گی — یارب کبھی تو اُس سے ملاقات ہوئے گی
جب جانیں گے کہ آج ہمارے بھی دن پھرے — ہمدم نصیب وصل کی جب بات ہوئے گی
کہتا تھا ایک بات پہ میں تجھ سے ہوں خفا — دھڑکے ہے دل مرا کہ وہ کیا بات ہوئے گی

کچھ نہ پایا جب نثارِ عید قرباں کے لئے | لے چلے تب جاں بکف ہم نذرِ جاناں کے لئے
اے صبا یہ ہم صفیروں سے مرا کہیو پیام | کوئی تڑپے ہے قفس میں سیرِ بستاں کے لئے
ہم اسیروں کو رہائی کیا ہو جب ہر عید کو | قفل تو تیار ہوں دربائے زنداں کے لئے

غصہ میں اُس جبیں پہ پڑے جب شکن کئی | دریائے قہر اُن سے ہوئے موجزن کئی
کیوں سیر لالہ زار کو اُس بن گیا میں ہائے | جوں تازہ ہو گئے مرے داغِ کہن کئی
آنکھیں کبھو لڑائیں کبھو دیکھ کر تنا | میلے میں اس نے ہم سے کئے بانکپن کئی

امید ہے کہ مجھکو خدا آدمی کرے | پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے
اس طرح وہ فریب سے دل لے گئی مرا | جس طرح آدمی سے دغا آدمی کرے
بھائیں نہیں کچھ اُس کے نکلتی ہے اپنی جان | کیا ایسے بے وفا سے وفا آدمی کرے
مارا ہے کوہکن نے سر اپنے پہ تیشہ آہ | دل کو لگی ہو چوٹ تو کیا آدمی کرے
گر کچھ کہا بگڑ کے میں بس اُس نے ہنس دیا | کیا ایسے آدمی کا گلا آدمی کرے
گذرا میں ایسی چاہ سے تا چند ہمنشیں | بیٹھا کسی کے سر کو لگا آدمی کرے
ہے عشق بد مرض کوئی جاتا ہے منتظر | کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

(۲۶) ممنون

میر نظام الدین ممنون تخلص خلف الرشید میر قمر الدین منت جوانِ سعادتمند و ذی شعور است۔ در حینِ حیات پدر بزرگوار بعدِ تحصیل کتبِ رسمی بمقتضائے موزونیٔ طبع خود را مصروفِ گفتنِ شعر ہندی و فارسی میداشت تا آنکہ در عرصۂ قلیل قوتِ شاعری چنانکہ شاعر را باید پیدا کرد و کلام خود برتبۂ کلامِ پدر رسانید اکثرے از موزونانِ شہر استفادہ

شعر از دمیکند حق تعالیٰ سلامت دارد۔ از دست۔

بندہ ہوں حسنِ صورت و عشقِ مجاز کا ہر آئینہ میں جلوہ ہے اُس جلوہ ساز کا
از خویش رفتگی ہی پہ ہم غش ہیں[1] یہاں نہیں عزمِ کلیسا و ارادہ حجاز کا
اے آہ بے ادب نہ اُسے پھونکیو کہ ہے دل جلوہ گاہ، پردہ نشینانِ راز کا
ہے آستانِ دیر پہ اپنی نشست و خاست کب ہو حرم میں ہم کو ارادہ نماز کا
یہاں جان تک بھی دے چکے پر ابھی ہاں نہیں جھگڑا چکے گا کیونکہ یہ ناز و نیاز کا
ممنوں دلِ ستم زدہ ہے عشق کا حریف یہاں ہر دو چار صعوہ بے بال باز کا

کل جو خلوت میں وہ بت محوِ خود آرائی تھا آئینہ پشت بہ دیوار تماشائی تھا
جب مقابل ہوا اُس برقِ بلائے ممنوں وقفِ آتش مرا سامانِ شکیبائی تھا

کھولا جو پیچ طرۂ عنبر شمیم کا مشک ختن سے بھر گیا دامن نسیم کا
جب کھول دوں میں سینۂ سوزاں کے چاک کو تب باز، روئے خلق پہ در ہو جحیم کا
دیکھا جو اُس کا قد و وہاں زلف ہٹ گیا زاہد کے دل سے نقش الف لام میم کا

بس ہے یہ لطفِ صبا بہر گرفتارِ قفس راہ بوئے گل کرے سوراخ دیوارِ قفس

منکر ہمارے قتل سے ہوتا ہے تو ہنوز رنگیں ہے اپنے خون سے وہ خاک کو ہنوز
آنکھیں بسانِ آئینہ پتھرا گئیں مری اے خود نما پر آیا نہ ادھر کو تو ہنوز
اپنا غبار بھٹکے ہے مانندِ گرد باد گو ہو گئے ہیں خاک پہ ہے جستجو ہنوز

---

(۱) ہم غش یہاں نہیں۔ (ن خ)

رکھے ہے ڈھنگ کچھ ساقی شرابِ ناب آتش کا
مقطر کیا کیا ہے کہ گلِ شاداب آتش کا

مرے یہ گرم آنسو پونچھ مت دستِ نگاریں سے
کہ ان چشموں سے رہتا ہے رواں سیلاب آتش کا

ڈراتا ہے عبث ممنوںؔ کو تو دوزخ سے اے واعظ
دکھاؤں داغِ دل تو ہووے زہرہ آب آتش کا

قدم[1] رکھا ہے یہاں کس نے کہ گل تصویر قالی کا
رکھے ہے ڈھنگ[2] اُس پائے حنابستہ کی لالی کا

دعائیں زیرِ لب آہستہ آہستہ اُسے دل میں
جو یاد آوے ہے لب تک آ کے رک جانا وہ گالی کا

پڑا ہے پرتوِ مہ طلعتاں اس دیدۂ تر میں
یہاں دیکھ آ کے عالم ماہتابِ پرتگالی[3] کا

نگاہِ شوخ یوں گستاخ مت جا اُس کے عارض تک
خطر ہے سبزۂ نوخیز خط کو پائمالی کا

لکھا جو شعر تعریفِ جمالِ یار میں ممنوںؔ
وہ حسنِ نظم میں ہمسر ہے اشعارِ جمالی کا

کب گل ہے ہوا خواہ صبا اپنے چمن کا
وا جنبشِ دم سے ہے رفو زخمِ کہن کا

بے تابیٔ دل تیرے شہیدوں کی کہاں جائے
کچھ کم رگِ بسمل سے نہیں تارِ کفن کا

اس[4] واسطے دیتا ہوں اب آئینہ کو بوسہ
وہ شوخ جو دلدادہ[5] ہے عین اپنے دہن کا

طفلی میں دیا ہے سبق استاد نے تجھکو
ناز و نگہ و عربدہ و شوخی و فن کا

ہم زمزمہ ہم تم تھے کبھی ہے یہی پیغام
مرغانِ قفس کے لئے مرغانِ چمن کا

دھویا ہے کس نے منہ کہ یہ ہے رنگ آب کا
لبریز رنگِ گل سے ہے ساغر حباب کا

رہے ہے روکشِ نشتر پر آبلہ دل کا
یہ حوصلہ ہے کوئی بل بے حوصلہ دل کا

---

(۱) قدم رکھا یہاں کس نے کہ الخ (ن نور محمد) (۲) رنگ (ن خ۔ ن نور محمد) (۳) پرتگالی (ن خ)
(۴) کس واسطے۔ (ن خ) کس واسطے دیتا ہے اب الخ (ن نور محمد)۔ (۵) ہو دلدادہ نہیں اتنے دہن کا (ن خ)

سمجھ کے رکھیو قدم رہروانِ وادیٔ عشق
رواں ہی یہاں دمِ خنجر پہ قافلہ دل کا
عبث نہیں ہی یہ وابستہ پریشانی
کسو کی زلف کو پہنچے ہے سلسلہ دل کا

تھا روز کونسا کہ یہاں غم نہیں رہا
پڑھ پڑھ کے دل کا مرثیہ ماتم نہیں رہا
کیوں سکی مسکی چوپہ نئی ہی اور کھرے کھرے بال
گر اختلاط غیر سے باہم نہیں رہا

دورِ فلک میں کس کو نہیں میکشی کا ذوق
رکھتا ہے ماہ ہاتھ میں ساغر بلور کا
ممنون برنگِ حضرتِ سودا جو دیکھئے
ہر سنگ میں شرارہے اُس کے ظہور کا

عین راحت ہی جو کچھ ہم پہ ستم کیجے گا
سر جھکا دیں گے اگر تیغ علم کیجے گا
کس کو پروا کہ ہوا دارِ گل و لالہ رہے
باغِ دل اپنے ہی کو رشکِ ارم کیجے گا
دیکھ کر مجھ کو یہ کہتے ہیں بتانِ خوشخط
ایک دن سر کو ترے تن سے قلم کیجے گا

نہیں ہی جلوہ نما غنچہ شاخ پر گل کا
یہ ہو رہا ہے گرہ شعلہ آہِ بلبل کا

ہم سے کتنے بے دلوں کی کب ہے منزل تک پہنچ
یار گو دل میں ہی پر ہم کو کہاں دل تک پہنچ
کشتیٔ طاقت شکستہ اور بحرِ غم کا جوش
مژدہ نومیدی نہیں اب اپنی ساحل تک پہنچ
دشتِ تنہائی میں صحرا گرد ہی جوں گرد باد
مشتِ خاکِ قیس کی محمل ہی محمل تک پہنچ
صیدگاہِ شوق میں کیا بے ادب وہ صید ہے
جو کہ جاتا ہی تڑپ کر اپنے قاتل تک پہنچ

ہے سایہ فگن زلفِ سیہ فام زمیں پر
یا صبحِ قیامت کی ہی یہ شام زمیں پر

(۲۷) محترم

خواجہ محترم خاں محترم تخلص کہ فقیر از احوالِ ایشاں مطلع نیست۔ از وست[1]۔

اے محترم اتنی اشکباری — کھل جاتا ہے ابر بھی برس کر
کیا رونا ہی یہ ترا کہ جس سے — بدنام ہوا میں اب تو بس کر

پیغام تو جنوں کے آنے لگے ہیں مجھ تک — شاید بہار کے دن نزدیک آن پہنچے

(۲۸) مصدر

میر ماشاء اللہ مصدر تخلص پدرِ میر انشاء اللہ خاں کہ کمالاتِ طبعی ایشاں از غایتِ اشتہار محتاجِ بیان نیستند۔ گاہ گاہے خیالِ شعر ہم می کنند و ہر کہ پیشِ ایشاں کلام خود بخواند در جواب آں بدیہہ گوئی را زیادہ[2] می شوند۔ فقیر اگرچہ ایں بزرگ را ندیدہ اما اوصافِ کمالاتش بیشتر شنیدہ، دو شعر از وسمع رسیدہ۔

خدا کرے کہ مرا مجھ سے مہرباں نہ پھرے — پھرے جہاں تو پھرے پر وہ جانِ جاں نہ پھرے

کافر ہو سوا تیرے کرے چاہ کسی کی — صورت نہ دکھاوے مجھے اللہ کسی کی

(۲۹) مضمون

میاں شرف الدین مضمون از قدما است، دو شعر ایشاں بطریقِ یمن نوشتہ۔

ہمارا اشک قاصد کی طرح یک دم نہیں تھمتا — کسی بے تاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہی

---

(۱) چند اشعارش از نظر گذشتند انچہ انتخاب افتاد نیست (ن خ)، (۲) آمادہ (ن نور محمد)

نہ یہی فتنہ قد و قامت سے ہے　　ہنس کے پھر دیکھنا قیامت ہے

(۳۰) مزمل

شاہ مزمل تخلص از قدما است گویند درویشے بود شعرے از طفولیت یاد دارم۔

دل ہرن میرا مزمل رم گیا　　دشمنوں کے من کے چیتے ہو گئے

(۳۱) معین

بہ شاگردی[1] مرزا محمد رفیع شہرت دارد۔ شاعر کہنہ مشق است فقیر او را ندیدہ یک غزلش مشہور است برائے یادگاری نوشتہ و دو رباعی انیست۔

اے باد صبا باغ میں مت جائیو تڑکے　　شاید کہ وہ سوتا ہووے اور بات نہ کھڑکے

جوں نسیم کی تختی اگر اُس راحتِ جاں کو　　چھاتی سے لگا رکھئے تو دل کا ہے کو دھڑکے

آتے ہی نہیں گر کے سوئے چشم یہ آنسو　　اس گھر سے مگر روٹھ کے نکلے ہیں یہ لڑکے

اے ابر بہاری شبِ ہجراں ہے خبردار　　دامن ترا جھ آہ کے شعلے سے نہ بھڑکے

سر رشتہ رہِ عشق کا ہرگز نہ کروں گم　　سو ٹکڑے اگر بیچ نمط ہوں مرے دھڑ کے

قمری ہے فدا باغ میں شمشاد کی دھج پر　　ہم صدقے ہیں اے سروِ رواں تیری اکڑ کے

قصہ ہی کرو مختصر اب جانے دو یار و　　کیا لینا ہے تم کو مرے قاتل سے جھگڑ کے

ہوں میں وہ دوانا کہ بہار آنے سے آگے　　زنجیر میں رکھتا ہوں معین تجھکو جکڑ کے

رباعی

جب سے تجھ ساتھ دل لگایا ہم نے　　کیا کیا اندوہ و غم اُٹھایا ہم نے
تقصیر نہیں ہے اس میں تیری باللہ　　جیسا کہ کیا تھا ویسا ہی پایا ہم نے

---

(۱) میاں معین معین تخلص (۲) جی۔ (ن خ)

دیگر

دل[1] کے ہاتھوں ہمارا جینا معلوم — خون پیتے ہیں اب تو مے کا پینا معلوم
گر جیب پھٹا ہو تو رفو ہو ناصح — یہ چاک جگر ہے اس کا سینا معلوم

(۳۲) محشر

مرزا علی نقی محشر، بزرگانش اہل خطہ بودہ اند و خودش در لکھنؤ نشوو نما یافتہ بمقتضائے موزونی طبع شعر بہ زبانِ ہندی و فارسی ہر دو میگفت و دعوائے شاعری چناں در دماغش جا گرفتہ بود کہ کسی را بہ خاطر نمی آورد و طرفہ تر اینکہ خود اکثر قدم در راہِ خطا می گذاشت ۔ درایامیکہ از بیم دعوائے خون مرزا علی بہلت از شہر بر آمدہ وارد شاہجہاں آباد گردید روزے بہ مجلسِ مشاعرۂ مؤلف حاضر[2] شدہ و روزی بہ صحبت کیمیا خاصیت خواجہ میر درد نیز رسیدہ و بہ ہمیں جہت خود را بہ شاگردیِ ایشاں متہم میداشت ۔ آخر بعد یک دو سال بہ طرفِ اکبرآباد وغیرہ سیر کردہ ہرگاہ دید کہ فتنہ فرو نشست باز بہ شہر آمدہ و بہ ہوشیاری تمام زندگانی میکرد ۔ وارثانِ مقتول عجالتاً با و آویختن مصلحتِ وقت نمی دانستند چوں ایں ماجرا از خاطرش[3] گردید و چند سال بریں بگذشت در سنہ یکہزار و دو صد و ہشت در عشرۂ ماہ محرم قابوئے وقت یافتہ او را بہ بیکسی کشتند و قصاصِ خونِ بہلت بہ بہلت گرفتند عمرش تخمیناً قریب سی رسیدہ باشد ۔ ازوست ۔

جان منتظر ہے آنکھوں میں وقت رحیل ہے — جلدی پہنچ کہ تیرے ہی آنے کی ڈھیل ہے

دوزمیں اُس چشم کے گردوں کو آسایش نہیں — کس گھڑی کس دم نئے فتنہ کی زایش نہیں
گفتگو اردو زباں کی کوئی ہم سی سیکھ جائے — کیا ہوا دلی میں محشر اپنی پیدایش نہیں

---

(۱) دوسرا مصرع پہلے ہے اور پہلا بعد میں ۔ ان نخ (۲) شدہ بود ۔ ان نخ (۳) از خاطرش نسیاً منسیاً گردید ۔ ان نخ

(۳۳) معروف

آلہی بخش معروف تخلص پسرِ عارف خاں جوانِ خوش اختلاط و وجیہ است در ایامیکہ فقیر تذکرہ با تمام رسانیدہ از شاہجہان آباد بہ لکھنؤ گذر افگندہ بہ شاگردی میاں نصیر نازش دارد و فکر شعر نیز بروئیہ ایشاں کہ تلاش است میکند در یک دو مشاعرہ حالِ صاحب عالم شریکِ غزلِ طرحی نیز بود بعد یک دو ماہ باز بہ شہر عود کرد مطلع ازو بیاد ماندہ۔

کیا چٹھی اُس کی تمامی کی وہ آگیا ہاتھ سے ہاتھ ملتا ہوں گئی سونے کی چڑیا ہاتھ سے

(۳۴) مروت

صغیر علی مروت تخلص کہ بہ پسرِ مصری شہرت دارد ولدِ کبیر علی عرف حکیم کبیر سنبھلی شیخ انصاری کہ ذکرش گزشت جوانِ قابل و دانا است تحصیلِ کتبِ طب وغیرہ از والدِ خود در رامپور کردہ بتقضائے موزونیِ طبع چوں شوقِ شعر دامنِ دلش را بسوئے خود کشید او را بہ صحبتِ نجو خاں پسرِ مستقیم خاں کہ جوانِ شاعر دوست گزشتہ سپرد و ادینِ اساتذہ سلف و حال خاطر خواہ میسر آمد ناگاہ گاہے کہ فکرِ شعر می کند دراں تلاشِ معنی ہائے تازہ منظور می دارد اکثر غزلش قصیدہ طور است و یک دو قصیدہ کہ گفتہ خیال بندی را درو بطورِ سلیم وسعت دادہ۔ دریں کار روئیہ مرزا رفیع پیش نہادِ خاطرِ اوست۔ درہماں ایام کہ بہ رامپور بود یک دو داستان بروئیہ مثنوی میر حسن در سلکِ نظم کشیدہ با خود داشت میخواست کہ آنہا را بنظر موصی الیہ بگذراند چوں درہماں ایام میر موصوف را سفرِ ناگزیر در پیش آمدہ بیار تاسف خوردہ و رفتہ رفتہ ہماں چند قطرہ اش دریا گردیدند یعنی در عرصہ پنج شش[1] سال کہ از سفرِ بنارس در شہر باز آمد جوابِ[2] مثنوی بہ معنی ہائے تازہ مہیا گردانیدہ بعد اتمام قصہ بہ عرصہ

(۱) سال روزہائے کہ از سفر۔ (ن خ) (۲) مثنوی میر صاحب (ن خ)

قلیل بہ ہمسایگی فقیر اور انو پسانیدہ وصاف نمودہ در معرضِ شہرت افگندہ اکثر دوستان نقل گرفتند تازش شاعری او بریں مثنوی است۔"(۱) در آغازِ شباب اول چندے بہ ترغیب میر حسن فکرِ شعر کردہ واز نظر ایشاں گزرانیدہ وبعد ازاں در روزہائے کہ در رستم نگر اقامت داشت بہ سبب قرب وجوار بہ میاں قلندر بخش جراٗت رجوع آوردہ۔ اقرارِ شاگردیش بہ یک کس نیست لہذا می گوید کہ ؎ زہر خرمنے خوشۂ یافتم ۔ تمتع زہر گوشۂ یافتم۔ بہ سبب(۲) ہمسایگی اتفاقِ ملاقات می شود۔ از وست۔

کیوں تو نے وا کیا تھا بندِ قبا چمن میں
اُڑتی پھرے ہے گل سے بلبل خفا چمن میں

ہر سمت اب صبا جو پھرتی ہے خاک اُڑاتی
بلبل کے پر پڑے ہیں کیا جا بجا چمن میں

نرگس کی آنکھ تجھ پر پڑتی ہے بے طرح سی
مت وقتِ شام جانا بہر خدا چمن میں

جوں لالہ داغِ دل یہاں پھر جل اٹھا ہو شاید
جاتا ہے سیر کرنے وہ بے وفا چمن میں

جیب اپنا گل نے پھاڑا بلبل موی ہرؔدت
کیوں اپنے غم کا قصہ تو نے کہا چمن میں

چھٹتا نہیں ہے دستِ مصوّر سے وہ ورق
کھینچی ہے اُس نے جس پہ مرے یار کی شبیہ

ناخن زنی میں دل کے ورق پر رہی ہے آہ
کس کس طرح اُس ابروئے خمدار کی شبیہ

کیا صدف ہوں میں رکھوں جو ہر گھڑی گوہر بدست
جوہرِ شمشیر ہوں رہتا ہوں نت خنجر بدست

اپنی صیادی پہ وہ صیاد کیا نازاں ہے واہ
آگیا ہے ایک جو مجھ سا طائر بے پر بدست

خار صحرا نے قدم چومے جو ہیں مجنوں چلا
لی مہارِ ناقۂ لیلےٰ بچشم تر بدست

عشق کا قصہ مروتؔ سے سنو لے بلبلو
مثلِ گل اس بات کا رکھتا ہے وہ دفتر بدست

---

(۱) مثنوی است ماسوائے آں رغزل وقصیدہ وغیرہ چنداں معاشرت ندارد و در آغاز (ن خ)

(۲) چوں خانہ اش قرب وجوار مکان فقیر است اکثر ملاقات می افتد۔ (ن خ)

غیروں پہ دیکھ دیکھ کرم اُس نگار کا — چیں بر جبیں ہے نقش ہمارے مزار کا
گوشش گرد و باد ہے گردش نصیب میں — پر ہے دماغ عرش پہ مجھ خاکسار کا
مجنوں کی خاک بن کے بگولا چلی ہے ساتھ — محتاج کیوں ہو ناقۂ لیلیٰ مہار کا
بن گرد و باد یار کے صدقے ہو اس لئے — ہے رابطہ ہوا سے ہمارے غبار کا

ہے حسن کی اک موج شبِ ماہ میں دُر ریز — قطرے وہ عرق کے نہیں اس چینِ جبیں پر

نہ چمن ہے نہ گل ہے نہ بو ہے — جلوہ گر یہاں تو ہر طرف تو ہے
دیکھنا ہنس کے اُس کا آنکھ ملا — کیا کہوں سحر ہے کہ جادو ہے

حسنِ چشم آہ یہ کس گل کا مجھے بھاتا ہے — خواب میں تختۂ نرگس ہی نظر آتا ہے
تختۂ لختِ جگر اشک مرا اے ہمدم — دمبدم گوشۂ دامن کو لئے جاتا ہے
ہر رو پر ترے گیسوئے سیہ کے نیچے ق — خالِ مشکیں یہ مجھے اس شکل نظر آتا ہے
جس طرح وقتِ سحر موسمِ سرما میں غزال — شاخِ سنبل کے تلے دھوپ کھڑا کھاتا ہے

(۳۵) مصحفی

مخفی نماند کہ مؤلفِ تذکرہ غلام ہمدانی نام دارد و مصحفی تخلص مے گذارد و بزرگانش[1] نوکریِ خانۂ بادشاہ کردہ اند ازانیکہ تفرقۂ شدیدی در سلطنت راہ یافتہ سلطنت خانۂ ایں روسیاہ ہم خاک برابر شد ہمہ از تمتعِ دنیا بہرہ دانی داشتند۔ ایں فقیر چوں بخت و طالع آنہا[2] نداشت ناچار از آغازِ شباب بمقتضائے موزونیِ طبع مصروفِ تحصیلِ علم بود چنانچہ

---

(۱) بزرگانش ابا من جد نوکری۔ (ن خ) (۲) بہ خاک سیاہ برابر شدہ۔ (ن خ)

بہ فیضِ صحبتِ بزرگان اول از تکمیلِ نظم و نثرِ زبانِ فارسی و تحقیقِ محاورہ و اصطلاحِ آں فراغت حاصل کردہ بہ مقتضائے رواجِ زمانہ آخر کار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے اینکہ رواجِ شعرِ فارسی در ہندوستان بہ نسبتِ ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زماننا بپایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ[1] دوازدہ سال در شاہجہان آباد بہ دورِ نواب نجف خاں مرحوم بگوشۂ عزلت گزیدہ۔ زبان ریختہ اردوئے معلیٰ کماہی دریافت نمودہ و ہرگز برائے تلاشِ معاش دراں حشرِ اجبادِ اموراتِ بر در کس نہ رفتہ اگرچہ بہ نسبت فارسی گوئی در یارانِ مسلّم الثبوت فارسی گو ہم شمردہ می شود اما نام برآوردہ بہ ریختہ است و آنچہ دریں مدت تصنیف و تالیف کردہ انیست کہ دو دیوانِ فارسی[2] یکے در جوابِ مولانا نظیری نیشاپوری و یکے بطورِ خود و سہ دیوانِ ہندی و دو تذکرۂ فارسی و ہندی و یک دو جزو شاہنامہ تا نسب نامۂ حضرت شاہ عالم بہادر و یک دیوان ہندی کہ در شاہجہاں آباد گفتہ معہ مسودۂ دیوانِ فارسیِ اول کہ زبانِ آں بطورِ جلال اسیر و ناصر علی بود بہ دزدی رفتہ میخواست کہ کلام خود را آخرِ ہمہ صاحبان نویسد اما حرف میم برآں آورد کہ بہ ردیف میم داخل باشد لہٰذا[3] المؤلفہ۔

اشعار از دیوان اول

لگائے ہاتھ کوئی اُس بدن کو کیا گستاخ
نہ جس بدن کو لگی ہو کبھی ہوا گستاخ

میں چھیڑتا ہوں جو اُس کو کہے ہے کٹ کے رقیب
قدیم سے ہے تمہارا یہ آشنا گستاخ

سنا ہے مصحفی میں جب سے شعر عرفی کا
ہمیشہ ہاتھ گریباں سے ہے مرا گستاخ

بہ ساعتے کہ کشائی قبا بہ یاد آور
کہ می کشاد کسے بند ایں قبا گستاخ

کرینگے خواب راحت یا یہی جنجال ہو دیگا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووےگا

---

(۱) رسیدہ بلکہ از و بہتر گردیدہ، چنداں مصروف فارسی نماندہ است۔ (ن خ)۔ (ن) نسخہ رمیں بعد فارسی "زبان فصیح" کے الفاظ زائد ہیں (ن خ)، لہٰذا مزخرافات خود را نیز داخل ایں جریدہ کردہ شد تا برصفحۂ روزگار یادگار بماند (ن خ)

یہ خیال اک دن اسی صورت فزوں ہو جائیگا　　رفتہ رفتہ مجھکو سوجھے ہے جنوں ہو جائیگا
ان حنائی ہاتھوں کو پردے میں رکھ بہر خدا　　مفت میں ظالم کسی کا ورنہ خوں ہو جائیگا
تابش خورشید میں تو گھر سے باہر مت نکل　　پھول سا رخسارہ تیرا لالہ گوں ہو جائیگا
گو کہ اب پاتے نہیں ہم اُس کا کوچہ مصحفی　　شوق اگر یہ ہے تو اک دن رہنموں ہو جائیگا

صورت کو تیری دیکھ کے مانی نے رو دیا　　یہاں تک کہ خوں میں اپنا مرقع ڈبو دیا
ہرگز رہے نہ ہم تو کسی کام کے دریغ　　سب کام سے ہمیں تری الفت نے کھو دیا

کل میں جو راہ میں اُسے پہچان رہ گیا　　کچھ وہ بھی مجھکو دیکھ کے حیران رہ گیا
سمجھے وہ صید خستہ مرے اضطراب کو　　سینہ میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا
شوخی تو دیکھ تیر کو سینہ سے کھینچ کر　　کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا
مارے خوشی کے کود پڑا میں تو مصحفی　　شب پاس میرے اُس کا دوالیان رہ گیا

نظر آتے ہیں پردے تیری آنکھوں کے گلابی سے　　کہیں سے پی ہے تو نے یا اٹھا ہے نیم خوابی سے
ہوا میں ہے وہ کیفیت کہ نخل اس باغ کے سارے　　گلے میں باہیں ڈالے ہیں کھڑے باہم شرابی سے
نزاکت کو نظر کیجو کہ کل اُس نے شب مہ میں　　چھپایا چاند سے مکھڑے کو اپنی آفتابی سے
جو میرا دل نہیں جلتا تو پیارے میرے پہلو سے　　اُٹھا لیتا ہے تو کیوں ہاتھ کو رکھ کر شتابی سے
مکان مصحفی اس کو نہ سمجھو آپ کا گھر ہے　　تکلف کچھ نہیں کل بیٹھئے یہاں بے حجابی سے

قدغن ہے کہ در تک کوئی یہاں آنے نہ پاوے　　اور بے خبر آوے بھی تو پھر جانے نہ پاوے
وہاں روزن دیوار بھی اب بند ہوئے ہیں　　تا سینہ کے روزن کوئی دکھلانے نہ پاوے

یوں صاحبِ بستاں کا ہو اب حکم کہ صیاد — اس باغ میں بلبل کا قفس لانے نہ پاوے
کیا خاک کرے سحر ترے نقشِ قدم کے — جو خاک بھی اُس کوچہ سے لیجانے نہ پاوے
تو آگے ہی جا بیٹھ دلا بزم میں اُس کی — تا آکے کوئی پھر اُسے سکھلانے نہ پاوے
تو شوق سے لچکا قد جوں شاخِ گل اپنا — پر موئے کمر دیکھیو بل کھانے نہ پاوے
کعبہ میں تو ہم کو نہ ملا مصحفی یارو — بھیجو کوئی قاصد اُسے بتخانے نہ پاوے

شب کہ دل درد و الم سے سر بسر لبریز تھا — شورِ محشر کی طرح ہر نالہ شور انگیز تھا
ان اداؤں کا کوئی مارا جئے کس طرح ہائے — یا ہو اب یہ گرم جوشی یا کہ وہ پرہیز تھا
نو بہاراں میں تو کرتے ہم بھی دعوئے جنوں — مثلِ گل چاکِ گریباں ہم سے دست آویز تھا
کی ٹک اک آبِ دمِ شمشیر قاتل نے کمی — ورنہ پیمانہ ہماری عمر کا لبریز تھا

دیوان دویم

ترا خدنگِ نگہ جس کے دل کے پار ہوا — نشانِ تیرِ تغافل وہ دل فگار ہوا
قفس سے چھوڑ دے تو اب تو ہم کو اے صیاد — چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ بہار ہوا
صبا جو پوچھے خبر مصحفی کی تجھ سے وہ شوخ — تو کہیو ہنس کے میں صدقے ترے نثار ہوا

مرضِ عشق سے گر اب کے سنبھل جاؤں گا — تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا
مجھکو قاصد کے تغافل نے تو مارا ہی ہر — روز ظالم یہی کہتا ہے کہ کل جاؤں گا

صانع نے جو خمِ ابروئے دلدار میں رکھا — سالک نے بھلا کون سی تلوار میں رکھا
قاصد نے دیا نامہ مرا اس کو تو اُس نے — کر چاک وہیں رخنۂ دیوار میں رکھا

اُس نے جس وقت کہ خال اپنے زنخداں پہ رکھا
داغ اک اور مرے سینۂ سوزاں پہ رکھا
آگیا یار کا دامن جو مرے ہاتھ کبھو
میں نے رومال سمجھ دیدۂ گریاں پہ رکھا

شب ترے کوچہ میں کوئی کہتے ہیں مرکر رہ گیا
تو نہ آیا اور وہ مسکین آہ بھر کر رہ گیا

پردا اٹھا کے اُس نے جو سینہ دکھا دیا
میں چاک کرکے اپنا گریبان اوڑا دیا

قصد کرتا ہوں جو اُس در سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے تو جا میں تو نہیں جانے کا

ٹھکانا اک جگہ ہوتا نہیں اُس غم کے مارے کا
یہ گردش طالعوں کی پھیری ہے گویا ستارے کا
خدا جانے پڑی ہے آنکھ وہاں کس بے محابا کی
کئی دن سے جو روزن بند ہے اُسکے نظارے کا

داغ دیکھے تھا کھڑے لالۂ صحرائی کا
زرد عالم نظر آیا تری سودائی کا
بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

کبھی اُس تازہ گل بن ہم جو رخت اپنا بدلتے ہیں
ملیں ہیں عطر کو لیکن کف افسوس ملتے ہیں
کوئی ان کافروں کے ہاتھ سے کیونکر نکل جاوے
نئی ترکیب ہے روز اور نئے نقشے نکلتے ہیں
جو خط بھیجوں تو خط کو آگ پر رکھدے ہے وہ ظالم
جو قاصد جائے تو قاصد کو واں تیغ نکلتے ہیں
کہاں ہے وزروں تو میں یہ ڈھنگ دیکھا اُس کے کوچہ میں
کبوتر تکتے ہوتے جاتے ہیں مکتوب جلتے ہیں
باتوں میں اب ہنس ہنس نت زہر گھولتے ہیں
ہم سے ہی بے حیا ہیں جو تم سے بولتے ہیں

کیا غم ہے گر سحر وہ گئی چشم تر سے
شبنم نے گل کے ساتھ تو شب عیش کر لئے

گو کہ محلِ ہمدمی چرخ جفا طراز ہے
ہم کو تو اب تلک وہی بندگی و نیاز ہے

سمجھے تھے ہم کہ جائے گی جیسا گیا ہے روزِ وصل
کب ہمیں اس کی تھی خبر ہجر کی شب دراز ہے

دامن اٹھا کے چلتے ہو مرے مزار سے عبث
خاک میں میں تو مل گیا کس سے اب احتراز ہے

ہم کو ترساتے ہو تم کیوں یہ ادا دکھلا کر
منہ چھپایا نہ کرو بہرِ خدا دکھلا کر

شرط یاری یہی ہوتی ہے کہ بس پھر گئے اب
چار دن مہر و محبت کا مزا دکھلا کر

حسن کہتا ہے اسے پردہ اٹھا دے پر شرم
یہ سکھاتی ہے کہ لے منہ کو چھپا دکھلا کر

دل کو ہاتھ اس کے جو بیچوں ہوں تو کہتے ہیں رقیب
لیجیو تم اسے بازار ذرا دکھلا کر

پھر قیامت ہے جو وہ شوخ چھپا لے منہ کو
اپنا دیدار ہمیں روزِ جزا دکھلا کر

ان کے ہاتھوں سے بھلا کیونکے کوئی بچ نکلے
لیویں جو دل کو لبھا رنگِ حنا دکھلا کر

لالہ سر کھینچے ہے خاکِ شہدا سے اب تک
تم چلے آئے تھے اک دن کفِ پا دکھلا کر

تیرے بیمار کو دے کر کے پشیمان ہوئے
لائے تھے وہ جو مسیحا سے دوا دکھلا کر

خواہ دیوانہ کہے خواہ وہ وحشی مجھ کو
مصحفی میں اسے حال اپنا چلا دکھلا کر

از دیوان سویم

کیا دید میں عالم کی کروں جلوہ گری کا
یہاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا

مُردوں کو جلاتی ہے ترے پاؤں کی ٹھوکر
اس چال پہ مرتا ہے بجا کبکِ دری کا

جو دیکھے ہے نقشہ کو ترے وہ یہ کہے ہے
سارا بدن انسان کا چہرہ ہے پری کا

ٹھہرا نہ سن کے صدا میری ایک بار رہا
میں رہروانِ عدم کو بہت پکار رہا

قفس سے چھوٹے ہے اب مجھکو کیا تو اے صیاد
چمن کے بیچ کہاں موسم بہار رہا

خیالِ یار جو شب میرا ہمکنار رہا
تمام شب میں اُسی کے گلے کا ہار رہا

میں تیرے ڈر سے نہ دیکھا اُدھر بہت شبِ وصل
ستارۂ سحری مجھ کو آنکھ مار رہا

چھپ چھپ کے وہ گھر غیر کے مہمان گیا تھا
چوری کی نظر میں وہیں پہچان گیا تھا

جانے کا نہ لے نام شبِ عید ہی پیارے
سن بات مری میں ترے قربان گیا تھا

کب میں یاروں کے تئیں دیکھ پکارا نہ کیا
پر کسو نے مری تربت پہ گذارا نہ کیا

بیٹھنا پاس تمھیں غیر کے کیا لازم تھا
تم نے اتنا بھی میاں پاس ہمارا نہ کیا

میں ہوں وہ کشتۂ ناچیز گلی میں اُس کی
جس کا خورشید نے روزن سی نظارا نہ کیا

بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگارین کفِ پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینہ کی یہ بوندیں
جوں لالۂ تر حسن ترا اور بھی چمکا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے تیری
کمبخت پہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

سو گیا تھا شام وہ رکھ کر جبیں پر پشتِ دست
دیکھ اُسے خورشید نے ماری زمیں پر پشتِ دست

سانپ سی بھوں کے زہ جو رات لہرانے لگے
کیا جھجک کر اُس نے ماری آستیں پر پشتِ دست

بیٹھے ہی جو کوئی اس بت پرفن کے برابر
اُس دوست کو ہم سمجھے ہیں دشمن کے برابر

انداز تو بسمل کا سمجھا سینے وہ کیسا
رہ جائے ہی آ کر ترے دامن کے برابر

کیا جانئے اُس تیغ کو کیا سوجھی ہی اس دم
پھر جائے ہے آ کے جو گردن کے برابر

جب اُس نے ہاتھ دھوئے خونِ عاشق سے ذرا مل کر ‏ کیا اُس رنگ اصلی کو غلط رنگِ حنا مل کر
کفک کا کس کی تقشا یاد آیا اس کو گلشن سے ‏ چلی پاؤں تلے پھولوں کو کیوں بادِ صبا مل کر
کچھ ایسی ہو گئی حالت مری شب جس سے غش آیا ‏ بدن سے آئے تھے یوں تو وہ(۱) منہ بار ہا مل کر

مہندی ہے کہ قہر ہے خدا کا ‏ ہوتا ہے یہ رنگ کب حنا کا
مَل آئے ہو ہاتھوں سے تم اپنے ‏ یا خون کسی تازہ آشنا کا
خط لے کے بڑا یہ کب گیا(۲) میں ‏ ول دیکھوں ہوں قاصد صبا کا
تلوار کو کھینچ ہنس پڑے واہ ‏ ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

کاغذ کا ورق یہ پائے صورت ‏ نقاش ایسی بنائے صورت
چہرہ پہ نظر نہیں ٹھہرتی ‏ اللہ رے تری صفائے صورت

حرف النون

---

(۱) نثار

میر عبدالرسول نثار تخلص مردیست جہاندیدہ و فہمیدہ اصلش از اکبرآباد است فقیر اورا در ابتدائے شاعری در قصبۂ امروہہ دیدہ بود اکثر بعد ہفتہ و عشرہ ملاقات می شد و در تذکرۂ شعر بیان می آمد۔ از معاصران میر و مرزا شاعر سحر کار و با فصاحت و بلاغت دیدمش۔ عمرش تخمیناً قریب شصت خواہد بود حالا معلوم نیست کہ زندہ است یا مردہ این چند شعر(۳) از وست۔

---

(۱) دو (ن خ) (۲) کیا (ن خ) (۳) بیاد ماندہ از دست (ن خ)

ماہ رو کی جو مہربانی ہے ۔۔۔ یہ مدد ہم پہ آسانی ہے
اُس کا رخسار دیکھ جیتا ہوں ۔۔۔ عارضی میری زندگانی ہے

ایں شعر دویم در تذکرۂ میر حسن صاحب بنام محمد شاکر ناجی مسطور است و من از زبان او شنیدہ بودم، واللہ اعلم بالصواب۔

اُس کے تئیں ہماری نہ کچھ یاد ہی رہی ۔۔۔ اور اپنے تئیں نہ طاقتِ فریاد ہی رہی
اُس بلبلِ اسیر کو کیا گل سے راہ و رسم ۔۔۔ جو زیرِ دامِ منتِ صیاد ہی رہی
جوں گرد و باد ساکن یک جا نہ ہو سکی ۔۔۔ اپنی یہ ہرزہ زندگی برباد ہی رہی
دنیا کو جاتے عیش سن آئے تھے لے نثار ۔۔۔ سو اپنے جیتے تک تو غم آباد ہی رہی

ہاتھ سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاوینگے ہم ۔۔۔ یہ گریباں دامنِ صحرا کو دکھلاویں گے ہم

مر ہی جاویں گے بہت ہجر میں ناشاد رہے ۔۔۔ بھول تو گئے ہو ہمیں پر یہ تمھیں یاد رہے

(۲) نثار

محمد امان نثار تخلص قوم شیخ بزرگانش معمار بودہ اند بلکہ کسے کہ طرح جامعۂ دہلی انداختہ یکے از اجداد اوست۔ علم ریاضی را بہ خاندانِ ایشاں نسبت تمام است۔ مشارٌ الیہ پیش ازیں در دہلی بہ سرکارِ نواب مجد[1] الدولہ بہ سرانجامِ عمارت عز و امتیاز داشت۔ بعد دستگیر شدنِ نواب موصوف بہ سرکارِ نواب ضابطہ خاں دخیل شدہ اکنوں کہ از چند سال بہ پورب رسیدہ بہ سرکارِ راجہ ٹکیت رائے بہ پیشہ خود عزتِ تمام دارد۔ چوں اصلش معمار است لہٰذا بنائے ریختہ ہم بخوبی نہادہ او اسپ زبانِ اردو چنانچہ باید از زبانِ ندرت بیانش می شود از

---

(۱) مجد الدولہ ۔ (ن ح ۔ ن نور محمد)

ابتدا در شعر شاگرد شاہ حاتم است۔ دیوانِ ضخیمے ترتیب دادہ قدرتِ پرگوئی بسیار دارد و اکثر در مشاعرہ ہائے دہلی ہم طرح یاران بود[1]۔ از وست۔

خنجر نہ کمر میں نہ وہ تلوار رکھے ہے
نظروں ہی میں جا ہے جسے مار رکھے ہے
دستارِ گلابی پہ نہیں طرۂ زرتار
خورشید شفق میں وہ نمودار رکھے ہے

خوبی میں ترے حسن کی کچھ حرف تو کب ہے
لیکن یہ ذرا خط ہے کہ اصلاح طلب ہے

اس رشک سے ہم کیونکہ نہ سر سنگ سے ماریں
آئینہ ترے حسن کی لوٹے ہے بہاریں

کیا جامۂ پھلکاری اس گل کی پھبن کا تھا
جو تختۂ دامن تھا تختۂ چمن کا تھا
ہم آگو ہی سمجھے تھے تم گھر کو سدھارو گے
جوں صبح گجر باجا تھا وہیں ٹھنکا تھا
مینا میں نہو جلوہ وہ بادۂ گلگوں کا
جامہ میں جو کچھ یار و رنگ اس کے بدن کا تھا
نرگس کو کیا ایسا بیمار ان آنکھوں نے
ڈھلکا ہی نظر آیا گردن کا جو منکا تھا

شیخی تو آفتاب کی ذرہ گھٹائیے
برقع اٹھا کے یار کا مکھڑا دکھائیے
دیکھا نہیں شگفتہ کبھی غنچۂ دہن
پیارے خدا کے واسطے ٹک مسکرائیے

ہم سے ہو زر و سیم کی تدبیر سو کیا خاک
دنیا میں بڑی چیز ہے اکسیر سو کیا خاک
ہو جائے دل اک آن میں مٹی شنوا کا
ہم خاک نشینوں کی ہے تقریر سو کیا خاک

---

(۱) با فقیر از قدیم الایام آشنا است۔ از دست ن خ۔

منعم[۱] نہ کر اس عمارت کی بزرگی
اک خاک سے تعمیر ہی تعمیر سو کیا خاک

نامہ کو مرے پڑھ کے پٹک دے ہو زمیں پر
دیکھی رقمِ شوق کی تاثیر سو کیا خاک

گردا ہو تری شکل کا شیشے ہو مرے گرد
اب اور میں کھینچوں تری تصویر سو کیا خاک

مجھ سوختہ کے تن میں نہیں بوند لہو کی
جا لے گا مری جان ترا تیر سو کیا خاک

جاتی ہو اُڑی گرد نثار اُس کی گلی کو
کی عشق نے اس شوخ کی تسخیر سو کیا خاک

تم تو اک دم ٹھہر کر مجلس میں گھر آتے رہے
گھر ہزاروں بیٹھ گئے لاکھوں کے جی جاتے رہے

میری اُس کی گرم صحبت ایک دم ہونے نہ دی
روز میرے شعلہ خو کو غیر بھڑکاتے رہے

خواہشِ دل تھی جو کچھ وہ بات بن آئی نہ یار
آہ کیا کیا سوچتے ہم دل میں ٹھہراتے رہے

آئینہ نے دی جو تم کو خط کے آنے سے خبر
اپنی زلفوں کی طرح کیا دل میں بل کھاتے رہے

بے تکلف ہو نہ بیٹھے سامنے آنکھیں نہ کیں
وصل کے دن بھی نثار اپنے سے شرماتے رہے

خط کے آنے سے نہ کچھ چل سکی تدبیر اپنی
بوسہ بازی کی لگی خالصے جاگیر اپنی

کر دیا دل کو خدا نے جو بتاں کے بس میں
کیا دکھا دے گی ہمیں دیکھئے تقدیر اپنی

اپنے گھر میں نہیں یہ خستہ دیوار نثار
اپنی غفلت پہ ہنسا کرتی ہے تعمیر اپنی

شب کو وہ کوٹھے ہی کو ٹھے گھر ہمارے آ رہا
غیر دروازہ پہ بیٹھا راہ ہی تکتا رہا

گردش کا اس نگاہ کی اب طور اور ہے
اے ساکنانِ میکدہ یہ دور اور ہے

صورت موافقت کی کوئی سوجھتی نہیں
صاحب کی وضع اور مرا طور اور ہے

---

(۱) ن خ میں یہ شعر فاصل ہے اور مصرعہ اول میں شاید لفظ "اپنی" چھوٹ گیا ہے مصرعہ دوم میں "تعمیر ہے" ہوگا

بندہ ہوں جاں نثار ہوں میں اُس کا اے نثار　　　آخر جو میں ہوں اور نہیں اور او ر ہے

(۳) ناجی

کہ محمد شاکر[1] دارد اصلش شاہجہاں آباد مرد سپاہی پیشہ از شعرائے ایہام گوئے عہد محمد شاہی است معاصر میاں آبرو۔ دیوانِ او ہنوز در دہلی بر صفحۂ روزگار یادگار است و اشعارِ شیریں پسندیدہ بطورِ خود بسیار آبدار۔ از وست۔

کفن ہی سبز ترے گیسوؤں کے ماروں کا　　　مکان غم ہے ترے در کے بیقراروں کا

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بھلا　　　چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

دیکھ کر رنگِ حنا تیرے کفِ خونریز پر　　　آگ لگ لالہ کا دل غیرت سی بریاں ہو گیا

منکر نہ ہو کہ رات رہا نہیں رقیب پاس　　　رہنے کی ہر دلیل یہ جامہ ہوا
موزوں قد اس کا چشم کے میزاں میں جب تلا　　　طوبیٰ تب اُس سے یک قدِ آدم گھٹا ہوا

مجھکو باتوں میں لگا معلوم نہیں کیا کہہ گیا　　　لے چلا جب دل کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا
ڈوب گئے کئی ملک جب کھولی لبِ دریا پہ زلف　　　حیف ناجی کو نہ پوچھا کس لہر میں رہ گیا

(۴) نظام

نواب عماد الملک نظام تخلص کہ بیشتر تخلص ایشاں آصف بود از ابتدائے عمر بشعر

---

(۱) ناجی کہ محمد شاکر نام دارد۔ (ن خ)

پرستی و موزونیِ طبع اشتہار دارند۔ کمالاتِ بسیار در ذاتِ بابرکاتش جمع آمدہ ہمتش ہمیشہ متوجہ مقاصدِ عمدہ می باشد چنداں مصروف و مالوف بہ ریختہ گوئی نیست مگر چیزے کہ در زمانِ سابق گفتہ شہرت یافتہ۔ احوالش در تذکرۂ فارسی نیز نوشتم۔ از وست۔

نا رونقِ گلشن ہیں نہ زینت کسو سر کے
مثلِ گلِ بازی نہ ادھر کے نہ اودھر کے

دل تڑپے ہے اور دیدہ تکے راہ کسو کی
یارب نہ کسو دل کو لگے چاہ کسو کی

آیا نہ کبھو خواب میں بھی وصل میسر
کیا جانئے کس وقت مری آنکھ لگی تھی

پونچھیں نہ کبھو اشک یہ مغرور کسو کے
رِسجاویں اگر چشم میں ناسور کسو کے
پھڑکاتی ہو کیا دخترِ رز شیشہ میں آنکھیں
تجھ نہ ہوئی پردہ میں مستور کسو کے

(۵) نعیم

کہ نعیم اللہ خاں نام داشت جوانے بود از شاگردانِ قدیم شاہ حاتم۔ دیوانِ ضخیم ترتیب دادہ پرگوئیش مشہور و کلامش از رطب و یابس معمور۔ فقیر او را در آنولہ دیدہ بود کہ بعد چندے در سرکارِ نواب محمد یار خاں نوکر شد چوں ملازمتِ نواب مؤلف ہم در آں نزدیکی کرد و قصیدۂ مدح بہ گوشِ حضارِ مجلس رسانیدہ داخلِ صحبت کیمیا خاصیت شد لہذا اکثر اتفاقِ ملاقات می افتاد۔ ہرگاہ بعدِ شکستِ ضابطہ خاں بر سکرتال از مرہٹہ ہا و حضرتِ ظلِ سبحانی سلسلۂ صحبتِ یاران گسیخت و تفرقۂ شدیدی در آبادی کیتھر(۱) رو آورد ہم در آں ایام چوں اکثر بیمار می ماند بمرضِ استسقا در موضعِ عطر چھندی(۲) رفتہ بود کہ در گذشت۔ از وست۔

---

(۱) کیتھر۔ (ن خ) (۲) عطر چھندی دیجنسہ (ن خ)

آفت کی نشانی ہی رہے ہم تو زمیں پر — جو سنگِ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر

گر تجھے منظور تھا غیروں سے ہونا آشنا — پھر عبث تو کیوں ہوا ظالم ہمارا آشنا
تیری خاطر کے لئے سنا ہو ملے بیگانہ وضع — سب مرے دشمن ہیں کیا بیگانہ و کیا آشنا

کوچۂ یار سے دل ہم سے اُٹھایا نہ گیا — مل گیا خاک میں اس طرح کہ پایا نہ گیا

شتابی عبث تو نے کی جانِ مضطر — ابھی تو ہمیں آرزو تھی کسو کی

(۶) ندیم

مرزا علی قلی ندیم اصلش شاہجہاں آباد است در مرثیہ وسلام توغل بسیار کردہ چنانچہ کلامش ازیں قسم شہرت(۱) دارد۔ آخر آخر سخافتِ کلامِ دیگر مرثیہ گویان دیدہ وطرزِ ایشاں را مطلقاً نہ پسندیدہ عنانِ رخشِ ہمتِ خود را بہ طرفِ ریختہ گوئی معطوف ساختہ کہ کرفغان کہ ذکرش گزشت اقرار بہ شاگردئی او دارد۔ ازیں جہت است کہ بعض مرثیۂ مشارٌ الیہ ہم بسیار دلچسپ بہ سمع رسیدہ۔ بالفعل یک شعرش کہ در برجستگی(۲) مضمون نظیر ندارد بہم رسیدہ اینست(۳)۔

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جیتے(۴) ہیں — بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

(۷) نالان

میاں عسکری نالاں تخلص، قوم مغل اول کسے کہ در شاہجہاں آباد بہ حلقۂ شاگردئی فقیر درآمد اینست۔ میر حسن صاحب او را در تذکرۂ خود شاگردِ شاہ حاتم نوشتہ اند محض غلط اکثر

---

(۱) شہرت تام دارد۔ (ن خ) (۲) برجستگی۔ (ن خ) (۳) از دست (ن خ) (۴) جلتے ہیں (ن خ)

شریک مشاعرہائے ولی بودہ بافقیر اعتقاد و نیاز مندی کلی داشت۔ از مدتِ بسیار مفقود الحال است۔ از وست۔

بازوں پہ جب کھتا ہو گل اک اس طرف اک اس طرف شمس و قمر رہتے ہیں گل اک اس طرف اک اس طرف

(۸) نصیر

میاں نصیر نصیر تخلص پیرزادہ از اولادِ میر حیدر جہان صاحب جوانِ خوشگو است فقیر در ایامیکہ در شاہجہان آباد بود اکثر در مشاعرہ می آمد۔ در آں عالم نو مشق و در طبعش روانی و تیزی دریافت میشود حالا گویند کہ قوتِ شاعری بسیار پیدا کردہ شعرے از و بسمع رسیدہ این ست[۱]۔

بپائی چادر مہتاب شب میکش نے چھوں پر کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

خوف زلف یار جھٹ ماہی کس کا رات نے (۲) کہکشاں سے لیا دانتوں میں تنکا رات نے

تیرے آنے کی خبر جو گلِ شاداب اڑی (۳) بیضۂ غنچہ سے اک بلبلِ بیتاب اڑی

شید یزِ ناز پر چڑھا وہ کتار بند (۴) تار نظر سے ہم نے لگائی فتراک بند

رباعی

کوئی نہیں کہتا یہ نئے قلباں کو (۵) فریاد و فغاں میں دیکھ سرگرم نہ ہو

دم عشق کا کیا بھرے ہے اے سوختہ جاں (۶) آتی ہے ابھی منہ سے ترے دود کی بو

---

(۱) نسخہ آ میں "دو شعرے از وبہم رسیدہ" لکھا ہے اور ایک شعر جو اوپر درج ہے اس کے علاوہ یہ شعر زائد ہے۔
پشتِ لب پر ترے یہ خط ریحاں ایسا منہ تو دیکھو لکھے یاقوت رقم خاں ایسا
(۲) ن خ میں یہ ۲ تا ۶ اشعار نصیر کے اور ہیں۔

(۹) نجف

کہ از[1] نام و نشانش خبر نہ دارم دو سہ غزلش بر بیاضے نوشتہ دیدم چوں رہ بدرستی داشت نقل گرفتہ شد ہا نیست۔

کس طرح ربط نہ ہو زلف سے دیوانوں کو
اُنس ہوتا ہی پریشاں سے پریشانوں کو

مجھکو بتلا دے صبا باغ میں تو نے آکر
کس لئے ٹکڑے کیا گل کے گریبانوں کو

پھاڑ کر اپنا گریباں یہ نجف ہی جی میں
چلئے اب یہاں سو نکل دیکھئے ویرانوں کو

بے وفائی پہ یار ہے سو ہے
یہ دل بے قرار ہے سو ہے

ابر موسم ہی پر برستا ہی
دیدۂ اشکبار ہے سو ہے

سوزش عشق کیا بتاؤں نجف
سینۂ داغدار ہے سو ہے

دل کو کہتا ہوں شاید اب سمجھے
پر یہ خانہ خراب کب سمجھے

اُس کے کوچہ میں و مبدم جانا
روز سمجھے ہے دل نہ شب سمجھے

دردِ دل اور میری بے تابی
جب وہ چاہی کسی کو تب سمجھے

آہ کس ڈھب سے اُس سو کیجے بات
بات سیدھی بھی جو کہ معیب سمجھے

ہجر کے غم سے مرگئے لاکھوں
ہم بھی تھی تجھکو جاں بلب سمجھے

شکر صد شکر بچ گیا تو نجف
تیرا جینا ہی ہم عجب سمجھے

(۱۰) نوا

شیخ ظہور نوا تخلص ساکنِ بدائوں پسرِ مولوی دلیل اللہ جوانِ خوش فکر و سنجیدہ وضع

---

(۱) کہ ہیچ از نام (ن خ)

شاگردِ میاں بقار اللہ می گوید کہ از حضورِ مرزا جہاندار شاہ جوان بخت مرحوم بخطاب خوش فکر فائق عز و امتیاز یافتہ[1]۔ فکر شعر در زبان ہندی و فارسی ہر دو میکند اما قصیدہ را بسیار بہ متانت و پختگی بہ سرانجام می رساند مہذا طرز نظم قصیدہ اش بہ سبب اندراج لغات عربی و فارسی از ابنائے زمان جدا است و بسیار فراست[2] دارد و الحق کہ دریں کار ہر کہ با او در افتادہ شکست فاحشہ خوردہ۔ بہ سبب دوستی کہ میان من و میاں بقار اللہ[3] بہ پایہ برادریست فقیر را عمومی گوید از دست۔

اب اشک تو کہاں ہو جو چاہوں ٹپک پڑے
آنکھوں سو وقت گریہ مگر خوں ٹپک پڑے
یہاں تک ہی جوش اشک کہ آنکھوں سو تجھ بغیر
یک قطرہ آب چاہوں تو جیحوں ٹپک پڑے

ہمارا نام لے کر دے ہے وہ دشنام قاصد کو
چھٹ اس کے کچھ نہیں ملتا وہاں انعام قاصد کو
خط آنا یک طرف اب چاہیے پیغام زبانی
کہ جا کر دے مری جانب سو وہ پیغام قاصد کو
اسے تو خط کو یہاں آیا تھا یا صورت پرستی کو
چل اپنے کام لگ اس کام سو کیا کام قاصد کو
تو اقاصد کو اپنے پردہ مفتوں آپ کرتے ہیں
وہ آپ ہی خوب ہیں کیا دیجئے الزام قاصد کو

(۱۱) نادر

لالہ گنگا سنگھ نادر شاگردِ میر حسن، جوانِ خوش خلق است ہیں مطلعش شہرت یافتہ۔

قاصد تو اس فریب سو تو اس پاس جائیو
کس کا یہ خط ہی اس کو مجھے پڑھ سنائیو

---

(۱) یافتہ ام اگرچہ در خوش فکریش شک نیست، اما فقیر ازیں مقدمہ کما ینبغی آگاہی ندارد (ن خ۔ ن نوکھم)
(۲) فرق دارد۔ (ن خ)، (۳) از قدیم الایام بہ پایہ (ن خ)

حرف الواو

(۱) واقف

شاہ[۱] واقف واقف تخلص درویشے بود شعر خوب می گفت ۔ از وست ۔

ان رقیبوں سے گئی گزرے ہیں کیا اے یار ہم ۔۔۔ وہ شریک بزم ہوویں اور نپاویں بار ہم

در تلک کلا نہ ہوگا واسطے واقف کے تو ۔۔۔ پھر گئے ہوں گے ترے کوچہ میں سو سو بار ہم

خیالِ وعدہ سے از بسکہ تو نظر میں رہا ۔۔۔ تمام رات مرا جی صدائے در میں رہا

روزِ خزاں چمن میں جو دیکھا ہزار کے ۔۔۔ اک مشت پر پڑے تھے تلے شاخسار کے

یارانِ ہمنشیں و رفیقانِ دوست دار ۔۔۔ سب آشنا ہیں زندگی مستعار کے

جب مند گئی یہ آنکھ تو اے دوست بعد مرگ ۔۔۔ پھٹکے ہے پاس کون کسی کے مزار کے

جو نقش پا پڑے ہے سو پھر نہ اٹھ سکے ۔۔۔ واقف کی طرح ہائے[۲] گرے کوئے یار کے

صبح پر وصلِ یار کی ٹھیری ۔۔۔ آہ پھر انتظار کی ٹھیری

کیا طرح اس گلی میں کہہ تو صبا ۔۔۔ میرے مشتِ غبار کی ٹھیری

جب کہ پردیس یار نکلے ہے ۔۔۔ آہ بے اختیار نکلے ہے

---

(۱) شاہ واقف تخلص گویند درویشے بود و فیض کی باو بحقیق نسبت با شہرت اردو گاہ گاہے خیال شعر ہم میکرد چند غزلش از نظر فقیر گذشتہ ۔ شعر خوب ہم می برآید دیگر از احوالش خوب واقف نیستم ۔ از دست (ن نور محمد مطابق ن خ) (۲) ہارکری (ن خ) غالباً ہار گرے

یہ خدا جانے کیا تھا کل اے دل   وہ کوئی بار بار نکلے ہے

عشق میں کیا فضل و ہنر چاہیے   آہ میں تھوڑا سا اثر چاہیے
آٹھ پہر جس پہ ستم کی ہو مشق   ٹک تو کرم کی بھی نظر چاہیے

لی وائے ہمرہوں نے رہ اپنی یاں کی   ہم رہ گئے بھٹکتے جوں گرد کارواں کی

گیا ہو واقف تفتیدہ دل مگر تہ خاک   کہ لالہ خاک سے اب داغ داغ اگتا ہو

واقف شراب معلوم اس دور آخری میں   ناچار کیا کریں ہم افیون گھولتے ہیں

وحشت (۲)

شاگرد جعفر علی حسرت۔ فقیر او را ندیدہ۔ از وست۔

آہ آگے تو نکلتی تھی جگر سے باہر   اب جگر نکلے ہے خود دیدۂ تر سے باہر
کیوں کے تم گھر سے نکلو گے میاں دیکھیے   ہم نکالیں گے تمھیں لاکھ ہنر سے باہر
آہ کس طرح سے دیدار میسر ہووے   پاؤں رکھتا ہی نہیں وہ کبھی در سے باہر

نکل گھر سے ذرا اے یار مجھ بیمار کی خاطر   کھڑا ہوں منتظر کب سے ترے دیدار کی خاطر

جو کچھ ہم پر ستم کیجے بجا ہے   کہ ہم نے تم کو اپنا دل دیا ہو

---

(۳) وِلا

مظہر علی خاں وِلا تخلص عرف مرزا لطف علی[1] خلف سلیمان علیخاں وداد جوانِ حلیم و سلیم بمقتضائے موزونیٔ طبع گاہ گاہے خیالِ شعرِ ہندی میکند و بنام پدر بزرگوار خود ہر جا فروختہ می شود۔ استفادۂ شعرش چندے بمرزا جان طپش و چندے بمولف بود حالا بہ میر نظام الدین ممنون کلامِ خود را می نماید۔ از کلام اوست۔

ممکن نہیں کہ خاک نشینوں کی تو سُنو
ہے ان دنوں دماغ ترا آسمان پر

نہ حاجت کے لئے دستِ دعا کو منہ پہ لاتا ہوں
میں اپنی زندگی سے سچ تو یہ ہے ہاتھ اُٹھاتا ہوں

ایک جیحوں ہے کہ پلکوں سے بہا آتا ہے
کیا بلا تھی یہ مرے دیدۂ گریان کے بیچ

یونہیں گر کرتے رہے ہم اشک سے تر آستیں
آپ بھی رو دینگے اک دن منہ پہ دھر کر آستیں
قتل سے میرے نہ منکر ہو کہ ظالم اب تلک
بھر رہی ہے خون سے تیری سراسر آستیں
عشق کے آثار سب تجھ میں ہویدا ہیں وِلا
رنگِ زرد و آہِ سرد و اشک سے تر آستیں

ہرگز نہ گریں اس سے اشکِ اثر آلودہ
ہوئے نہ کبھی خون سے جو چشم تر آلودہ
از بسکہ کلیجہ کے ٹکڑے ہوئے کرتے ہیں
آنکھوں سے میرے آنسو لختِ جگر آلودہ
واں رشکِ چمن اس نے گھر اپنا کیا ہے یہاں
اشکِ جگری سے ہے دیوار و در آلودہ
اک پل میں گزر جاوے نہ چرخ بریں سے بھی
ہوتی ہے بُری ظالم آہِ اثر آلودہ

---

(۱) دن خ، لطیف علی۔ دن نور محمد، لطف علی۔

بخش اپنے ولاؔ کو بھی از راہِ کرم یا رب   ہر چند گنہ سے ہو وہ سر بسر آلودہ

دل کیوں نکلے نہ ہوا اس بتِ طرار کے صدقے   ہوتے ہیں سبھی وضعِ طرحدار کے صدقے

گہ چشم و گہ ابرو کے گہے چینِ جبیں کے   گہ خال کے ہوں گاہ میں رخسار کے صدقے

اک بوسہ تو لینے دے مجھے اپنے لبوں سے   انکار نہ کر میں ترے انکار کے صدقے

اس اشک کے قطرے کو اثر دے مرے یارب   تا ہووے ولاؔ چشمِ گہربار کے صدقے

(۴) وہم

میر محمد علی وہم تخلص نبیرۂ میر محمد تقی خیال جوانِ موزون الطبع بتقربِ نواب وزیر آصف[1] الدولہ بہادر اعتبارِ تمام دارد۔

گو فکر تیری دل کے تئیں سو لگی رہے   پر وہمؔ شرط یہ ہے کہ وہ لو لگی رہے

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہے   پر تجھ کو چاہئے کہ تگ و دو لگی رہے

حرف الہا

(۱) ہادی

میر محمد جواد ہادی تخلص سید صحیح النسب در ابتدا برفاقتِ نواب عماد الملک عزِ امتیاز داشت۔ و بسببِ موزونیٔ طبع یکدگر صحبتِ طرفین از مدت دراز ترکِ روزگار کردہ بتوکل می گذرانید۔ تا بندہ در شاہجہاں آباد بود اکثر بر مکانِ فقیر تشریف می آورد۔ از وست۔

---

(۱) ن خ میں آصف الدولہ بہادر نہیں ہے۔

ر ہ کے سخن کہنا ہر یار بہت تحفہ ‏ ‏ ہیں لب تو میاں لب ہی گفتار بہت تحفہ
پانو کی ٹھوکر میں سو دل پڑے تڑپے ہیں ‏ ‏ کچھ ان دنوں سیکھے ہو رفتار بہت تحفہ
رشید کا یوں چہرہ زر تار تو ہے لیکن ‏ ‏ ہے سر پہ ترے سادی دستار بہت تحفہ
گاں سے بچے گر دل ابرو کریں سو ٹکڑے ‏ ‏ تو غرض ہے[1] یہ تلوار بہت تحفہ
بوسہ پہ دل ٹھیرا تس پر وہ نہیں لیتا ‏ ‏ اک سہل سی قیمت پر تکرار بہت تحفہ
م مر چکے پر اُس نے دل کی نہ خبر پوچھی ‏ ‏ ہم کو بھی ملا ہے یہاں دلدار بہت تحفہ
یکھے کوئی اے ہادی اس شیخ کے جبہ کو ‏ ‏ یہ خر تو عجب ہے پر خر بار بہت تحفہ

ں کہا غیر کے مت جا تو کہا تجھکو کیا ‏ ‏ کر نہ تو آپ کو رسوا تو کہا تجھ کو کیا
و برو میرے دئے غیر کو اُس نے بوسے ‏ ‏ میں جو پوچھا کہ یہ کیا تو کہا تجھ کو کیا
ر کو ملتا ہے ترے پاؤں پہ رکھ رکھ ہادی ‏ ‏ میں کہا کچھ اسے فرما تو کہا تجھ کو کیا

درد دیں[2] اُس بت کے ہاتھوں ہائے ابتر ہو گیا ‏ ‏ جس مسلماں نے اُسے دیکھا سو کافر ہو گیا
ے دل اب دیتا نہیں وہ داد یہ کیا ہو گیا ‏ ‏ آج کچھ سنتا نہیں فریاد یہ کیا ہو گیا
ت گیا دل اس کا جب تصویر تیری کھینچ کر ‏ ‏ رکھ قلم کہنے لگا بہزاد یہ کیا ہو گیا
ان نکل جائے خون ہادی کی جب ہنگام فصد ‏ ‏ دیکھ کر کہنے لگا فصاد یہ کیا ہو گیا

پلے ہم سے کوئی سر سے گذر جانے کی طرح ‏ ‏ آگ میں ہم آپ کو جھونکیں ہیں پروانے کی طرح

جانے یار نت کرتے ہیں گلگشت چمن کیونکر ‏ ‏ سلامت یہاں سے لیجاتے ہیں اپنا پیرہن کیونکر

ا ہے ہی، ن خ، (۲) یہ شعر بہ ادنیٰ تغیر اس نسخے میں یقین کے نام بھی درج ہے۔ ن خ میں ہادی کے نام ہے لیکن
ین کے نام نہیں۔

رات اس مرتبہ اڈی تھی تری یاد کہ بس — ایسے ہنگاموں سے کرتے رہے فریاد کہ بس

مت پوچھ فریبندہ تری زلف ہے یا خط — اک آفتِ نو زلف ہے اک تازہ بلا خط

تجھ بن آنکھوں میں خواب معلوم — اس دل کو جو چاہو تاب معلوم

قاصد آ آ ہے وہاں سو گریاں — نامہ کا ہوا جواب معلوم

جز اس کے کہ خوار ہو کے مر جائے — کوئی تجھ سے ہو کامیاب معلوم

نہ وفا چھوڑی ہیں نا تو نے کی شفقت ظالم — آفریں باد مجھے اور تجھے رحمت ظالم

سخت آیا ہوں بجان دیکھیں مر جاؤں گا — رحم کر مجھ کو نہ دے اتنی اذیت ظالم

اور معشوقوں کی بے مہری کو تو دو دکھے ہے — بارے کچھ تجھ میں بھی ہے مہر و محبت ظالم

مرتے ہیں مر گیا پر رحم نہ آیا تجھ کو — رہ گئی دل میں مرے آہ یہ حسرت ظالم

وقت مرنے کے یہ ہادی نے کہا اس سو کہا — گو میں دنیا سے گیا رہ تو سلامت ظالم

غافل ہیں اس کر یار جگا دے انھوں کے تئیں — ہادی تو راہِ عشق بتا دے انھوں کے تئیں

بے بختِ خفتہ جنبشِ پا چاہتے ہیں یار — بہتر تو ہے تو آ کے جگا دے انھوں کے تئیں

ماہ کہاں کہاں وہ رو غنچہ کہاں وہ ہاں کہاں — مشک کہاں کہاں وہ زلف سنبل گلستاں کہاں

دشت میں اور کوہ میں صومعہ و کنشت میں — تجھ کو میں ڈھونڈھتا پھرا جان مری کہاں کہاں

تو ان لوگوں سے ملتا ہے کہ جن سے مجھ کو عار آوے — مری اور تیری پیارے کس طرح صحبت برار آوے

جنوں کے ہاتھ سے بے طرح تو وحشت میں ہے ہاوی
خدا جانے بچے گا یا نہیں جبتک بہار آوے

ہاتھ میرا جھٹک گئے سو گئے
یک بیک تم شتک گئے سو گئے

نہ دیا اُس کو یا دیا قاصد
خط مرا تو نے کیا کیا قاصد

(۲) ہاشمی

میر ہاشمی ہاشمی تخلص شاگردِ مرزا رفیع۔ عمرش از شصت متجاوز خواہد بود فقیر اورا در لکھنؤ دیدہ۔ از وست۔

مرا سو بار اُس تک نامہ پر آزردہ پہنچا
پہ اودھر سے جواب صاف پہنچا جب کبھو پہنچا

کیا افشا تمھیں نے رازِ عشق اے دیدہ گریاں
بگوشِ خلق ورنہ کس طرح یہ گفتگو پہنچا

دماغ آشفتہ ہوتا ہے صبا نکہت سے[1] سنبل کی
مشامِ آرزو میں تو کسی کا کل کی بو پہنچا

ابھی چھوٹا ہے موجِ رشک کی زنجیر سے قمری
نہ پھر گوشِ دلِ دیوانہ تک آوازِ ہو پہنچا

یہ دعوے سب کے باطل مکہ میں ہاشمی ہونگے
اگر حاکم تلک وہ شوخ با روئے نکو پہنچا

آہ و نالہ کے دو مصرع جو کئے ہیں موزوں
صاحب درد اُسے شعرِ فغانی سمجھا

وہ برہمن بچہ افسوس کہ اے ہم نفساں
قصۂ درد مرا رام کہانی سمجھا

(۳) ہاتف

مرزا محمد ہاتف ہاتف تخلص درایامیکہ فقیر در شاہجہاں آباد بود اکثر در مشاعرہ بسیر

(۱) سنبل کی نکہت سے۔ (ن خ)

راجہ رام ناتھ کہ مرکب بنائے آں میاں ثنا ء اللہ خاں فراق بودند می آمد اکنوں شنیدہ شد کہ ہمانجا باجل طبعی درگذشت۔ شعرے از ونجاطر است۔

خط آئے پہ یہ حسن نہ یہ مان رہیگا ایسے ہیں اگر ملئے تو احسان ہیگا

(۴) ہدایت

ہدایت خاں ہدایت تخلص مشاقِ قدیم دمعاصر[1] میر و مرزا شاگرد بلکہ مرید خواجہ میر درد نور اللہ مضجعہٗ شخصے است بسیار حلیم و سلیم۔ شعر را بسیار بفصاحت می گوید۔ عمرش از شصت متجاوز خواہد بود۔ صاحبِ دیوان است۔ انتخاب کلام اوست۔

تجھ بن تو چاہتا نہیں جی سیرِ باغ کو لگتی ہے بھینٹ نکہت گل سے دماغ کو

معشوق بے وفا و ستم گار ہے بھلا جی جس کو چاہے وہ تو دل آزار ہی بھلا
دیکھا نہ دور سے بھی ہیں روئے چمن کبھو آنکھوں سے میری رخنۂ دیوار ہی بھلا

آتش سے داغِ دل کے سراپا تو جل گیا گلزار پھولی کیا کہ بدن سارا پھل گیا
تکلیفِ سیرِ باغ کرے گی کسے نسیم آمد ہی میں بہار کی یہاں جی نکل گیا

نے جم رہا جہان میں نے جام رہ گیا مردوں کا ایک جگ میں مگر نام رہ گیا
کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا
جب کچھ بھی بس چلا نہ تو صیاد مرغ دل آخر تڑپ تڑپ کے تہ دام رہ گیا
آتی ہے آج تجھ سے تو کچھ اور بو نسیم رات اس چمن میں کون گل اندام رہ گیا

---

(۱) مشاق قدیم دمعاصر و ہم طرح محمد قایم شریک دور درد و میر و مرزا۔ (ن خ مطابق ن نور محمد)

برنگ گل زمانہ جس کے ہو باعث ہنسانے کا — کرے پھر فکر پہلے خاک میں اُس کے ملانے کا
ہدایت کیسے کیسے گل رخاں یہاں خاک میں مل گئے — نہ دیکھا جان میری رنگ تو نے کچھ زمانے کا

ٹھیر چکی تھی جی پہ یہ جاؤں نہ کوئے یار میں — آہ پر اس کو کیا کروں دل نہیں اختیار میں
گرچہ ہدایت ایک جا ٹھیرے ہے کوئی بے نوا — کیجیے پر اب تو بسترا کوئی دن اس دیار میں

نامہ کا میرے لے کر اس سے جواب پھریو — پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھریو
اب اور تو میں تجھکو اے عشق کیا کہوں پر — میری طرح سے تو بھی خانہ خراب پھریو

کیا کہوں میں کہ ترے ہجر میں کیونکر گذری — وہ ہی جانے ہے مری جان کہ جس پر گذری
کیا کہوں تجھ سے ہدایت کہ مری شام و سحر — یاد میں زلف و رخ یار کی کیونکر گذری
دن جو گذرا تو مجھے روز قیامت سے دراز — رات گذری تو شب ہجر سے بدتر گذری

بے آب و دانہ مرتے ہیں اُن کا ثواب لے — ظالم خبر اسیروں کی اپنے شتاب لے

مرتا ہے اُس کی چشم سیہ فام کے لئے — دل ہے مرا دو نیم دو بادام کے لئے

اک دم بھی آپ سے تو نہ تجھ کو جدا کروں — قسمت ہی گر بری ہو تو میں اس کو کیا کروں

کیا ہی دکھلاتی ہیں گلشن میں گلوں کی ڈالیاں — گہری گہری سبزیاں اور جھمجھماتی[۱] لالیاں

(۱) چہچہاتی (ن خ)

صبح محشر ہو چکی پر بے خودی ہے اب تلک کس کی دیکھی ہیں یا رب انکھڑیاں متوالیاں

پہنچے ہے فصلِ گل کوئی حسنِ نگار کو مکھڑے پہ اُس کے صدقہ کیا نو بہار کو
کس دل جلے کی خاک سے گذری چمن میں آج دیکھا عرق فشاں ہیں نسیم بہار کو
لازم ہے دستگیریٔ افتادگاں نسیم ⁽¹⁾لے پہنچ اُس گلی کے تئیں میری غبار کو
نالے سے میرے اور تو اب چاہتا ہے کیا پانی تو کر دیا ہے دلِ کوہسار کو
اللہ رے کارخانۂ تقدیرِ ذوالجلال یہ اعتبارِ ہستیِ بے اعتبار کو

بھیو بے ہو وہ مت اشکِ گریۂ شب کو کہ عاقبت ہے اثر کچھ نہ کچھ کواکب کو

کہتے ہیں قیامت بھی ہوئی ہم تو ہدایت افسوس کہ محروم ہیں دیدار سے اب تک

بیان کروں لبِ شیریں کی کیا حلاوت کا کہ وقتِ بوسہ ہر اک دم ہے گھونٹ شربت کا

انجامِ کارِ دل کا ہدایت میں کیا کہوں آنسو کی بوند ساتھ لہو کے ٹپک گئی⁽¹⁾

ہدایت اپنا وطن کس کو خوش نہیں آتا پہ آہ کیا کرے اب کوئی مرضیٔ رب کو
ہزار حیف کہ دلی سا شہر ویران کر کیا ہے یاروں نے آباد ملک پورب کو

نمیر پر جور و جفا کیجے گا یا دنت میری وفا کیجے گا

---

(۱) "لے پہنچ اس گلی تئیں میرے" (ن خ) (۲) پڑی۔ (ن نور محمد)

چلتے ہیں ہم بھی ترے ساتھ نسیم　　رہ کے اس باغ میں کیا کیجئے گا

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا　　نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا
کیا تیغِ قاتل نے جب کام اپنا　　میں منہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا
عبث ہے غرض ان بتاں سے بھی ملنا　　نہیں آج دنیا میں کوئی کسی کا
کیا حسن سے اس نے آگاہ اس کو　　الٰہی ہو خانہ خراب آرسی کا
ہدایت کہا ریختہ جب کہ ہم نے　　رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

مرجائے جو کوئی کھائے افسوس　　احوال مرا ہے جائے افسوس
ہم مر گئے پر ہدایت اس نے　　اتنا نہ کہا کہ ہائے افسوس

گاہ جیتے ہیں گاہ مرتے ہیں　　ہم بھی دنیا میں زیست کرتے ہیں

(۵) ہوش

تخلص جوانِ شیریں زبان است بہ شاگردیٔ میر سوز نازشی دارد۔ ازوست۔

یار ہنستا ہے چشمِ تر کو دیکھ　　گریۂ تنک اپنے تو اثر کو دیکھ
دست دیا کم کرے ہیں موکرا　　نازنین تیری اس کمر کو دیکھ
تیرے خط کا جواب آیا ہے　　ہوش کھول آنکھ نامہ بر کو دیکھ

حرف الیاء

یقین (۱)

میاں انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خاں بودہ نبیرۂ حمید الدین خاں نیمچہ جوانے بود مرزا مزاج و شیریں زبان از حسن وجاہت بہرۂ وافی داشت گویند مرزا جان جاں او را بسیار دوست داشتے و اکثر بخانہ اش شب را روز و روز را شب کردے۔ دیوانش از نظر مرزا بخوبی گزشتہ[1] بلکہ بقولِ بعضے ہمہ کلامش گفتۂ مرزا است[2] در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ، ایں جوان بود بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ چنانچہ خود می گوید

حق کو یقیں کے یار و برباد مت دو آخر　　طرزِ سخن کے اُس کی تم نے اڑائیاں ہیں

عمرش زیادہ بر بست و پنج نخواہد بود کہ پدرش او را کشتہ در دیگ مدفون ساختہ۔

ایں سر را کسیکہ می داند میداند خدا نیش بیامرزاد۔ از دیوانِ اوست۔

تنک اک انصاف کرتا بھی کرتا ہے جفا کوئی　　کرے گا بعد میرے کس توقع پر وفا کوئی

عجب سچ سے کیا ہے قتل مجھ کو اس کو مت ٹوکو　　طلب کرتا ہے ایسے قاتلوں سے خونبہا کوئی

گزر جا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا اس کی　　محبت میں یقیں لیتا ہے نام مدعا کوئی

بت کرے سجدہ ترے حسنِ خداداد کو دیکھ　　سرو نیدہ ہو ترے قامتِ آزاد کو دیکھ

اُن گنہگاروں میں ہوں میں کہ مرنے کے مارے　　جی نکلتا ہے مرا دور سے جلاد کو دیکھ

عشق کے جور و جفا میں تجھے گر شک ہے یقیں　　عیشِ پرویز کو اور محنتِ فرہاد کو دیکھ

---

(۱) گذشت۔ د ت خ) (۲) شاید کہ چنیں باشد خالی از نفاست نیست در ن نور محمد مطابق ن خ)

خار سے مژگاں کے جی ڈرتا ہے میرا بے طرح — رکھ مری آنکھوں پہ مت تلوے ہو کفِ پا بے طرح
فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھئے کیا ہو یقیںؔ — اب کے چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے طرح

نہیں معلوم اب کے سال میخانہ پہ کیا گذرا — ہمارے توبہ کے کرنے سے پیمانہ پہ کیا گذرا
برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے — خدا جانے تری صورت سے بتخانہ پہ کیا گذرا
یقیںؔ کب یار میرے سوزِ دل کی داد کو پہنچے — کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانہ پہ کیا گذرا

سرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا — ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا
مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں — کہ گل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خار بہتر تھا
مجھے پھر دکھ دیا تو نے منڈا کر سبزۂ خط کو — جراحت کو مرے یہ مرہمِ زنگار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن سے نظارہ سے باز آیا — یقیںؔ پرہیز اگر کرتا تو وہ بیمار بہتر تھا

کارِ دیں اس بت کے ہاتھوں ہائے ابتر ہو گیا — جس مسلماں نے اسے دیکھا سو کافر ہو گیا
کیا بدن ہوگا کہ جس کا کھولتے جامہ کا بند — بوئے گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا
آنکھ سے نکلے پہ آنسو کا خدا حافظ یقیںؔ — گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

باغباں بے رحم اور در بند دیواریں بلند — بلبلِ بے بال و پر گلشن میں جاوے کس طرح
اختیاری ہے مگر یہ کام ناصح تو ہی کہہ — عشق سے کوئی یقیںؔ کو باز لاوے کس طرح

عمر آخر ہے جنوں کر لو بہاراں پھر کہاں — ہاتھ مت پکڑو مرا یارو گریباں پھر کہاں
ہیں بہشتوں میں یقیںؔ سب کچھ ولیکن درد نہیں — بھر کے دل رو دیجئے یہ چشمِ گریاں پھر کہاں

اُس لبیتی پوش سے آغوش رنگیں کیجئے
جی میں ہے اس مصرعۂ موزوں کو تضمیں کیجئے

عشق میں راحت نہیں ملتی مگر جوں کوہکن
جان شیریں دیجئے تب خواب شیریں کیجئے

چھٹے اس زندگی کی قید سے اب داد کو پہنچے
وصیت ہے ہمارا خونبہا جلاد کو پہنچے

نہ نکلا صبر سے کچھ کام اب فریاد کرتا ہوں
مری فریاد ہی شاید مری فریاد کو پہنچے

وفا کا کیا قیامت ہے جو کوئی بدلا خدا دیوے
ترحم ان بتاں کو اپنے بندوں پر خدا دیوے

محبت کا جو باناں(۱) ہے عجب آداب ہیں اس کے
کہ جوں جوں یار دیوے گالیاں عاشق دعا دیوے

نہیں پرواز قسمت میں مرے صیاد پر اتنا
صبا سے کہیو میری خاک گلشن میں اڑا دیوے

خفا ہو زندگی سے مر گیا ہوں بسکہ ڈرتا ہوں
مبادا حشر مجھکو خواب راحت سے جگا دیوے

یقیں زنجیر میں ہے تب تو عالم میں نہیں چلیں
جو ٹک چھوٹے دوانا تو ابھی دھوم مچا دیوے

دکھ تو دیتا ہے کروں تجھکو بھی حیران تو سہی
باغباں اب کے اجاڑے لوں گلستاں تو سہی

اب تو ناصح کے تئیں سینے دو مرا چاک جیب
تار تار اس ضد سے کر ڈالوں گریباں تو سہی

لوگ نظروں میں نہیں لاتے ہیں ویرانے کے تئیں
اشک خوں سے باغ کر ڈالوں بیاباں تو سہی

اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقیں
ان بتاں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی

اگر دیتے ہو دل کی داد جتنا اس کا جی چاہے
تو کرنے دو اسے فریاد جتنا اس کا جی چاہے

نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جائیں چھوڑ بتخانہ
کرے واعظ ہمیں ارشاد جتنا اس کا جی چاہے

یقیں مجھ بن نہیں ہے قدرداں کوئی مصیبت کا (۲)
فلک مجھ پر کرے بیداد جتنا اس کا جی چاہے

---

(۱) پایہ (ن خ) ۔ (۲) ن خ میں یہ شعر نہیں ۔

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے ۔ نرا بُرا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے
اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں ۔ یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے
یہ آرزو ہے کہ اُس بیوفا سے یہ پوچھوں ۔ کہ میرے بعد رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے
یہ کون ڈھب ہے سجن خاک میں ملانے کا ۔ کسو کا دل کبھی پاؤں تلے ملا بھی ہے
یقیں کا شورِ جنوں سن کے یار نے پوچھا ۔ کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

خونِ انصاف سے اتنا بھی زبان تر نہ کرو ۔ لعل کو یار کے ہونٹوں سے برابر نہ کرو
سایہ بے شخص نہیں رہتا ہے کہتا ہے یقیں ۔ آپ سے مجھکو جدا حضرتِ مظہر نہ کرو

اسیرانِ قفس کی نا امیدی پر نظر کیجو ۔ بہار آوے تو اے صیاد ہم کو مت خبر کیجو
کہا جاتا نہیں کچھ مجھ سے تو جو کہہ سکے کہیو ۔ مری اس بے زبانی پر نظر اے نامہ بر کیجو
یقیں سے جلتے بلتے کا سرِ تا بھی نہ ٹھکراؤ ۔ اس آتش سے اے دامن دراز و ٹک حذر کیجو

(۲) یکرنگ

مصطفےٰ خاں یکرنگ تخلص بقولے شاگردِ خانِ آرزو و بقولے میاں آبرو از فحوائے کلامش چنیں می تراود کہ شاگرد مرزا مظہر خواہد بود۔ برائے تیمن دو شعر ش قلمی می شود۔ از وست۔

ہرگز تم اب کسی کے سجن آشنا نہیں ۔ سب خوبیاں ہیں تم میں ولے اک وفا نہیں
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت سو ۔ مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

(۳) یکرو

میاں یکرو تخلص دو شعر از ایشاں نیز یاد دارم و آں اینست۔

لے گئے بے رحم بکس کر گئے　　ایک تماعاشق کے غمخواروں میں دل
اب تو بکرو جیتا رہنے کا نہیں　　جا پڑا ہی شوخ خونخواروں میں دل

پوشیدہ مباد کہ اگرچہ تذکرہ تمام شد اما خاتمہ اش مشتمل بر اشعارِ چند زنان است و داخلِ تذکرہ برائے آں نہ شدند کہ از تخلص بعضے از آں آگاہی نہ داشتم[1]۔

(۱) دولہن بیگم

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں　　مثالِ لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا　　تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

(۲) جینا بیگم

یہ کس کی آتشِ پنہاں نے جی جلایا ہے　　کہ تا فلک مرے شعلہ نے سر اٹھایا ہے

(۳) گنا بیگم

زوجۂ عماد الملک گویند طبعِ موزوں داشت احوالش از کثرتِ اشتہار محتاج بہ بیان نیست۔ میر قمر الدینِ منت کہ پیش ازیں چندے بہ رفاقتِ عماد الملک بہ نسبتِ شعر و شاعری امتیاز داشتند و در آں ایام بیگم مذکور کلامِ شکستہ و بستہ خود از حکمِ نواب بہ نظرِ ایشاں می گذرانید ازیں جہت ایں غزل میر صاحب بنام او شہرت یافتہ بلکہ تخلصِ ایشاں نیز پیش ناآگاہان تخلص او گردیدہ مطلعِ غزل ایں است ؎

---

(۱) اول اشعار اینجا نوشتہ می شود بعد ازاں خاتمہ خواہم نوشت (ن خ)

مدعی اُس سی سخن سازِ بہ سالوسی ہے پھر تمنا کو یہاں فرودہ مایوسی ہے

ازدست

شمع کی طرح کون رہ جانے جس کے جی کو لگی ہو سو جانے

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی اس طرح نہ لگیو مرے اللہ کسو کی[1]

حنا خون ہو کے ان پاؤں کی جب کچھ بات چلتی تھی رگڑتی تھی سر اپنا سنگ پر اور ہاتھ ملتی تھی
ترے منہ کی تجلی دیکھ کر کے رات حیرت سے زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع جلتی تھی

اُس کا پیغام مجھے کیونکہ زبانی آوے نام سنتے ہی مرا جس کو گرانی آوے
دین و دنیا سے سروکار رہے کس کا فرکو رات دن فکر یہی ہو کہیں جانی آوے

ارے قاصد تو میرا اور کچھ نہ کو رست کیجو یہی کہیو کہ اپنے دل سے مجھکو رست کیجو

سن لیجیو خط سونپ کے پیغام کو قاصد لے اوٹھیو نہ پہلے ہی مرے نام کو قاصد

حسن کا جی ہرا دا تجھ میں میاں سو تو نہیں گل تصویر میں گو رنگ ہوا بو تو نہیں

(۴) زینت

نازک تخلص زینت نام در قصبۂ آباداز میر مستحسن خلیق معلوم شدہ مشارالیہ می گوید کہ ہرگاہ من ہمراہ لشکر رفتم بسببِ الفتے کہ با من داشت ایں غزل نوشتہ فرستادہ بود[2]

(۱) کسی۔ (ن خ)؛ (۲) در مدح راست بر گرداں راوی (ن خ)

کوچہ میں کوئی بس سکے کوئی در پہ مرے ہے ۔۔۔ انصاف بھی کچھ ہے تو یہ کیا ظلم کرے ہے
موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے ۔۔۔ وہ وہم و گمان سے بھی حقیقت میں پرے ہے
ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک ۔۔۔ پر وہ بت مغرور کوئی کان دھرے ہے
یاد آتی ہے اُن آنکھوں میں آمد وہ نشہ کی ۔۔۔ ساقی سے گلہ تنگ سی جب جام بھرے ہے
غش میں مجھے کل دیکھ کے وہ ڈر کے یہ بولا ۔۔۔ بس ہوش میں آ کیوں مجھے بدنام کرے ہے
پیغام اجل چاہ ہے اس بت کی ولیکن ۔۔۔ کب عاشق جاں باختہ مرنے سے ڈرے ہے
جاتے تمھیں ٹک دیکھا تو آنکھیں نہ نکالو ۔۔۔ منظور ہیں تو نظرے خوش گذرے ہے
محفل میں مجھے دیکھ کے کہنے لگا اپنی ۔۔۔ جاوے یہ بلا گھر سے مرے کوئی اڑے ہے
اُٹھا میں تو بولا کہ میں ہوں غیر کو کہتا ۔۔۔ جل جل کے تو کچھ اپنی ہی غیرت میں مرے ہے
نازک سفرِ دور کو گویا وہ سدھارا ۔۔۔ گرمِ طلبِ شوق کے نزدیک وہ اے ہے

(۵) موتی

موتی نامی از اہل طوائف ارباب نشاط در فنِ خود صاحب مذاق و ذی اعتبار۔ اصلش شاہجہاں آباد است۔ دوازدہ سال گزشتہ کہ مرزا ابراہیم بیگ مقتول را کہ ذکرِ ایشاں در ردیفِ میم گزشت شیفتگی بر او شدہ بود تا امروز ایشاں بر جادۂ وفاداری قائم است چند سال گزشتہ کہ از دہلی بہ لکھنؤ رسیدہ گاہ گاہے فقیر ہم برائے ملاقات مرزائے مذکور کہ بہ خانۂ اش میر دم بسیار بہ خوبی پیش می آید۔ از وست۔

گلابی روبرو ہے اور ہم ہیں ۔۔۔ بس اب جام و سبو ہے اور ہم ہیں
سیا گر تو نے چاکِ جیب ناصح ۔۔۔ تو پھر تارِ رفو ہے اور ہم ہیں
بلا سے گو نہ ہووے دل کو واشد ۔۔۔ ہجومِ یاس تو ہے اور ہم ہیں
شبِ مہتاب میں تا صبح ساقی ۔۔۔ خیالِ ماہ رو ہے اور ہم ہیں

یہ کیا جی میں لہر آئی کہ مو تی　　　کنارِ آبِ جو ہے اور ہم ہیں

خاتمہ

بر ضمیرِ آئینہ نظیرِ مبصرانِ گوہر معانی مخفی و محتجب نماند کہ مولفِ ایں تذکرہ غلام ہمدانی ولد ولی محمد ابنِ درویش محمد کہ بہ مصحفی شہرت دارد از سبب[1] حواس و پریشانی خاطر و ناساعدی زمانہ کجا فرصتِ آں داشت کہ بہ تصحیح احوال و اشعارِ شعرائے سابق و حال پرداختہ نقشہ ایں جریدہ را بروئے کار آرد اما اکنوں کہ بہ رہبری بختِ سعید در حضورِ پر نورِ مرشد زادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اللہ اقبالہ بار یافتہ ہمیشہ موردِ گوناگوں مہربانی آں ہر سپہرِ خلافت و جہانداری می باشد فرصت را غنیمت شمردہ سودۂ مسوس تذکرہ را کہ از چند سال بہ طاقِ نسیان افتادہ بود صاف نمودہ و درست ساختہ احوالِ اکثرے در وے بہ شرح و بسط مسطور است و احوالِ بعضے از متقدمین کہ کما ینبغی آگاہی بر اوقات آنہا حاصل نشود بطور بیاض سمتِ تحریر یافتہ۔

قطعہ

غرض نقشیست کز ما یاد ماند　　　کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحبدلے روزے بہ رحمت　　　کند در کارِ ایں مسکیں دعائے

امید کہ بہ نظرِ قبول آں والا جناب در آمدہ مقبولِ دلہا گردد۔[1]

تاریخ

چونکہ از فضلِ خدا ساختہ شد　　　جلد ایں تذکرہ مانند بہشت
سالِ او چوں ز خرد پرسیدم　　　یکہزار و دو صد و نہ بنوشت

---

(۱) ن خ ۱۲۰۹ قطعہ تاریخ۔

تاریخ دیگر (۱)

چوں ز انعام خدائے کارساز — شد مرتب ایں کتاب دلپذیر
بسکہ در معنی نظیر خود نہ داشت — گفتہ شد تاریخ جلد بے نظیر
۱۲۰۵ھ

کاتب بندہ مرزا فدا حسین ولد آقا مرزا صاحب ۲۰ جمادی الثانی سنہ ۱۲۱۹ھ ملک لکھنؤ مکان احمد گنج در سن سی ام۔

ایں تصنیف استاد زمانہ بعہد خود خاقانی شیخ غلام ہمدانی مرحوم و مصحفی تخلص دارد کتبہ محمد علی بیگ خاک پائے جلالی بار دویم شہر صفر سنہ ۱۲۳۳ھ تمام شد۔

تمت الکتاب بعون الملک الوہاب

---

(۱) تاریخ لمؤلفہ

جامع برقی پریس جامع مسجد دہلی میں چھپی ۱۹۲۲ء

اُردُو

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کیجاتی ہے۔ اس کے تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں اُن پر تبصرے اس رسالہ کی ایک خصوصیت ہے۔

یہ رسالہ سہ ماہی ہے اور ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے، رسالہ کا حجم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر اس سے زیادہ۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملاکر سات روپے سکہ انگریزی۔ آٹھ روپے سکہ عثمانیہ۔

Anjuman -i- Tarraqqi -e- Urdu Series No. 54.

Tadzkirah -i- Hindi

A Biographical Anthology

of

Urdu Poets

by

Ghulam Hamdani " Mus - hafi ",

Edited by

MOULVI ABDUL HAQ, B. A. (ALIG.)

—:※:—

1933